سہ ماہی
معاصر
انٹرنیشنل
ویلکم امریکہ
(ایک بھجن)
جم جم آؤ شیام
پدھارو، نینن پیاس بجھاؤ
آکر پھر نہ جاؤ
جم جم آؤ شیام
کٹیا ہمری سونی کب سے
جھولی ہمری خالی کب سے
برہن درس کی پیاسی کب سے
آس لگائے بیٹھی کب سے
تن من تورے نام
جم جم آؤ شیام
پیاں پکڑوں، سیس جھکاؤں
صورت تمری من میں بساؤں
چھم چھم ناچوں، گیت سناؤں
تن من تورے نام
ڈالر دو انعام
جم جم آؤ شیام
عطاالحق قاسمی
عمر قاسمی
(افغان وار کے حوالے سے ترقی پسند شاعر
احفاظ الرحمان کی مزید نظمیں اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں)

کُلّیاتِ انجم رومانی

مرتب: یاسمین انجم جاوید
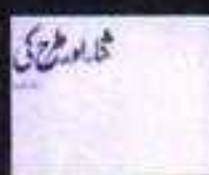
روداد پبلی کیشنز

734 اسٹریٹ 102 'G9/4 اسلام آباد فون نمبر 2252899

سہ ماہی انٹرنیشنل

جلد 1 جولائی 2001 تا دسمبر 2001 شمارہ 3، 4

مدیر اعلیٰ

عطا الحق قاسمی

o

مدیر

عمر قاسمی

o

معاونین خصوصی (اعزازی)

اسلم کولسری، ڈاکٹر انعام الحق جاوید

ادارہ معاصر: ۵-اے کپورتھلہ ہاؤس، لیک روڈ، لاہور
فون: 7351217

غیر مطبوعہ تحریروں پر مشتمل

مدیر انتظامی
علی عثمان قاسمی

O

معاونین
ابرار اسحر، عزیر احمد

O

قانونی مشیر
شگفتہ جبیں ایڈووکیٹ

کمپوزنگ: ندیم کمپوزر لاہور
لے آؤٹ: محمد طارق جاوید

زر سالانہ: (چاروں شماروں کے پیکج کے لئے)
پاکستان میں: -/400 روپے
امریکہ، افریقہ اور کینیڈا کے لئے: 70 امریکی ڈالر یا اسکے مساوی
باقی ممالک کے لئے: 45 ڈالر یا اسکے مساوی
قیمت: -/200 روپے

ناشر علی عثمان قاسمی نے المطبعۃ العربیہ سے چھپوا کر
۵۔ اے کپور تھلہ ہاؤس لیک روڈ لاہور سے شائع کیا۔

معاصر دوست

محمد عتیق ۔ دوحہ، قطر
ملک معیب الرحمن ۔ دوحہ، قطر
جناب عبدالحمید المفتاح ۔ دوحہ، قطر

فہرست

ایک شاعر کا کلام

افسانے

غزلیات

یاد رفتگاں

ایک شاعر کا کلام

آپ بیتی

نظمیں

تحقیق

ایک شاعر کا کلام

افسانے

غزلیں

خاکے

نظمیں

انٹرویو

طنز و مزاح

تبصرۂ کتب

مکتوبات

امریکہ میں جشن عطاء الحق قاسمی

پاک امریکن کلچرل فورم ہیوسٹن امریکہ نے عطاء الحق قاسمی کے فن اور شخصیت کو خراج تحسین ادا کرنے کے لئے گذشتہ دنوں بہت بڑے پیمانے پر جشن عطاء الحق قاسمی کا اہتمام کیا جس کی صدارت جمیل الدین عالی نے کی تقریب میں افضال فردوس، اقبال حیدر، عشرت آفرین، پروین جعفری اور عزیز احمد کے علاوہ متعدد مقررین نے قاسمی صاحب کو بھرپور خراجِ تحسین ادا کیا۔ اس موقع پر عطاء الحق قاسمی کی خدمات کے اعتراف کے طور پر کلچرل فورم کے چیئرمین منی بھائی نے فورم کی طرف سے ان کی خدمت میں تین لاکھ روپے کا چیک بھی پیش کیا۔ تقریب میں عزیز احمد کے شعری مجموعے ''شام ہوگئی جاناں'' کو سال کی بہترین تخلیق پر پچاس ہزار روپے کا انعام بھی دیا گیا۔ تقریب کی چند جھلکیاں:-

جمیل الدین عالی اظہار خیال کر رہے ہیں۔

تقریب کے کمپیئر۔

عطاء الحق قاسمی کو امریکہ کے ادب دوستوں کی طرف سے تحائف پیش کیے جا رہے ہیں۔
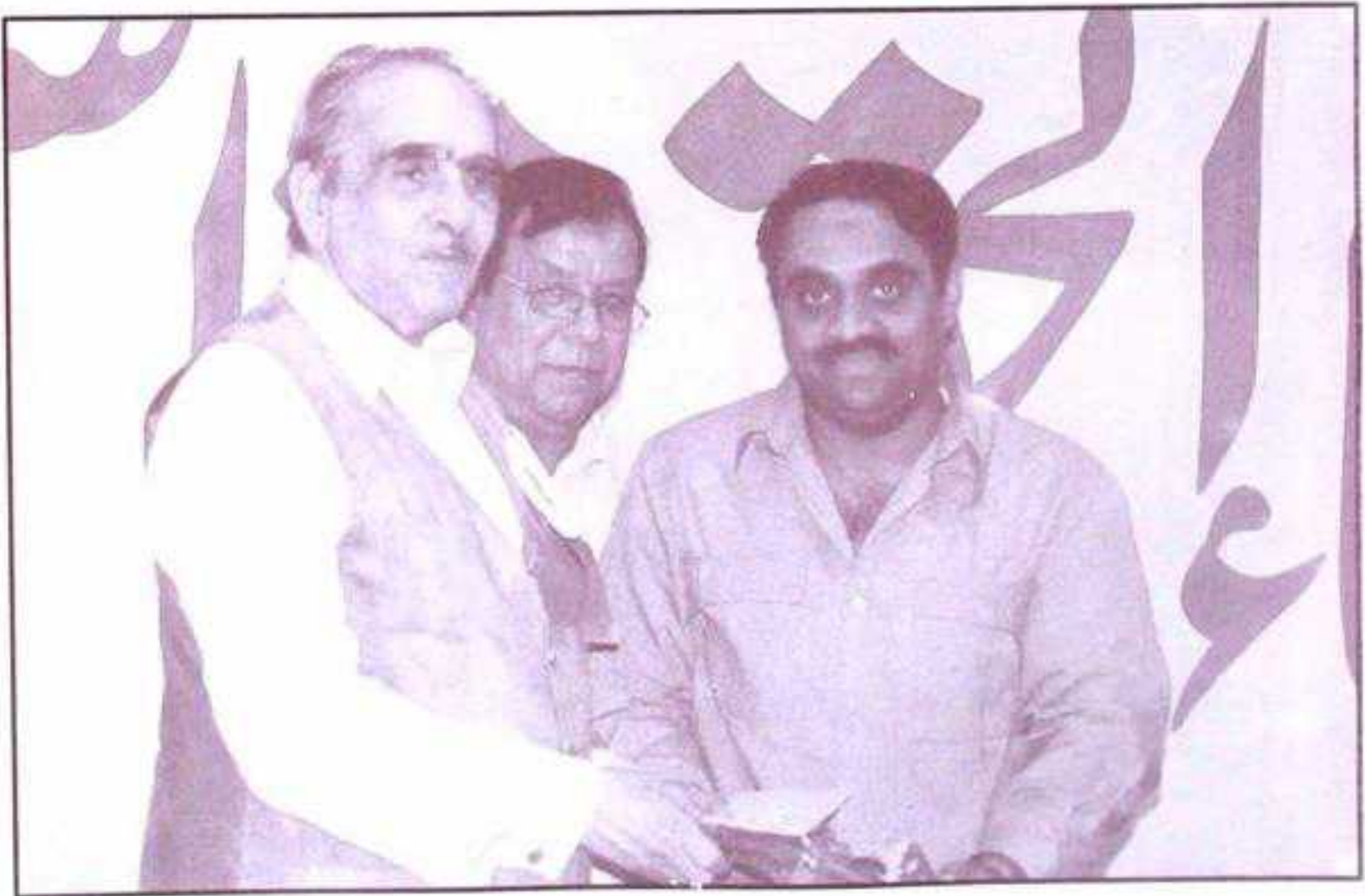
ممتاز شاعر عزیز احمد کو عالی صاحب پچاس ہزار روپے کا چیک پیش کر رہے ہیں۔

تقریب کے منتظمین۔

اداریہ

مذہبی اور سیکولر ملا

ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹاگون پر نامعلوم حملہ آوروں کی سفاکانہ کارروائی پر ساری دنیا کی حکومتوں اور عوام نے بجا طور پر احتجاج کیا۔ اس کے نتیجے میں یا اسے جواز بنا کر افغانستان کے بے گناہ اور نہتے شہریوں پر اتحادیوں نے جس سفاکانہ انداز میں بمباری کی اس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے کہ دہشت گردی کے خاتمے کے نام پر اس سے بڑی دہشت گردی کا مظاہرہ کیا گیا۔

مذہبی جماعتوں کے علاوہ ساری دنیا کے لبرل، روشن خیال، ترقی پسند اور امن عالم کو عزیز رکھنے والے طبقوں نے بہت بڑے بڑے احتجاجی جلسوں اور ریلیوں کے ذریعے امریکہ کی قیادت میں کی جانے والی اس دہشت گردی کی شدید مذمت کی خصوصاً مغربی ممالک کے عوام میں جو ردعمل ہوا، اس سے ایک دفعہ پھر ثابت ہو گیا کہ مغربی ممالک کی حکومتوں اور ان کے عوام کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مگر یہ بات بہت دکھ کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ پاکستان کے ترقی پسند دانشوروں نے جو سوویت یونین کے خاتمے کے بعد خود کو روشن خیال اور لبرل کہلانا زیادہ پسند کرتے ہیں، روشن خیالی اور لبرل ازم کے نام پر یا تو اس مسئلے پر خاموشی اختیار کی یا ظالم و مظلوم دونوں کی مذمت کی گئی اور یا کھلم کھلا امریکی جارحیت کو جائز اقدام قرار دیا گیا۔ اس کا جواز طالبان کی مذہبی شدت پسندی کو بنایا گیا۔ طالبان کی مذہبی شدت پسندی بلکہ ان کی طرف سے کی گئی اسلام کی احمقانہ تعبیر کی داد دینے والا کوئی بھی نہیں لیکن وحشیانہ بمباری کے نتیجے میں جو معصوم بچے، عورتیں، بوڑھے اور جوان ہلاک ہوئے، اس پر خاموش رہنا، یا لبرل ازم کے نام پر بمباری کو جائز قرار دینا بھی شدت پسندی کے "طالبانہ رویے" ہی کے زمرے میں آتا ہے۔ مذہبی ملائیت اور سیکولر ملائیت دونوں قابل

مذمت ہیں' اگر ویت نام پر امریکی بمباری کے دوران ویت نامیوں کے کسی رویے یا ان کے کٹر بدعت ہونے کو تنقید کا نشانہ نہیں بنایا گیا بلکہ صرف ظالم کی مذمت کی گئی اور مظلوم کے ساتھ اظہار یک جہتی کیا گیا تو اس موقع پر ہمارے بعض دانشوروں کو افغانستان کے مظلوموں کی غیر مشروط حمایت میں کیا عذر مانع تھا؟

تاہم خدا کا شکر ہے کہ یہ سوچ پاکستان کے تمام ترقی پسند' روشن خیال اور لبرل دانشوروں' ادیبوں اور شاعروں کی نہیں بلکہ اس محدود طبقے کی ہے جو ادب سے زیادہ سیاست کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ ترقی پسند ادیب اور دانشور مسلسل مظلوموں کے ساتھ اظہار یک جہتی کر رہے ہیں۔ یہی لوگ صحیح ترقی پسند ہیں۔ ظالموں کا ساتھی ظالم ہوتا ہے ترقی پسند نہیں۔

(ادارہ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم○

آہنگِ مناجات

یہ سارے بحر و بر تیرے، یہ سارے خشک و تر تیرے
نجوم کہکشاں، برگ و شجر، شمس و قمر تیرے!

اساسِ محکم ان کی ہے تری تدبیر سے قائم
ستون قصرِ فلک، خاک کے سب بام و در تیرے

نمونے تیری صنعت کے نظر آئیں، جدھر دیکھیں
مظاہر حسنِ فطرت کے، اِدھر تیرے، اُدھر تیرے

بدلتے موسموں کی ہر ادا، ہر شان ہے تیری
یہ آمد روز و شب کی ہے تری، شام و سحر تیرے

ترا پیغام دیتی ہیں، ہوائیں بھی، گھٹائیں بھی
نوا سنجان باغ و راغ سب ہیں نامہ بر تیرے

اُڑے پھرتے ہیں طائر چار سو تیری حفاظت میں
عطا ہے قوتِ پرواز تیری، بال و پر تیرے

اُٹھائے پھرتی ہیں جس کو ہوائیں دوش پر اپنے
لٹاتا ہے وہی ابرِ رواں سیمیں گہر تیرے

تری تخلیق کے مظہر، اِدھر بھی ہیں، اُدھر بھی ہیں
فلک کے پیکر نوریں ترے، جن و بشر تیرے

دلوں کی بستیاں تیری، تری یہ کائناتیں بھی
ہے اس پر لامکاں تو، اور سارے مستقر تیرے!

یہ ساری وسعتیں افلاک کی ویرانہ کیوں ہوں گی
نہ جانے ان میں بھی آباد ہیں کیا کیا نگر تیرے

عطا کی قدرتیں تیری، نمو کی ندرتیں تیری
تو مالک ابرِ نیساں کا، صدف تیرے، گہر تیرے

ہوائیں سست ہوں یا تیز رو، محکوم ہیں تیری
رکیں تیرے اشارے پر، رواں ہوں حکم پر تیرے

تری بادِ موافق، اور تری بادِ مخالف بھی
سمندر، موجِ برہم، بادباں، ساحل، بھنور تیرے

بگولے دشت کے، تھپیڑے، نسیم گلستاں تیری
فضا میں تیرتے بادل ترے، برق و شرر تیرے

فضائے بحر و بر میں قافلوں کا رہنما تو ہے
ستاروں کی ضیا سے ہیں منور رہگزر تیرے

کئی رازِ حسیں ان کو سدا سرشار رکھتا ہے
جہاں کے دیدہ ور، صاحب نظر، اہلِ خبر تیرے!

وہ خاطی ہوں کہ زاہد، خم جبیں ان کی ترے در پر
یہ سارے بے ہنر تیرے، وہ سارے با ہنر تیرے

وہ کافر ہوں کہ مسلم، سب ترے محتاج ہیں یکسر
برے ہیں یا بھلے، بندے ہیں قصہ مختصر، تیرے

عبث وہم و گماں، ہر علم کی خود انتہا تو ہے
حقائق تیرے سب سچے، فسانے معتبر تیرے!

سمجھنے سے انہیں عاجز ہوا فہم کلیمی بھی
سمجھ میں کیا مری آئیں رموز خیر و شر تیرے

ترے اسرار کا کیا علم مجھ کو، پر یہ دیکھا ہے
چلے آتے ہیں دل میں رازہائے مستتر تیرے!

شرافت، عدل و احساں، رسمِ الفت، خوئے دلداری
یہ جذبے ہیں عطیے زندہ و تابندہ تر تیرے

بھٹکتا پھر رہا ہے پھر بھی انساں دشتِ ظلمت میں
ہدایت کے لئے گو لاکھ آئے راہبر تیرے

ہے وجہ گمرہی، صد حیف، غفلت ابن آدم کی
ہدایت کو ہیں ورنہ سب صحیفے مشتہر تیرے

ہیں تیرے انبیا، انسانیت کے رہبر و محسن
ظلم و کفر و باطل میں وہ خورشید و قمر تیرے

زمانے کی قسم ہے، سارے انساں ہیں خسارے میں
مگر وہ تیرے بندے، خاص محبوب نظر تیرے

سرافرازی سمجھتے ہیں یہ شوق سرفروشی کو
کہ آتے ہیں سر میداں مجاہد، بے خطر تیرے

توجہ عام ہے سب اپنی مخلوقات پر تیری
پہ ہیں ہم بے نوا کچھ خاص محتاج نظر تیرے

ہمسفر زندگی میں ساتھ ہے ہر گام پر تیرا
ہے تو ہی ملجا و ماویٰ، سہارے سر بسر تیرے!

دعائیں سننے والا، دافعِ رنج و مصائب تو
مگر اک امتحاں ہیں اصل میں نفع و ضرر تیرے

بچیں گے کس طرح آئین فطرت کی غلامی سے
ترے منکر بھی ہیں بندے، بانداز دگر، تیرے

سراپا معصیت میں ہوں، سراپا مغفرت تو ہے
جرائم کے خزف میرے، کرم کے سب گہر تیرے!

مرا کیا ہے، مرا کچھ بھی نہیں، بس تو مرا داتا
ہیں مجھ دامن دریدہ پر عطا یا سر بسر تیرے

وہ تیرے ذکر کی لذت جنہیں سرشار رکھتی ہے
مذاقِ سجدہ کرتا ہے انہیں نزدیک تر تیرے

زمیں تا آسماں ہر شے تری تسبیح کرتی ہے
ثنا خواں ہیں زبانِ حال سے کوہ و قمر تیرے

یہ گھٹتے بڑھتے سائے عجز کا اظہار کرتے ہیں انھی کے ہم نفس ہیں نیک خو جن و بشر تیرے
مجھے آیات لکھنی ہیں، ازل سے تا ابد تیری سمندر روشنائی دیں، قلم ہوں سب شجر تیرے!
کوئی ربطِ حسیں محکم ہو تیرے لطف سے ایسا صدف لفظوں کے ہوں میرے، معانی کے گہر تیرے

تیرے احسنؔ کے بس میں ہے کہاں حمد و ثنا تیری
سرِ شاخِ نوا سب پھوٹتے ہیں برگ و ثمر تیرے!

*

حفیظ الرحمٰن احسنؔ

نعت خیر الانامؐ

میری جاں کو تیرے کوچے میں ملے آقا قرار
روح پرور دل کشا ہے تیرے کوچے کی فضا
اس جہاں کی تیرگی میں ہر طرح کے خوف میں
روشنی تیری عطا ہے آگہی تیری عطا
اک خدا کا نور تھا رخ پر رسولؐ پاک کے
آپؐ پر یوں ہو گئی ساری خدائی ہی فدا
مرسلیں! اے مرسلیں تو ہے کتابِ روشنی
تجھ سے خلقت ہو گئی پر نور حکمت آشنا
پا گیا وہ سب گناہوں سب عذابوں سے نجات
حشر میں ان کی شفاعت ہوگئی جس کو عطا
میں یہاں چل پھر رہا ہوں تیری رحمت کے طفیل
مجھ کو تیرا آسرا ہے، مجھ کو تیرا آسرا
گر ہوئی ہے جب کہیں پہ مدحتِ شانِ خدا
پھر زباں پہ آ گیا ہے، ایک دم صَلِّ علیٰ
آپ کے اس امتی پہ جب مصیبت آ گئی
ہو گئی سایہ فگن میرے آقا کی رِدا

نبیل احمد نبیل

نئے سال کی دعا

نئے سال کی پہلی بارش میں رقصاں
ہماری محبت کے نازک سے جذبات
خوشبو کے مانند دوشِ ہوا پر
اڑے جارہے ہیں
لبوں پر دعائیں دلوں کی طرح جگمگاتی ہیں۔
تو پھول کھل کر ترے لب کی سرخی
ترے جسم کی دل کشی بنتے جاتے ہیں
اور حرف دل بن کے کہتے ہیں تم سے
سدا خوش رہو تم، سلامت رہو تم
محبت کی زندہ علامت رہو تم

انجم جاوید

ممتاز شاعر خالد اقبال یاسر
کی تصنیفات

پولینڈ کے 200 سال پر محیط 100 سے
زائد عشقیہ نظموں کا انتخاب
پولینڈ کی عشقیہ شاعری

مقبول ترین ناولسٹ پالو کویلھو کے شہرہ آفاق
ناول "کیمسٹ" کا اردو ترجمہ
کیمیا دان

انٹرنیشنل کانگرس آف رائٹرز' آرٹس اینڈ انٹی لکچول' 178۔ سی ماڈل ٹاؤن' لاہور

ممتاز شاعر عزیر احمد
کا شعری مجموعہ
شام ہو گئی جاناں
ہر اہم بک سٹال سے دستیاب ہے۔

عامر بن علی اور ابرار احمر کے
کیے ہوئے انٹرویوز
گفتگو
کا مطالعہ کیجئے اور ادیبوں سے ملیے

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

احمد ندیم قاسمی

(یہ تحریر 2 ستمبر 1977ء کو نیشنل سنٹر لاہور میں' ڈاکٹر ایوب مرزا کی کتاب ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کی تقریب رونمائی میں پڑھی گئی تھی۔ اس میں مصنف کے علاوہ خود فیض احمد فیض بھی موجود تھے' بلکہ تقریب کی صدارت بھی انہی نے فرمائی تھی۔ جن لوگوں کو مجھ سے شکوہ ہے کہ میں نے فیض صاحب کے انتقال کے بعد ان کی بعض فروگذاشتوں کی نشان دہی کی وہ یہ مضمون بغور پڑھیں جس میں فیض صاحب کے ''ایم' بی' ای'' کے اعزاز کے علاوہ' گورنر کرمانی کی تقریریں لکھنے کا بھی ذکر ہے اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے متعلق ان کی شکایت کا بھی حتمی جواب موجود ہے۔ فیض صاحب نے اپنے صدارتی خطبے میں میری طرف سے ان نشان دہیوں کا کوئی ذکر نہ فرمایا جبکہ وہ چاہتے تو اپنا موقف واضح کر سکتے تھے۔)

ندیم

ڈاکٹر ایوب مرزا کو اگر مصور فرض کر لیا جائے تو انہوں نے ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' میں فیض صاحب کی تصویر بہت دلچسپ انداز میں پینٹ کی ہے۔ فیض صاحب کی آؤٹ لائن لگا لینے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے ان کی قمیص کے بٹن بنائے ہیں پھر آنکھیں بنانے لگے ہیں مگر انہیں ادھورا چھوڑ کر فیض صاحب کے ناخنوں کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔ وہاں سے خیال آیا ہے کہ فیض صاحب کے چہرے پر ایک تل بھی تو ہے! تصویر بنانے کے اس طریق کار کی داد تو صادقین صاحب ہی دے سکیں گے جو الٹی تصویر بھی سیدھی تصویر کی سی سہولت سے بنا ڈالتے ہیں' مگر میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کی تصویر بنا لی ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ فیض صاحب کو بکھیرا جا رہا ہے مگر جب کتاب کا مطالعہ مکمل ہو چکتا ہے تو ایک واضح شخصیت سامنے آ جاتی ہے۔۔گمبھیر' پر اسرار مگر نرم و گداز۔۔ چنانچہ قاری' جو کتاب کے مطالعے کے دوران اس بات پر ڈاکٹر ایوب مرزا سے الجھتا رہتا ہے کہ وہ موضوعات سے لمبی اور اونچی چھلانگیں کیوں لگوا رہے ہیں' کتاب کو مکمل کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کا ممنون ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک جیتی جاگتی شخصیت کو ایک جیتے جاگتے انداز میں پیش کر دیا ہے۔ پھر ڈاکٹر صاحب کو یہ دعویٰ بھی نہیں ہے کہ انہوں نے فیض صاحب کے سوانح لکھے ہیں یا وہ ان کے فن کا تنقیدی یا تحسینی جائزہ لے رہے ہیں۔ انہوں نے تو فیض صاحب کی محبت میں سرشار ہو کر چند یادوں' چند ملاقاتوں اور چند باتوں کی بازیافت کی ہے اور اس بازیافت کو الفاظ میں منتقل کر دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس بازیافت سے فیض صاحب کی جو شخصیت ابھر کر ہمارے سامنے آتی ہے' وہ سچ مچ انہی فیض صاحب کی شخصیت ہے جنہیں ہم جانتے ہیں اور جن کا احترام کرتے ہیں اور جن سے پیار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے مجھے یہ شکایت ضرور ہے کہ انہوں نے فیض صاحب سے گفتگو کا اندراج ترتیب سے نہیں کیا۔ فیض صاحب بول رہے ہوتے ہیں کہ وہ بیچ میں خود بول پڑتے ہیں' اور خود بول رہے ہوتے ہیں تو یکا یک احساس ہوتا ہے کہ یہ تو فیض صاحب بول رہے ہیں۔ بیشتر مقامات پر ڈاکٹر صاحب کے سوال اور فیض صاحب کے جواب کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کے لئے پوری عبارت کو پلٹ کر پھر سے پڑھنا پڑتا ہے۔ اگر چہ یہ کتاب کو بہت اچھی طرح پڑھانے کا بہت نیا طریقہ ہے مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی آ جاتا ہے کہ جب ہماری تحریر میں واوین (inverted commas) مستعمل ہیں تو ان سے کام نہ لینے میں کون سی حکمت تھی۔

ڈاکٹر صاحب کو ادیب یا زبان دان ہونے کا بھی کوئی دعویٰ نہیں ہے اس لئے ان کے اس طرح کے دلچسپ جملوں پر انگشت نمائی کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ''میں نے کرنیل صاحب کی گھنٹی بجائی'' مگر واقعات کے

ذکر میں بھی بعض ننھی منی غلطیاں مستقبل کے محققین کے لئے خاصی پریشان کن ثابت ہوسکتی ہیں اس لئے میرا مشورہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کتاب کے آئندہ ایڈیشن میں اس کی تصحیح فرمالیں۔ مثلاً انہوں نے لاہور میں ''ایس پی ایس کے'' ہال کو موچی دروازے کے باہر دکھایا ہے حالانکہ وہ یادش بخیر' موری دروازے کے باہر واقع تھا۔ اسی طرح جہاں منٹو کے ان افسانوں کا ذکر آیا ہے جن کے خلاف مقدمہ چلا' وہاں انہوں نے افسانہ ''بو'' کو شامل نہیں کیا اور افسانہ ''کھول دو'' کو شامل کر دیا ہے حالانکہ ''کھول دو'' پر مقدمہ نہیں چلا تھا بلکہ جس رسالے میں یہ افسانہ شائع ہوا تھا' اس کی اشاعت پر چھ ماہ کی پابندی لگا دی گئی تھی۔ یہ مجھے اس لئے یاد ہے کہ ''کھول دو'' بھی میں نے ''نقوش'' میں چھاپا تھا اور ''بو'' بھی میں نے ہی ''ادب لطیف'' میں درج کیا تھا۔

مولانا چراغ حسن حسرت اور ڈاکٹر تاثیر کے درمیان جو یادگار منظوم قلمی جنگ برپا ہوئی تھی' اس کا سنہ بھی غلط درج ہے۔ اس جنگ کا آغاز دراصل انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل پاکستان کانفرنس کے بعد ہوا جو نومبر 1949ء میں منعقد ہوئی تھی اور اس میں مولانا حسرت سے خطبہ استقبالیہ پڑھنے کا گناہ سرزد ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر تاثیر جو کسی زمانے میں ترقی پسند مصنفین کے رہنما تھے' ان دنوں ترقی پسند مصنفین کے شدید مخالف تھے' چنانچہ انہوں نے اور ان کے چند عقیدت مندوں نے ایک روزنامے میں مولانا حسرت کے خلاف نظموں کا سلسلہ شروع کیا۔ مولانا حسرت نے روزنامہ ''امروز'' میں ''فتولہار'' کے نام سے ان نظموں کے منظوم جواب لکھے۔ دو چار روز کے بعد فیض صاحب اور میں بھی مولانا کی کمک کو آ پہنچے۔ میرے لئے مولانا نے ''سرکوب لاہوری'' کا نام تجویز کیا' اور فیض صاحب بھی اس جنگ میں شاید کسی فرضی نام ہی سے شامل ہوئے۔ بہرحال یہ یادگار مناظمہ 1948ء کی بجائے 1949ء کے اواخر اور 1950ء کے اوائل کا ادبی معرکہ ہے جسے انہی دنوں ہفت روزہ چٹان نے اپنے صفحات میں محفوظ کرلیا تھا۔ جن دو روزناموں میں یہ مناظمہ ہوا' ان کے نام بھی ڈاکٹر صاحب نے صحیح نہیں لکھے۔

ڈاکٹر صاحب نے میرا ایک مصرع بھی فیض صاحب کے حوالے کر دیا ہے' مگر میں اسے اپنا ایک اعزاز سمجھتا ہوں اس لئے اسے گول کر دیا ہے۔ البتہ ڈاکٹر ایوب مرزا کی اس کتاب میں فیض صاحب کے حوالے سے انجمن ترقی پسند مصنفین کا جو احوال درج ہے' وہ اس زمانے کے جنرل سیکرٹری کے لئے' یعنی میرے لئے' انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے۔ مثلاً یہی کہ فیض صاحب انجمن سے خفا تھے' حالانکہ میں اپنی سادہ لوحی میں' ڈاکٹر صاحب کی اس کتاب کے مطالعے سے پہلے تک یہی سمجھتا رہا کہ ہم ادیبوں کو جو ''لائن'' ملتی تھی وہ فیض صاحب ہی کی طرف سے آتی تھی یا کم سے کم فیض صاحب کی تائید اس میں ضرور شامل ہوتی تھی۔ انجمن کی طرف سے بے شمار نامور ادیبوں کے بائیکاٹ کا فیصلہ سخت حماقت مآب فیصلہ تھا اور میں خود اس کا مخالف تھا مگر اکثریت کے سامنے ہتھیار ڈالے بغیر چارہ نہ تھا۔ اور بعد میں میں نے ہی استصواب رائے عامہ کے ذریعے یہ قرارداد واپس لے لی تھی۔ اس کتاب سے انکشاف ہوا کہ فیض صاحب بھی اسے ''بک بک'' ہی سمجھتے تھے۔ جملہ یہ درج ہے ''ہمیں یہ بک بک لگی اور ہماری ان سے جنگ ہوگئی'' --- اور میں حیران ہوں کہ یہ جنگ کہاں ہوتی رہی کیونکہ انجمن کا جنرل سیکرٹری

اس جنگ سے آج تک بے خبر تھا۔ نومبر 1949ء کی اس کانفرنس میں' جس میں بائیکاٹ کی یہ افسوس ناک قرارداد منظور کی گئی تھی' فیض صاحب انجمن کے تمام جلسوں کی پریزیڈیم میں شامل تھے۔ البتہ وہ کوئی عہدہ قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس کے باوجود ہم نے یہ سوچ کر کہ بھاگنے نہ پائیں' انہیں انجمن کا خزانچی چن لیا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان سے کوئی کام نہ لیا جا سکا کیونکہ کوئی خزانہ ہی موجود نہیں تھا جس کی تقسیم کے سلسلے میں خزانچی کو تکلیف دی جاتی۔

میرے حوالے سے جو باتیں اس کتاب میں درج ہیں' ان میں سے یہ بات بالکل صحیح ہے کہ میں نے انجمن کے ایک ہفت روزہ اجلاس میں علامہ اقبال پر ایک مضمون پڑھا جس میں شاہ امان اللہ خان' شاہ نادر شاہ اور نواب بھوپال کے حوالے سے علامہ کے مردِ مومن کے عملی معیاروں پر اظہارِ حیرت کیا تھا اور کبوتر پر شاہین کے جھپٹنے کے سلسلے میں کبوتر کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کیا تھا۔ یہ استفہامیے میرے ذہن میں آج بھی کنڈلی مارے بیٹھے ہیں مگر میں تسلیم کرتا ہوں کہ فیض صاحب نے میرے اس مضمون پر نہایت عالمانہ اور بے حد مثبت بحث کی اور فرمایا کہ علامہ کی سامراج دشمنی اور ملائیت دشمنی کے سامنے ان کی کوئی خامی ٹھہر ہی نہیں سکتی۔ انجمن کی تاریخ میں فیض صاحب کے یہ ارشادات ایک منارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ انجمن کے عام جلسوں میں پہلے بھی شاذ ہی شریک ہوتے تھے' اس واقعے کے بعد تو شرکت بالکل ترک کر دی مگر یہ ہماری نومبر 1949ء کی کانفرنس سے بہت پہلے کا ذکر ہے اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں' فیض صاحب نے اس کانفرنس کے ہر اجلاس میں شرکت فرمائی اور آخری اجلاس میں جب اوپن ایئر تھیٹر کی پہاڑی کے نیچے' سینکڑوں لوگ ہمارے خلاف نعرے سرکر رہے تھے' فیض صاحب جلسہ گاہ میں دعوت دے رہے تھے کہ:

وہ آئیں تو سرِ مقتل' تماشا ہم بھی دیکھیں گے

میرے حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے ایک اور نئی بات بھی لکھی ہے کہ میں نے 1949ء میں ''حقیقت پسند ادب میں خاصا نام پیدا کر لیا تھا'' میں اس سرٹیفکیٹ کے لئے ڈاکٹر صاحب کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔

البتہ ڈاکٹر صاحب کی اس غلط فہمی کو دور کرنا میرا فرض ہے کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک ختم ہو گئی' حالانکہ تنظیم ختم ہوئی تھی اور تنظیمیں ختم ہونے سے ایسی تحریکیں ختم نہیں ہوا کرتیں جو تنظیم کی توانائی کی بجائے اپنی توانائی کے بل پر چلتی رہتی ہیں' اور آج ہمارے ادبی منظر میں جو مثبت چہل پہل ہے وہ بیشتر اسی تحریک کی دین ہے۔ ایک مقام پر ڈاکٹر صاحب نے آدم جی ادبی انعام کی بھی تضحیک فرمائی ہے اور میرا خیال ہے کہ کم سے کم انہیں تو ایک معمولی سے ملکی انعام کے سلسلے میں یوں احساسِ کمتری کا اظہار نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اگر وہ انگریز کی طرف سے فیض صاحب کو ایم بی ای کا خطاب ملنے کا جواز پیش کر سکتے ہیں تو ایک ننھا سا جواز اس انعام کا بھی پیدا کر سکتے تھے۔ کم سے کم یہی کہہ دیتے کہ ایک ایلفرڈ نوبیل تھا۔ وہ بھی بہت بڑا سرمایہ دار تھا مگر اس کے نوبیل

انعام کی دنیا بھر میں عزت کی جاتی ہے کیونکہ وہ ایک بڑی رقم پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک آدم جی ہے وہ بھی بڑا سرمایہ دار ہے اور اگرچہ اس کے انعام کی رقم بہت معمولی ہے مگر اس پس ماندہ ملک میں یہ بھی غنیمت ہے کہ یہ اپنے ملک کا انعام ہے۔

میں نے ڈاکٹر ایوب مرزا کے ارشادات پر ذرا تفصیل سے اس لئے روشنی ڈالی ہے کہ وہی اس کتاب کے مصنف ہیں۔ کتاب کا موضوع فیض صاحب ہیں اور میں اس سلسلے میں شروع ہی میں عرض کر چکا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے ایک جیتی جاگتی شخصیت جیسی کہ فیض صاحب کی ہے ہمارے سامنے اور مستقبل کی نسلوں کے سامنے لا کھڑی کی ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب ادیب نہ ہونے کے دعوے کے باوجود فیض صاحب کے باقاعدہ سوانح لکھتے تو مجھے یقین ہے کہ بہت کامیاب رہتے کیونکہ وہ فیض صاحب کے اتنے قریب ہیں اور ان کے کتنے دنوں اور کتنی راتوں کے ساتھی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں یہ بھی ان کا احسان ہے کہ انہوں نے فیض صاحب کی پاکستان دوستی کا واشگاف اور غیر مبہم انداز میں اعلان کیا ہے اور فیض صاحب کے منہ سے یہ تک کہلوایا ہے کہ "پاکستان کے قیام کی جدوجہد ہمارا جزو ایمان ٹھہرا۔" پھر اس میں ایک اور اہم سیاسی انکشاف بھی موجود ہے جو ان اکا دکا لوگوں کو بہت تلخ لگے گا جو تیس برس سے یہ ڈھول پیٹتے چلے آ رہے ہیں کہ برصغیر کے ہندوؤں مسلمانوں کو انگریز نے لڑایا اور اس لئے پاکستان انہی کی تائید سے وجود میں آیا۔ فیض صاحب کہتے ہیں کہ انگریزوں اور امریکنوں کو تو ایک آزاد اور خودمختار پاکستان کا وجود ہی گوارا نہیں تھا۔

ایک لحاظ سے یہ ایک نظریاتی کتاب ہے -- نظریاتی ان معنوں میں کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اس میں فیض صاحب کے تمام ممکنہ نظریات سمیٹ لئے ہیں -- روس چین چپقلش اور شعر کی ماہیت سے لے کر نثری نظم تک -- کوئی بھی ایسا موضوع نہیں ہے جس پر مصنف نے فیض صاحب سے تبادلہ خیال نہ کیا ہو۔ اس دور کی ایک بہت بڑی اور بے حد محبوب ادبی شخصیت کے نظریات کے بارے میں یہ متنوع تفصیل ایک بہت بڑا ادبی سرمایہ ہے جس کی اہمیت فیض صاحب کی صداقت کلام اور حسن کلام کے زیادہ سے زیادہ احساس و شعور کے ساتھ زیادہ سے زیادہ ہوتی جائے گی اور فیض صاحب کے سلسلے میں یہ محض حوالے کی کتاب نہیں ہوگی استفادے کی کتاب ہو گی۔

یہ بھی طے ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب فیض صاحب سے محبت و عقیدت سے سرشار ہو کر لکھی ہے اور اگرچہ فیض صاحب سے ان کے بعض سوالوں کا لہجہ خاصا گستاخانہ معلوم ہوتا ہے مگر وہ اس مظاہرے کے باوجود جانب دار ہیں کیونکہ محبت ہمیشہ جانب دار ہوتی ہے۔ فیض صاحب پر تنقید کرنے والوں کی کمی نہیں ہے اور اگرچہ ان سے محبت کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے مگر وہ فیض صاحب کی طرح زیادہ نہیں بولتے۔ ڈاکٹر ایوب مرزا نے فیض صاحب کے ساتھ محبت کا مظاہرہ کر کے سب لوگوں کو جو فیض صاحب سے بہر حالت اور بہر صورت محبت کرتے رہے ہیں کچھ کھل کر کہنے پر اکسایا ہے۔ کہیں کہیں ڈاکٹر صاحب کی اس ہمہ گیر محبت سے فیض

صاحب کی خامیاں بھی خوبیاں بنا دی گئی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ فیض صاحب کی خامیوں پر بھی پیار آنے لگتا ہے--سوائے ایک خامی کے' کہ وہ گورنر گورمانی کی تقریریں لکھا کرتے تھے--اس خامی پر تو ڈاکٹر صاحب کو بھی پیار نہیں آیا۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے کہ مَیلا سے واپسی پر انہوں نے فیض صاحب کو ایک دیدہ زیب سوٹ میں ملبوس دیکھا تو انہیں حیرت ہوئی۔ خود فیض صاحب کی صاحبزادی کا بھی خیال ہے کہ وہ ڈھیلا ڈھالا لباس پہنتے ہیں مگر مجھے ان سے اتفاق نہیں ہے۔ فیض صاحب جامہ زیب آدمی ہیں اس لئے لباس' دیدہ زیب ہو یا ڈھیلا ڈھالا' ان پر ہمیشہ فٹ بیٹھتا ہے۔ بس ایک بار ایک المیہ ہوگیا اور فیض صاحب کے لباس کا قصہ میں نے یہی واقعہ سنانے کے لئے چھیڑا ہے۔ پاکستان کے روزناموں کے سولہ مدیروں کا وفد چین جا رہا تھا۔ میں بھی اس میں شامل تھا۔ فیض صاحب اس وفد کے قائد تھے۔ ہم لوگوں کو دو تین روز ہانگ کانگ میں رکنا پڑا۔ معلوم ہوا کہ وہاں کے ٹیلر ماسٹر آرڈر ملتے ہی سوٹ دو چار گھنٹے میں تیار کر دیتے ہیں۔ ہم دونوں نے سر سوٹوں کے لئے کپڑا خریدا۔ میرے سوٹ کا رنگ بادامی تھا اور فیض صاب نے سفید براق کپڑا پسند کیا تھا۔ سوٹ شام تک سل کر آ گئے۔ فیض صاحب یہ سفید سوٹ پہن کر صبح ناشتے کے لئے تشریف لائے تو مجھ سے پوچھا۔ ''کیسا ہے؟'' میں کبھی کبھی گستاخی کر لیتا ہوں۔ عرض کیا کہ ویسے تو بہت اچھا ہے اور بہت فٹ ہے مگر یہ سوٹ پہن کر ڈائننگ ہال پر ایک نظر دوڑا لیجئے۔ پوچھا۔ ''کیوں؟'' عرض کیا کہ اس ہوٹل کے بیروں کے سوٹ بھی تو سفید ہیں۔ اس کے بعد میں نے انہیں اس سوٹ میں ملبوس نہیں دیکھا۔ میرے خیال میں پاکستان واپس آ کر کسی بیرے کو دے دیا ہوگا۔

اس واقعے سے مجھے خیال آیا کہ اگر ڈاکٹر ایوب مرزا' فیض صاحب سے گفتگو کے علاوہ ان کے بارے میں ان کے دوستوں اور عقیدت مندوں سے بھی گفتگو کر لیتے تو ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' کی اہمیت اور لطافت میں بہت اضافہ ہو جاتا۔ ڈاکٹر صاحب کو فیض صاحب نے اپنے بارے میں تو سب کچھ بتا دیا مگر فیض صاحب کے بارے میں ان کے دوست ڈاکٹر صاحب کو جو کچھ بتاتے وہ بے حد مزیدار ہوتا۔ یوں فیض صاحب کی نظریاتی بحثوں کے بعد جب ان کے کسی دوست کا اس طرح کا بتایا ہوا واقعہ بھی درج ہو جاتا تو نظریے کی ساری جزابند متانت' آسودہ مسکراہٹوں میں ڈھل جاتی کہ فیض صاحب سگرٹ جلانے کے لئے کسی سے ماچس لیتے ہیں تو سگریٹ جلا کر بے خیالی میں ماچس کی ڈبیا کو اپنی جیب میں رکھ لیتے ہیں اور یوں بیگم ایلس' فیض صاحب کی جیبوں میں سے دیا سلائی کی روزانہ ایک درجن ڈبیاں برآمد کرتی ہیں۔!

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ڈاکٹر ایوب مرزا نے اس کتاب میں فیض صاحب کے بارے میں فیض صاحب کی صاحبزادیوں ''چھیمی'' اور ''میزو'' کے جو تحریری تاثرات درج کئے ہیں وہ اس پوری کتاب کا لطیف ترین اور حسین ترین حصہ ہیں۔ یہ تاثرات اتنی نرمی اور معصومیت اور صداقت اور خوبصورتی سے لکھے گئے ہیں کہ مجھے تو وہ بجائے خود ادب پارے معلوم ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ''چھیمی'' اور ''میزو'' کے تاثرات شامل کر

کے اچھا بھی کیا اور اچھا نہیں بھی کیا -- اور اچھا اس لئے نہیں کیا کہ ان دو بچیوں کی تحریروں کے بعد ڈاکٹر صاحب کی تحریر پڑھتے ہوئے قاری سوچتا ہے کہ کاش ڈاکٹر صاحب سچ مچ ادیب ہوتے اور انہیں یہ کتاب لکھنے کی معذرت کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

شاید یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ اس کتاب میں صادقین کے بنے ہوئے فیض صاحب کے آٹھ سکیچ شامل ہیں۔ اپنا مفصل تاثر بیان نہیں کروں گا' صرف یہ عرض کروں گا کہ اس کتاب کو دو چاند تو چھپی اور میزد نے لگائے تھے اور آٹھ چاند صادقین نے لگا دیے ہیں۔

کتاب پر قیمت اور ملنے کا پتہ دونوں درج نہیں۔

o...o...o

جدید اور منفرد لہجے کے شاعر
خالد اقبال یاسر
کے شعری مجموعے
"درو بست"
"گردش"
ابلاغ: 733' آئی۔10/4' اسلام آباد

امیر کبیر حضرۃ سید علی ہمدانی

(پروفیسر) جگن ناتھ آزاد

آنسوے افلاک[1] علامہ اقبال کی تصنیف لطیف ''جاوید نامہ'' کے اہم ترین ابواب میں سے ہے اور اس کی اہمیت اس رمز میں پنہاں ہے کہ اقبال نے اس میں حیات وموت کے مسئلے پر بحث کی ہے۔ حیات جاوداں کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے اور ''فنا فی رشد'' اور ''فنا فی الرسولؐ'' کی تشریح کی ہے اور جہاں تک مسئلہ کشمیر[2] کا تعلق ہے اسے محض ایک سیاسی کشمکش کا رنگ دے کر منزل آزادی کے رہروؤں کے لئے فقط دنیاوی رستہ پیش نہیں کیا بلکہ اسے دین کے ساتھ وابستہ کر کے اسے ایک رفعت اور عظمت عطا کی ہے۔ جگر نے کیا عمدہ کہا ہے

یہ مصرع کاش نقش ہر در و دیوار ہو جائے
جسے جینا ہو مرنے کے لئے تیار ہو جائے

دراصل دنیا میں سیاست کے دو پہلو رہے ہیں۔ ایک کی بنیاد جوع الارض پر ہے اور دوسرے کی حب آدم پر۔ ''جاوید نامہ'' کا مذکورہ باب اسی حب آدم ہی کی تشریح وتفسیر ہے۔ اقبال نے مسئلہ کشمیر کے تعلق سے اپنے فلسفہ حیات کی ابتدا ملا طاہر غنی کاشمیری کے اس شعر سے کی ہے

جمع کردم مشت خاشاکے کہ سوزم خویش را
گل گماں دارد کہ بندم آشیاں در گلستاں

یوسف سلیم چشتی اس شعر کی یہاں موجودگی پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اس کے پردے میں اقبال یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا سے دل لگانے کا نتیجہ تباہی (فنا) کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ دیکھو! بلبل رنگ و بو (مادیات) پر فریفتہ ہو کر گلشن میں آشیانہ بناتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اسی طرح ہمیشہ باہر کا عالم رہے گا اور میں اسی طرح پھولوں سے لطف اندوز ہوتی رہوں گی۔ مگر انجام یہ ہوتا ہے کہ یا تو صیاد کے پھندے میں پھنس جاتی ہے یا آشیانے پر بجلی گر پڑتی ہے اور اس کے ساتھ وہ بھی جل جاتی ہے۔''

تو غنی کاشمیری کا یہ شعر سنتے ہی رومی اقبال کو مشورہ دیتے ہیں کہ ''اے پسر! جو کچھ ہونے والا ہے اسے دیکھ اور جو کچھ گزر گیا ہے اس کا غم نہ کر (وہ دیکھ) شاعر رنگیں نوا جس کا نام طاہر غنی ہے اس کا فقر باطن میں بھی غنی

ہے۔ وہ مست مدام شاعر' سید السادات حضرت علی ہمدانی [3] کے حضور میں اپنا کلام سنا رہا ہے۔ سید والا مقام جو سید السادات ہیں' سالار عجم ہیں اور جن کا ہاتھ تقدیر امم کا معمار ہے۔ غزالی ایسے مفکر نے جب اللہ ہو کا درس لیا تو ذکر و فکر انہوں نے سید علی ہمدانی کے بزرگوں سے حاصل کیا تھا۔ اس کشور جنت نظیر [4] کے مرشد [5] جو امیروں' درویشوں اور بادشاہوں کے مشیر ہیں۔ اس شاہ دریا آستیں [6] نے کشمیر کو علم صنعت' تہذیب اور دین سے آشنا [7] کیا۔ اس مرد مجاہد نے اس نادر اور دلپذیر آرٹ کی بدولت ایک ایران صغیر پیدا کر دیا۔ اس کی ایک نگاہ سو گرہیں کھول دیتی ہے۔ اٹھ اور اس کے تیر کو اپنے دل میں راستہ دے [8]۔''

یہاں یہ بیان کرنا نامناسب نہیں ہو گا کہ کشمیر کو ایران کا ہمدوش بنانے میں حضرت سید علی ہمدانی ہی کی کاوش کو بڑا دخل ہے۔ چنانچہ رومی ایک تو اس وجہ سے زندہ رود (یعنی اقبال) کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ تم اپنے مسائل شاہ ہمدان کے حضور میں پیش کرو۔ دوسرا یہ کہ روحانی دنیا میں شاہ ہمدان بہت بڑے مرتبے کے حامل ہیں انہی کے خاندان کے ایک بزرگ فلسفے اور تصوف میں امام غزالی کے استاد تھے۔ خود شاہ ہمدان نے بادشاہوں کو نظام حکومت کے سلسلے میں مشورہ دینے کے لئے ''ذخیرۃ الملوک'' نامی کتاب لکھی۔ اقبال نے مندرجہ ذیل شعر میں ان کے دینی کمالات بیان کرتے ہوئے دنیاوی کمالات کے ذکر میں اسی کتاب کی طرف اشارہ کیا ہے

مرشد معنی نگاہاں بودہٗ

محرم اسرار شاہاں بودہٗ

افلاک کے دوسری جانب پہنچ کے رومی اور زندہ رود (اقبال) پہلے تو جرمنی کے فلسفی نیٹشے کی جائے قیام سے گزرتے ہیں لیکن نیٹشے سے اقبال کی ملاقات نہیں ہوتی۔ اقبال اسے دیکھ کر اپنے رہنما رومی سے پوچھتے ہیں کہ ''یہ دیوانہ کون ہے؟'' رومی اقبال کو نیٹشے کے بارے میں بہت کچھ بتاتے ہیں۔ وہاں سے دونوں جنت الفردوس کا رخ کرتے ہیں جہاں ان کی پہلی منزل شرف النساء کا محل ہے اور دوسری منزل امیر کبیر حضرت سید علی ہمدانی اور ملا طاہر غنی کاشمیری کی زیارت ہے۔

اقبال کی شاہ ہمدان کی خدمت میں حاضری اور ان کے ساتھ بات چیت دراصل روح و بدن اور خیر و شر کے مسائل پر ایک حرف آخر کے انداز کی بات چیت ہے۔ اقبال کے فلسفہ حیات کا مرکزی خیال یہی ہے کہ قفل دنیا کو کلید دین سے کھولنا چاہئے اور ''جاوید نامہ'' کا یہ باب اسی نقطۂ نگاہ کی تفسیر ہے۔

✿ ✿ ✿

حوالہ جات

-1 آں سوئے افلاک۔ آسمانوں کی اس طرف۔ دوسری جانب

-2 ''جاوید نامہ'' 1932ء میں اشاعت پذیر ہوا لیکن اس کا مسودہ 1930ء کے آخر تک مکمل ہو چکا تھا [illegible]

مدت کتاب کی طباعت میں صرف ہوئی۔ گویا 31-1930ء میں مسئلہ کشمیر جس صورت میں تھا وہ اقبال کے سامنے تھا۔

3- اقبال نے اپنے خیالات کا اظہار اس خطبہ صدارت میں بھی کیا ہے جو 1930ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ (الہ آباد) کے اجلاس میں پڑھا اور جو آج مطالعہ اقبال کے سلسلے میں خاصی حد تک متنازعہ فیہ تحریر سمجھی جاتی ہے کیونکہ اس کے ایک سے زیادہ مطبوعہ نسخے دستیاب ہیں جن کے متون میں اختلاف ہے۔ (اس اختلاف کا میرے زیر تحریر مقالے سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ اختلاف اس مقام پر ہے جہاں علامہ مرحوم نے Within Indian Empire لکھا ہے یا Within Indian Empire or outside لکھا ہے۔ زیر تحریر مقالے میں یہ مسئلہ زیر بحث آتا ہی نہیں ہے۔ ویسے میں اس مسئلے کے بارے میں اپنے کسی مقالے میں لکھ چکا ہوں کہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد اس مسئلے کو زیر بحث لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا) لہذا بیائم برسر مطلب۔ مذکورہ تحریر میں اقبال لکھتے ہیں "سرزمین مغرب میں مسیحیت کا وجود محض ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس سے کلیسا کی ایک وسیع حکومت قائم ہوئی..... اگر مذہب کا تصور یہی ہے کہ اس کا تعلق صرف آخرت سے ہے اور دنیوی زندگی سے کوئی سروکار نہیں تو جو انقلاب مسیحی دنیا میں رونما ہوا ہے وہ ایک طبعی امر تھا۔ مسیح علیہ السلام کا عالم گیر نظام اخلاق نیست و نابود ہو چکا ہے اور اس کی جگہ اخلاقیات و سیاسیات کے قومی نظامات نے لے لی ہے۔ اس سے اہل مغرب بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن اسلام کے نزدیک ذات انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے۔ وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ اسلام کی رو سے خدا اور کائنات' کلیسا اور ریاست' روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزاء ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر' جو کسی دوسری جگہ واقع ہے' ترک کر دینا چاہیے۔ اسلام کے نزدیک مادہ روح کی اس شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید مکانی و زمانی میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغرب نے مادے اور روح کی ثنویت کا عقیدہ بنا کسی غور و فکر کے مانویت کے زیر اثر قبول کر لیا ہے..... دراصل یہ روحانی اور دنیوی زندگی کا غلط امتیاز ہے جس سے مغرب کے سیاسی اور مذہبی افکار بیشتر طور پر متاثر ہوئے ہیں اور جس سے یورپ کی مسیحائی ریاستوں نے عملاً مذہب سے کلیتہً علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ اس سے چند متفرق اور بے ربط سلطنتیں قائم ہو گئی ہیں جن پر کسی انسانی جذبے کی بجائے قومی اغراض کی حکمرانی ہے۔" (حرف اقبال۔ مولوی لطیف احمد شیروانی)

4- سید علی ہمدانی 1314/714 میں پیدا ہوئے۔ وہ کبرویہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ جو سہروردیوں کی ایک شاخ ہے۔ ان کے مرشدوں کا سلسلہ دو واسطوں سے علاؤ الدین سمنانی سے ہوتا ہوا نجم الدین کبری تک پہنچتا ہے۔ انہوں نے دنیائے اسلام کی کئی بار سیاحت کی۔ وہ 1371/774 میں کشمیر پہنچے جب شہاب الدین حکمران تھا۔

اس سفر میں 700 مریدان کے ہمراہ تھے جن کو انہوں نے کشمیر میں بسا دیا۔ یہ لوگ مختلف فنون کے ماہر تھے۔ انہوں نے کشمیر کے لوگوں کو اسلام سے آشنا کیا اور اس کے ساتھ ہی ایران کے مختلف علوم و فنون کشمیر میں رائج کئے۔ اس بنا پر کشمیر کو ایران صغیر کہا جاتا ہے۔
آپ 1385 / 786 میں فوت ہوئے۔ (بشیر احمد ڈار)
کشمیر کو ایران صغیر کہنے کا ایک سبب اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ دونوں کی آب و ہوا میں خاصی مماثلت ہے۔

5- کشمیر

6- حضرت سید علی ہمدانی

7- حضرت سید علی ہمدانی

8- حضرت سید علی ہمدانی ایران سے اپنے ہمراہ درویشوں کے ساتھ ہنرمندوں اور صنعت کاروں کو بھی لائے تھے جن میں بڑی تعداد میں لکڑی کا کام کرنے والے اور قالین باف شامل تھے۔

9- گفت رومی آنچہ می آید نگر — دل مدہ با آنچہ بگذشت اے پسر!
شاعر رنگیں نوا طاہر غنی — فقر او باطن غنی ظاہر غنی
نغمۂ می خواند آں مست مدام — در حضور سید والا مقام
سید السادات سالار عجم — دست او معمار تقدیر امم
تا غزالی درس اللہ ہو گرفت — ذکر و فکر از دودمان او گرفت
مرشد آں کشور مینو نظیر — میر و درویش و سلاطیں را مشیر
خطہ را آں شاہ دریا آستیں — داد علم و صنعت و تہذیب و دیں
آفرید آں مرد ایران صغیر — با ہنرہائے غریب و دلپذیر
یک نگاہ او کشاید صد گرہ
خیز و تیرش را بدل راہے بدہ

افغانستان

(خصوصی گوشہ)

ننھی پلوشہ کی صدا/قندھار سے

O

احفاظ الرحمان

لعل و گوہر نہیں مانگتی آپ سے
مشک و عنبر نہیں مانگتی آپ سے
خلعت و من و سلویٰ نہیں چاہتی
کوئی دل کش کھلونا نہیں چاہتی
میرے بابا نہیں، میری ماما نہیں
وہ کہاں ہیں، یہ کوئی بتاتا نہیں
رات اندھیری ہے، کوئی سہارا نہیں
کوئی جگنو نہیں، کوئی تارا نہیں

مجھ کو تازہ ہوا، روشنی چاہیے
مسکراتی ہوئی زندگی چاہیے
سر پہ سایہ فگن سائبان چاہیے
رحم دل، مہرباں آسماں چاہیے
کس طرف جاؤں، دھرتی لہو سے ہے تر
آسماں آگ اُگلتا ہے آٹھوں پہر
میرے چاروں طرف آگ ہی آگ ہے
موت کا سنسناتا ہوا راگ ہے

پھر دھماکا ہوا......
دم مرا گھٹ رہا ہے، سنبھالیں مجھے

آ ئیں باہوں میں اپنی اٹھا لیں مجھے

آسماں سے کہیں ہاتھ روکے ذرا
دم تو لے لوں ذرا......
کیا کہا آپ بے بس ہیں مجبور ہیں
خود ہی اپنے تجاہل پہ رنجور ہیں؟
چھوڑیے جائیے آپ غم گیں نہ ہوں
میں تو آنسو ہوں پلکوں پہ ٹھیرا ہوا
ایک پل کو رکا ایک پل میں گرا
یوں ہی روتے ہوئے نیند آ جائے گی
نیند آ جائے گی اور سو جاؤں گی
آن کی آن میں دور کھو جاؤں گی
......پھر دھماکا ہوا......
سو جاؤں گی ......
سو ...... جاؤں ...... گی!

☆

پھول بانٹنے والا

O

احفاظ الرحمان

یہ چہرہ کس کا چہرہ ہے؟
کہتا ہے دنیا بھر میں مجھے
بھائی چارہ پھیلانا ہے

کہتا ہے امن کا خوگر ہوں
انصاف کا پرچم ہاتھ میں ہے
میں پھول بانٹنے آیا ہوں

یہ چہرہ کس کا چہرہ ہے؟
تن اجلا ہے من میلا ہے
یہ بھیس بدل کر آیا ہے
دولت بھی اس کی جیبوں میں
بارود بھی اس کے ہاتھوں میں
طاقت کا نشہ طاری ہے
ہتھیاروں کا بیوپاری ہے
کہتا ہے دنیا والوں سے
میں منصف ہوں میں آقا ہوں
تم سائل ہو میں داتا ہوں
میں پھول بانٹنے آیا ہوں
گر میرا ساتھ نہ دو گے تو
تم جان سے اپنی جاؤ گے

یہ چہرہ کس کا چہرہ ہے؟
اک آقا کا؟
اک داتا کا؟
اک منصف کا؟
ہتھیاروں کے بیوپاری کا؟
یا پھول بانٹنے والے کا؟

*

نئی الف لیلہ

O

احفاظ الرحمان

کس کہانی کا ہے یہ آغاز اے شہرِ فسوں
کون سے موسم میں ٹھیرے گا ترا جوشِ جنوں
حلقۂ زنجیر میں کب دل کو آئے گا قرار
کون سی منزل پہ آئے گا پیامِ جاں فزا
کیا ترے صحرا کی قسمت میں گلِ خنداں نہیں
کیا ترے لوگوں میں خود جوئی کا کچھ ارماں نہیں
کس کہانی کا ہے یہ انجام بنتِ شہرزاد
کربلا میں کب تلک بہتا رہے گا یہ لہو
کب تلک مقتل میں سازش کا علم لہرائے گا
بے بصر کب تک ہلاکو سے مرادیں پائے گا
آئینے میں سارے چہرے بے گماں اپنے ہی ہیں
دستِ قاتل میں ہیں جتنے تیر
سب اپنے ہی ہیں
کارواں در کارواں تصویرِ حیرت دفن ہے
گم شدہ اوراق میں
صدیوں کی عبرت دفن ہے
کس کہانی کا ہے یہ انجام بنتِ شہرزاد
کس کہانی کا ہے یہ آغاز بنتِ شہرزاد
یہ سلاطینِ عرب، یہ تاج دارانِ ریال
ڈالروں کی سرزمیں سے عہد و پیماں کے غلام

موت کے سوداگروں کی حیلہ جوئی کے شکار
خاندانی حکم رانی کی روایت کے نشاں
اک کہانی' اک حکایت ان کے بھی انجام کی
موت کے سودے میں حاصل آخری انعام کی
بنت شہرزاد
وقت کے ماتھے پہ کندہ یہ کہانی بھی سنا!

☆

امریکا دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد ہے
اس کے اتحادی بھی دہشت گرد ہیں۔ نوم چومسکی

جنگ جاری رہے گی

○

احفاظ الرحمان

دل زمیں کا دھڑکتا رہے گا
زندگی مسکرانے کی دھن میں
لڑکھڑا کر سنبھلتی رہے گی
کھیل جاری ہے' جاری رہے گا
ظلم کی آندھیاں زور آور
مصلحت' جھوٹ' موقع پرستی
عاجزی' خوف' ایماں فروشی
سب معاون ہیں اک دوسرے کے
سب ہیں یک جان اک دائرے میں
دائرے سے الگ' سچ کی دنیا

ج کلاہی کی دولت سمیٹے
ر اٹھائے کھڑی ہنس رہی ہے
دائرے کی زبوں خستگی پر
بے ضمیری، فرو ماندگی پر
جھوٹ ہے بے چہرگی کا نشاں ہے
جھوٹ عفونت زدہ ہی رہے گا
سچ تو سچ ہے، مہکتا رہے گا
دل زمیں کا دھڑکتا رہے گا
جنگ جاری ہے، جاری رہے گی

The World Has Changed?

O

احفاظ الرحمان

زمیں کا رنگ وہی، آسماں کا ڈھنگ وہی
چمن کا روپ وہی
دراز دستیِ گل چیں کا کاروبار وہی
وہی کشاکشِ عالم، وہی فساد و عناد

تو کون ہیں، جو یہ کہتے ہیں کائنات میں اب
بدل گیا ہے ہر اک قدر کا سیاق و سباق
ہر ایک رنگ کو دیں گے ہم اک نیا عنواں
پرانی عینکیں پھینکو، نئی نظر لاؤ
نئی کتاب پڑھو اور نئے سبق سیکھو

یہ کون لوگ ہیں؟
یہ قاتلوں کے ساتھی ہیں
تمام ظالموں، غنڈوں، ٹھگوں کے ساتھی ہیں
یہ ظلم و جبر کے سوداگروں کے ساتھی ہیں
یہ اپنی عینکیں تبدیل کر کے آئے ہیں
ان عینکوں سے وہ منظر نظر نہیں آتے
جو خوں میں دفن ہوئے
آنسوؤں میں ڈوب گئے
عذابِ جبر کی تاریکیوں میں ڈوب گئے

یہ اپنی اندھی بصارت پہ فخر کرتے ہیں
ہم اپنی زندہ ضمیری پہ ناز کرتے ہیں
جو زہر ہے، اسے تریاق کہہ نہیں سکتے
جو ظلم ہے، اسے ہم نام ظلم کا دیں گے
جو اہرمن ہے، اسے اہرمن کہیں گے ہم

٭

نیو ورلڈ آرڈر

O

احفاظ الرحمان

ذرا سا زخم لگتا ہے، تو کہتے ہو
تمہارا غم ہے بے پایاں
تمہارے خوں کا ہر قطرہ سمندر کے برابر ہے
تمہارا زخم دنیا کی نئی تاریخ لکھے گا

زمین و آسماں پر زندگی کا ایک نیا عنوان لکھے گا
تمہیں یہ زعم ہے شاید
تمہارا دبدبہ مختار کل تم کو بنا دے گا
نئی تاریخ میں کہلاؤ گے تم فاتح عالم

نئی تاریخ لکھنے کی تمنا خوب ہے لیکن
بہت سے سورما آئے بہت سے تاج ور آئے
یہی وہ خواب تھا جس نے انہیں پامال کر ڈالا
انہیں تاریخ نے مردود اور ملعون ٹھیرایا
وہ اپنے زور بازو پر بہت اصرار کرتے تھے
ضمیر وقت نے ان کو حقارت سے مٹا ڈالا

تمہارا بھی یہی مقسوم ہے تم یہ نہ سمجھو گے
جو تم سے پہلے آئے تھے
انہیں بھی خوش گمانی کا نشہ مدہوش رکھتا تھا
تمہیں بھی خوش گمانی ہے
یہی اس ظالمانہ کھیل کا انجام ہونا ہے
تمہیں بھی ذلتوں رسوائیوں کا رزق بننا ہے

بے چارے توتے!

O

احفاظ الرحمان

ستارے بجھ گئے سارے
زمیں کی گود خالی ہے
وہ قد آور نہیں ہم میں
جو ہر خود ساختہ آقا کو
آئینہ دکھاتے تھے
نحیف و ناتواں، مظلوم قوموں کے لیے
آواز اٹھاتے تھے
نہ ماؤ ہے، نہ چواین لائی، ناصر ہے، نہ سوکارنو
نہ بومدین، نہ بن بیلا، نہ نائریرے، نہ لومبا
نہ آلندے رہا کوئی، مصدق ہے، نہ نکروما

بساطِ ارض پر اب دست بستہ، با ادب توتوں کا قبضہ ہے
یہ اک دن سو کے اٹھے تو انہیں آقا نے للکارا
(وہ آقا، جس کا دامن خونِ ناحق سے ہے آلودہ)
''ہمیں دہشت سے نفرت ہے
جہاں میں امن قائم ہو، ہماری یہ تمنا ہے،
ہمارا ساتھ دو، ورنہ......''
یہ سن کر سارے توتے تھرتھراتے، کانپتے قدموں سے

سڑکوں پر نکل آئے
جو آقا نے سکھایا تھا' وہی وردِ زباں ٹھیرا'
''ہمیں دہشت سے نفرت ہے
ہمارے جسم و جاں' آقا' تمہاری آن پر قرباں!''
جو آقا کے دلائل ہیں' وہی ان کے دلائل ہیں

یہ توتے ہیں' انہیں رٹنا لگانا خوب آتا ہے
لبوں پر اک سوال بے ریا ان کے نہیں آتا
وگرنہ عرض کرتے اپنے اس ''ذی شان'' آقا سے
تمہارے ہاتھ تو خود خون سے رنگین ہیں اب بھی
زمیں کے گوشے گوشے پر
تمہاری دست اندازی کے چرچے ہیں
تمہارا امن اور انصاف کا نعرہ بھی جھوٹا ہے
تمہاری بالا دستی کے لیے تازہ بہانہ ہے

مگر توتے تو توتے ہیں
یہ سب معذور اور مفلوج توتے ہیں
یہ توتے ہیں' انہیں رٹا لگانا خوب آتا ہے

☆

فرشتہ امن کا آیا

O

احفاظ الرحمان

فرشتہ امن کا آیا
یہ کہتے ہو، تمہیں غم ہے
یہ دہشت گرد غارت گر
تمہارے صاف اجلے آسماں کو
اپنے خوں آلود ہاتھوں سے مکدر کر رہے ہیں
تمہارے نرم دل پر کرب کی تانیں سلگتی ہیں
سسکتی ہیں
تمہاری دردمندی خون کے آنسو رلاتی ہے
تمہیں بے خواب رکھتی ہے
تمہیں پھولوں سے الفت ہے
تمہیں بلبل کے نغموں سے محبت ہے
تمہاری آرزو تھی، دہشتوں سے جان چھٹ جائے
فرشتہ امن کا آجائے تو دل شاد ہو جائے
تمہارا آسماں گل زار، گوہر بار ہو جائے
اٹھو، دیکھو، مبارک ہو، مرادیں دل کی بر آئیں
فرشتہ امن کا آیا،
جسے تم دیکھنے کی چاہ میں بے چین تھے اب تک
تمہارا دل ربا، دل دار کتنا خوب صورت ہے
یہ کتنا خوب صورت، خوب سیرت، خوب طینت ہے
لہو آلود لب، خوں خوار جبڑے، شعلہ بار آنکھیں

گلے میں کھوپڑی کا ہار' سر پر سینگ نوکیلے
مبارک ہو' چلو اٹھو' حسیں چہرے کو بوسہ دو
تمہارا آسماں گل زار گوہر بار ہو جائے
تمہاری بے سکوں آنکھوں کو اذن خواب مل جائے

ایک پیغام زبوں حال زمیں زاد کے نام

O

احفاظ الرحمان

نطق خاموش' جنوں خوابیدہ
شوخی لوح و قلم خوابیدہ
جامِ پندار گرفتہ کا فسوں خوابیدہ

زور آور کی غضب ناک صدا گونجتی ہے
(ایک پیغام زبوں حال زمیں زاد کے نام)
آسمانوں سے تری خاک پہ لمحہ لمحہ
غیظ کی آتش خوں خوار کی بارش ہو گی
طاعت و عجز کی دولت ہی تری مونس ہے

آب رو چاک گریباں کی سر رسوائی
دانہ و دام کی چاہت میں چمن آشفتہ
مصلحت کوش زمانے کی ہوا دست دراز
صید افگن کی کماں چست' قضا پابہ رکاب
دست بستہ مرا ساقی' مری مینا' مرا جام

دہشت گرد امریکا

O

احفاظ الرحمان

ناگا ساکی کو کس قاتل نے شمشان بنایا
ویت نام سے فلسطین تک کس نے خون بہایا
کون درندہ، کون لٹیرا، کون اٹھائی گیرا

امریکا، امریکا
دہشت گرد امریکا

دنیا بھر میں ہتھیاروں کا جنگل کون اگائے
دھرتی کے کونے کونے پر کس نے گھاؤ لگائے
دہشت، وحشت، ظلم، جبر کا سکہ کون چلائے
کون ہے کائر، کون ہے بزدل، کون خدا بن بیٹھا

امریکا، امریکا
دہشت گرد امریکا!

کون ہے جو کہتا ہے میں برتر ہوں، تم ہو کم تر
کون ہے جو کہتا ہے، میں داتا ہوں، تم ہو گداگر
سستا خون تمہارا ہے اور مہنگا خون ہمارا

امریکا، امریکا
دہشت گرد امریکا

☆

Why, do they hate us?

میں تو سب سے محبت کرتا ہوں!

احفاظ الرحمان

میں محبت کرتا ہوں
زمین پر اگنے والے کومل پودوں سے
آسمان میں اڑنے والے معصوم پرندوں سے
پانی میں رقص کرتی خوش رنگ مچھلیوں سے
ساری دنیا کے امن پسند انسانوں سے

ننھا جمی اپنے لان میں ایک تتلی کے پیچھے دوڑتا ہے، ڈگمگاتا ہوا، لڑکھڑا کر نیچے گر جاتا ہے۔ جب اٹھتا ہے تو تتلی کہیں نظر نہیں آتی۔ وہ آنکھیں ملتا ہے اور منہ بسورنے لگتا ہے۔ ماں اپنی کتاب نیچے رکھ کر اس کی طرف دیکھتی ہے۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا واپس آتا ہے اور ماں کے سینے سے چمٹ جاتا ہے۔ ماں اس کے نرم گالوں پر بوسہ دیتی ہے۔ جمی مسکرانے لگتا ہے۔

میں جمی کی بچی مسکراہٹ سے محبت کرتا ہوں۔ جمی فلوریڈا (امریکا) میں رہتا ہے۔

مائی لائی (ویت نام) کا ننھا تھان اپنی ماں سے پوچھتا ہے،
"ماں، میرے نانا کیوں نہیں ہیں؟"
وہ چونک کر اس کی طرف دیکھتی ہے "تمہارے نانا آسمان پر ہیں۔"

تھان حیرانی سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔

ماں اسے کیسے بتائے مائی لائی میں جنونی امریکی فوجیوں نے معصوم کسانوں کا قتل عام کیا تھا۔ اس کا باپ مقتولین میں شامل تھا۔

تھان پلٹ کر ماں کی طرف دیکھتا ہے۔

ماں جلدی سے اپنے آنسو پونچھنے لگتی ہے۔ تھان اپنے ننھے منے ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیتا ہے اور خود بھی سسکیاں بھرنے لگتا ہے۔

میں تھان اور اس کی ماں کی آنکھوں میں لرزتے آنسوؤں سے محبت کرتا ہوں۔

''بلادی! بلادی!''

دس سالہ ننھا خالد سرخی سے تمتماتے چہرے کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا ہے۔

''خالد طعام طعام!'' ماں پکارتی ہے۔

''بھوک نہیں ہے۔'' وہ اپنی چھوٹی سی غلیل اٹھا کر بھاگ جاتا ہے۔

باہر بڑے لڑکے صیہونی فوجیوں کی طرف پتھر پھینک رہے ہیں۔

خالد گھٹنے کے بل بیٹھ کر نشانہ لیتا ہے۔ غلیل کا پتھر دس گز سے زیادہ دور نہیں جاتا۔

''آنسو گیس!'' ایک بڑا لڑکا ننھے خالد کو بچانے کے لیے اس کی طرف لپکتا ہے۔

شیل خالد کے سینے پر لگتا ہے۔ اس کا جسم اچھل کر دور جا گرتا ہے اور اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے ساکت ہو جاتی ہیں۔

میں ننھے خالد کی خون آلود غلیل سے محبت کرتا ہوں!

پتھریلے راستے پر نحیف و لاغر گدھا ایک ٹوٹے پھوٹے چھکڑے کو گھسیٹتا ہوا جا رہا ہے۔ چھکڑے پر سوار ننھی پلوشہ آگ اگلتے سورج کی طرف دیکھتی ہے اور آنکھیں مچکاتے ہوئے کہتی ہے ''ماں، ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''پاکستان!'' ماں اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیتی ہے۔ باپ جو آگے بیٹھا چھکڑا چلا رہا ہے پلٹ کر اس کی طرف دیکھتا ہے اور ایک سرد آہ کھینچتے ہوئے لگام ساتھ بیٹھے اپنے بیٹے کو تھما دیتا ہے۔

''ماں، ہم وہاں کیوں جا رہے ہیں؟'' پلوشہ پوچھتی ہے۔

''تو نہیں سمجھے گی امریکی فوجی حملہ کرنے آ رہے ہیں۔''

''ماں، وہاں تازہ نان ملیں گے؟'' پلوشہ سر اٹھا کر بڑے اشتیاق سے ماں کی طرف دیکھتی ہے۔

ماں اثبات میں سر ہلاتی ہے اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتی ہے۔

خود اس کے ذہن میں بے شمار سوالات ابھرتے ہیں۔ اسے تو آج تک اس سوال کا جواب نہیں ملا کہ مرد لوگ عورتوں پر اتنی سخت پابندیاں کیوں عائد کرتے ہیں ..... وہ تنگ و تاریک برقع کیوں پہنتی ہے' جس میں سانس لینا بھی دوبھر ہوتا ہے۔ وہ کھلی آنکھوں سے کھلے آسمان کو دیکھنا چاہتی ہے۔ یہ اس کا خواب ہے۔

اسے یاد ہے' اس نے پہلی ہجرت 25 سال پہلے کی تھی' جب وہ پلوشہ جتنی تھی۔ پشاور سے دور افتادہ مضافات میں ان کی بستی تھی۔ اس کا باپ روزانہ مزدوری کرنے پشاور جاتا تھا۔ اکثر کام نہیں ملتا تھا اور انہیں فاقہ کرنا پڑتا تھا۔ اس کا بھائی بڑی سڑک پر کھڑا ہو کر بھیک مانگنے لگا۔ چند سال بعد وہ واپس جلال آباد چلے گئے کہ شاید اب وہاں سکون سے زندگی بسر کرنے کا موقع مل سکے۔ لیکن خانہ جنگی نے بستیوں کو اور ویران کر دیا۔ اور اب امریکی فوجی آ رہے ہیں۔ اس بار بموں کی بارش سے کوئی محفوظ نہیں رہے گا

ننھی پلوشہ سو چکی ہے۔ ماں برقعے کے دامن سے اس کا منہ کا پسینہ پونچھتی ہے۔ پلوشہ کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

''ماں!'' وہ آنکھیں ملتے ہوئے کہتی ہے' ''میں خواب دیکھ رہی تھی۔ میں ایک جنگل میں گھوم رہی تھی۔ ایک جگہ ڈھیر سارے گرما گرم نان رکھے ہوئے تھے۔ میں ایک نان اٹھا کر کھانے لگی' پھر مجھے تمہارا' بابا کا اور بھائی کا خیال آیا۔ میری بھوک اڑ گئی۔ میں نے بہت سارے نان اپنی قمیص کے دامن میں بھر لیے اور وہاں سے بھاگ آئی۔''

''نان کہاں ہیں؟'' ماں ہنس کر پوچھتی ہے۔

''مجھے ایک پتھر سے ٹھوکر لگی اور سارے نان ایک گہرے کھڈ میں گر گئے۔''

میں پلوشہ اور اس کی ماں کے خوابوں سے محبت کرتا ہوں۔

میں محبت کرتا ہوں'
ابراہام لنکن اور مارٹن لوتھر کنگ سے'
اونیل' ہیمنگوے' نوم چومسکی اور ان جیسے تمام امریکی ادیبوں اور دانش وروں سے' جن کی آنکھوں

میں ہر غم زدہ انسان کے لئے آنسو جھلکتے ہیں۔

سامراجی ذہنیت، گلوبلائزیشن، ڈبلیو ٹی او کی پالیسیوں اور جنگ کے خلاف غریب ملکوں کے حق میں مظاہرے کرنے والے تمام دردمند امریکیوں سے

انسانی مسائل پر دل گداز فلمیں بنانے والے تمام امریکی فلم سازوں سے

ان تمام امریکی سائنس دانوں سے، جو انسان کو خوف ناک بیماریوں سے بچانے کے لئے دن رات ریسرچ میں مصروف ہیں

ان تمام امریکیوں سے، جو دوسروں کو ان کی خوشیوں سے محروم کر کے اپنے دامن میں خوشیاں بھرنے کی تمنا نہیں رکھتے

میں نفرت کرتا ہوں

امریکا کی زمین پر تیار ہونے والے خوفناک ہتھیاروں سے

دنیا کے آسمان پر اڑنے والے تباہ کن امریکی طیاروں سے

دنیا کے سمندروں میں گشت کرنے والے مہیب امریکی بحری بیڑوں سے

پینٹاگون سے جو دنیا بھر میں ہتھیار پھیلاتا ہے

میں نفرت کرتا ہوں

میکارتھی اور کیسنجر سے

جانسن، ریگن، کلنٹن، بش سینئر اور بش جونیئر جیسے تمام امریکی سیاست دانوں سے، جو دنیا پر اپنی دہشت بٹھانے کے لیے دنیا کے گوشے گوشے میں گولا بارود کی فصلیں اگاتے ہیں۔

امریکا کے ان تمام جنگ بازلیڈروں سے، جو دنیا پر اپنی بالادستی قائم کرنے اور اپنی رعونت اور نخوت کے جھنڈے بلند کرنے کے لیے ظلم کو پروان چڑھاتے ہیں، دنیا بھر میں اپنے فوجی اڈے قائم کرتے ہیں، دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے ہیں اور لاکھوں معصوم لوگوں کو قتل کرتے ہیں۔

میں سب سے محبت کرنا چاہتا ہوں، لیکن کچھ لوگ میری اس آرزو کو پورا نہیں ہونے دیتے۔

٭

جمیل الدین عالی: دھنک کے تین رنگ

پروفیسر فتح محمد ملک

جمیل الدین عالی کی شاعری تین خوشنما رنگوں کی ایک دھنک ہے۔ قومی' ملی اور آفاقی رنگوں کے اس دلفریب امتزاج کو میں نے اپنی سہولت کی خاطر جدا جدا رنگوں میں پہچاننے کی کوشش کی ہے ورنہ اس خوبصورت دھنک کے تشکیلی اور ارتقائی مراحل کو یوں دو اور دو چار کی طرح الگ الگ کر کے دکھانا دشوار ہے۔ عنفوان شباب کے مشاہدات اور تجربات سے پیدا ہونے والے آفاقی انسانی جذبات کو ''غزلیں دوہے گیت'' کے قالب میں ڈھالنے کا زمانہ رومانی اور جذباتی رنج و راحت میں اسیری کا زمانہ ہے۔ یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ نرناری کے جبلی طلسم ہوشربا کے سحر میں مبتلا جمیل الدین عالی اپنی مشق سخن کے زمانے میں بھی سرِ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں:

سرِ حقیقت ہاتھ نہ آیا بھول گئے افسانے بھی

فنی تکمیل اور فکری پختگی کے بیشتر مراحل طے کر لینے کے بعد آج جب وہ خیر وشر کے سے ازلی و ابدی موضوع پر آفاقی انسانی تناظر میں اپنی عالم گیر سوچ اور اپنے آفاقی محسوسات کو نظم ''چھپکلی کا دماغ'' کی صورت بخشتے ہیں تو بھی ان کی اس نظم کا فوری محرک مقامی تجربات اور مشاہدات ہی ٹھہرتے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اس نظم کا نفسیاتی تجزیہ کرتے وقت اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ :

> ''اس نظم کے کئی پرت ہیں۔ نظم کا محرک' بربریت' غارت گری اور دہشت کا منظر نامہ ہے جو خود آدمی کا پیدا کردہ ہے۔ بے شک یہ احساس کہ آدمی فطرتاً جنگ جو' دہشت گرد اور خون خوار ہے اس نظم کے شاعر کے ہاں لاشعوری سطح پر موجود تھا مگر میرا خیال ہے کہ اس نظم کا فوری محرک کوئی قریبی واقعہ ہے' ایک ایسا واقعہ جس میں خون بہانے کی قدیم رسم کی تجدید ہوئی ہے۔ یہ واقعہ بوسنیا کے قتل عام کا بھی ہو سکتا ہے یا پھر کراچی میں دہشت گردوں اور کشمیر میں بھارتی فوجوں کے مظالم کا بھی تاہم شاعر کو جلد ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ سارے واقعات دراصل بربریت اور خون خواری کے قدیم سمندر کی موجیں ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر شاعر جاننا چاہتا ہے کہ بربریت کا یہ سمندر کب سے ہے؟ اس کی نوعیت کیا

ہے؟ اور اس سے نجات پانے کا راستہ کیا ہے؟''

ان سوالات پر نظم ''چھپکلی کا دماغ'' کے حوالے سے غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ جمیل الدین عالی کے تخلیقی عمل کی کارگاہ میں ہنگامی اور دوامی' مقامی اور آفاقی عناصر بڑی خوبصورتی کے ساتھ شیر وشکر ہو جاتے ہیں۔ خود جمیل الدین عالی نے پاکستان اور خصوصاً کراچی میں رقص ابلیس کی عصری صورت حال کو اس نظم کا فوری محرک قرار دیا ہے:

ہے میرا آج کا موضوع چھپکلی کا دماغ
کہ مجھ کو آج میسر نہیں ہے اپنے ہی شہر وطن میں غارت و دہشت
آندھیوں سے فراغ
یہ جارحیت و سفلی مرکبات کا اک زندہ و عجیب قفس
یہ ظلم و جبر کی مسموم گرم گرم ہوا
یہ ملکیت کی ہوس
وہ کہتے ہیں کہ یہ ساری درندگی جو ہے انسان میں اسی سے ہے
کہ ارتقاء کے مدارج میں اک تعلق باہم بہت سے جانوروں کا بھی آدمی سے ہے

پاکستان میں دہشت گردی اور غارت گری کے واقعات نے شاعر کو آدمی کی سرشت میں کارفرما شیطنت کے ازلی اور ابدی سوالات پر تخلیقی انداز میں سوچنے کا حوصلہ بخشا تو یہ منفرد نظم وجود میں آئی۔ اسی طرح سن انیس سو پچاس میں شروع ہونے اور سن انیس سو پچانوے میں تکمیل کو پہنچنے والی نظم ''انسان'' خدا' کائنات' انسان اور ان کے باہمی ربط و تعلق کے موضوع پر انسانی فکر کے ارتقاء کی روشنی میں صدیوں صدیوں اٹھائے گئے پراسرار سوالات پر تخلیقی تجسس کی دین ہے مگر ان تمام ازلی و ابدی سوالات کو ایک خاص مرد جمالی اور ایک خاص عورت سیما کے وقتی المیہ نے جنم دیا ہے۔ محبوبہ کی اچانک موت کا سانحہ جمالی کو ان سوالات سے دوچار کر دیتا ہے۔ جمیل الدین عالی عمر بھر ان سوالات سے پنجہ آزماتے رہے ہیں۔ چنانچہ نظم ''انسان'' پھیلتی ہی چلی جارہی ہے۔ یہ نظم اپریل سن 1950ء میں شروع ہوئی تھی۔ سن 1996ء تک آتے آتے دس ہزار مصرعے ہو چکے ہیں۔ ان سوالات پر تخلیقی غور و فکر ہنوز جاری ہے۔ یہ احساس ناتمامی جمیل الدین عالی کے شعری اور فکری ارتقا کو ہمیشہ سے مہمیز دیتا چلا آیا ہے۔ آیئے آگے بڑھنے سے پہلے عالی کے فکر و فن کے تدریجی ارتقا پر ایک نظر ڈال لیں۔

(۲)

قیام پاکستان کی مبارک ساعت میں ہماری شاعری کے افق پر دو ایسے ستارے طلوع ہوئے تھے جن کی آب و تاب دلوں کو بہت لبھانے لگی تھی۔ ان سے وہ روشنی پھوٹ رہی تھی جو اس زمانے کی اردو شاعری کی

آنکھوں سے ایک مدت پیشتر رفت گزشت ہو چکی تھی۔ ترقی پسند اور جدید شاعر مانگے تانگے کے اجالے میں محوِ سفر تھے۔ ڈیڑھ صدی کی پیروئی مغربی کا ایک شاخسانہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنی تہذیبی روایات کو فرسودہ اور اپنے تخلیقی سانچوں کو از کار رفتہ سمجھنے لگے تھے ہمارا شاعر اپنی شعری روایت سے برآمد ہونے والے پیرایہ ہائے اظہار سے روگردانی اور اپنی تہذیبی روایات کے خلاف بغاوت کو ترقی پسندی اور جدیدیت کا لازمہ سمجھنے لگا تھا۔ ہر چند تحریک پاکستان تہذیبی سطح پر اپنی تہذیبی روایات اور اپنے گم شدہ فنی سانچوں کی بازیافت اور ارتقا کی تحریک تھی مگر ہمارا شاعر ترقی پسندی اور جدیدیت کے نام پر بھی ایک طرح کی مقلدانہ روش پر قائم تھا کیونکہ بقول اقبال:

تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

قومی تہذیب کا احیاء طلوعِ آزادی کا ناگزیر تقاضا ہے ہمارے شاعروں میں سے ناصر کاظمی اور جمیل الدین عالی نے اس تقاضے کو خوب سمجھا۔ اردو شاعری کے میدان میں ہر دو تازہ واردان نے ایک نئے طرزِ احساس کے ساتھ ہماری قدیم اور بڑی حد تک متروک اصنافِ شعری کو پھر سے رواج دینے کی ٹھانی۔ ناصر کاظمی نے اگر میر کے عہد تک پہنچتی اور میر کے ہاں نیا رنگ و آہنگ اختیار کرتی ہوئی غزل سے اپنے عہد کی غزل کو منسلک کر کے صنفِ غزل کو ایک نیا وقار بخشا تو جمیل الدین عالی نے دوہے اور گیت کی اصناف کو عصری تقاضوں کے مطابق از سرِ نو قبولِ عام بخشا۔ ناصر کاظمی کی ''برگ نے'' اور عالی کی ''غزلیں، دوہے، گیت'' گویا ایک نئی تخلیقی زرخیزی کا اسم بن کر سامنے آئی تھیں۔ اس تخلیقی زرخیزی سے اور تو اور خود یہ دو ایجادِ طبع فن کار پوری طرح فیض یاب نہ ہو سکے اس احساسِ نارسائی کو عالی نے اپنی ایک غزل میں یوں زبان بخشی ہے:

غزلوں میں سو رنگ ملا کر اپنا رنگ ابھارا تھا
استادوں کے سائے میں کچھ اپنی راہ بناتے تھے
گیتوں میں کچھ اور نہ ہو، اک کیفیت سی رہتی تھی
جب بھی مصرعے رقصاں ہوتے معنی ساز بجاتے تھے
دوہے کہنے اور پڑھنے کا ایسا ڈھنگ نکالا تھا
سننے والے سر دھنتے تھے اور پہروں پڑھواتے تھے
غزلیں دوہے گیت' کی شہرت ملک سے باہر پھیلی تھی
ہندوستان سے آنے والے تحفوں میں لے جاتے تھے
پھر دیکھا کہ بچہ بچہ ہنستا تھا اور عالی جی
فردیں لکھتے مسلیں پڑھتے بیٹھے ''گلڈ'' چلاتے تھے

فردیں لکھنے، مسلیں پڑھنے اور ''گلڈ'' چلانے کی فرصت ایک جذباتی المیہ نے فراہم کر دی تھی۔ اس المناک واردات کا عکس عالی کے درج ذیل ناقابلِ فراموش شعر میں جلوہ گر ہے:

کچھ نہ تھا یاد بجز کارِ محبت اک عمر
وہ جو بگڑا ہے تو اب کام کئی یاد آئے

یہ جو کئی کام ہیں ان میں پاکستان رائٹرز گلڈ' بیکنگ کونسل' اردو لغت بورڈ' اردو کالج' انجمن ترقی اردو سے لے کر ایوانِ بالا میں عوامی نمائندگی تک بہت کچھ شامل ہے۔ نہ تو یہ معمولی کام ہیں اور نہ ہی معمولی آدمی کے بس کا روگ ہیں۔ گلڈ میں رسالہ ''ہم قلم'' کی ادارت جس خوش اسلوبی کے ساتھ عالی نے سرانجام دی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ادبی مجلہ پاکستان میں پہلی بار پورے پاکستانی ادب کا عصری منظر پیش کرنے کی داغ بیل ڈالتا ہے۔ پاکستان کی تمام زبانوں کی تخلیقی سرگرمیوں کی آئینہ داری کے ساتھ ساتھ ''ہم قلم'' نے افریشیائی اور اسلامی ممالک کے ساتھ ہمارے رشتوں کی آبیاری کا فرض پورا کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔

خیر سے کارِ محبت کے بگڑنے کے بعد عالی کو جو علمی اور تخلیقی کام یاد آئے ان میں سے عالی کے سفر نامے' اظہاریے اور دیباچے قابلِ غور ہیں۔ پروفیسر عبدالعزیز ساحر نے ایک منفرد شاعر کی رواروی میں لکھی گئی اس نثر کو اپنے تحقیقی مقالہ کا موضوع بنایا ہے۔ انہوں نے عالی صاحب کی مرقع نگاری' اظہاریہ نویسی اور سفر نامہ نگاری کی تحسین کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں پاکستانیت ان تحریروں کا جوہرِ خاص ہے جس کا سرچشمہ عالی صاحب کا قلم نہیں دل ہے:

''بیگانے اور اجنبی ماحول میں وطن کی باس ان کے مشامِ جاں کو معطر کرتی ہے۔ پاکستان ان کی پہچان ہے اور پاکستان کی شناخت صداقت کا مظہر ہے یہ سچائی ان آفاقی قدروں سے ترتیب پاتی ہے جو محمدؐ عربی کے ارفع و اعلیٰ پیغامات سے عبارت ہیں' عالی کے سفر ناموں میں وہ حصے بطورِ خاص دیکھنے کے لائق ہیں جن میں وطن کی خوشبو کا جذب و کیف جھلکارے لیتا ہے۔''

پاکستانیت اور اسلامیت کی صورت گر قدروں سے عالی کی یہی وابستگی ان کی شاعری کی منفرد پہچان ہے۔ نظمیں اور غزلیں تو رہیں ایک طرف عالی نے دوہے کی قدیم صنفِ اظہار کے روایتی اور رسمی مضامین کی جگالی کرتے رہنے کی بجائے دوہے کے موضوعات کو وسعت دی اور ...... ع نرناری کی باتیں چھوڑو' یہ باتیں ہیں پرانی...... کہہ کر قومی و ملی موضوعات کو دوہے کے مقبول عام موضوعات بنا دیا۔ 23 مارچ 1967ء کو شاید یوم پاکستان کی نسبت سے انہوں نے درج ذیل سوال اٹھائے:

عالی تو نے اتنے برس اس دیس کی روٹی کھائی
یہ تو بتا تری کوتاہی دیس کے کس کام آئی؟
کیا نہیں بھاتی آنکھ کو تیری دکھ کی کوئی تصویر
تیری غزل کے مضمونوں سے دور ہے کیوں کشمیر؟
لوہے جیسے تن اور من سب بنتے جائیں راکھ

اور تم پتھر بن کر چاہو پارس جیسی ساکھ؟
چھایا مانگے اور پھل مانگے پنچھی سا مزدور
عالی تری کوتا ایسی جیسے پیڑ کھجور؟

بظاہر یہ سوالات عالی نے اپنے آپ سے پوچھے مگر فی الحقیقت یہ سوالات عالی کے ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں سے کیے گئے ہیں۔ جس زمانے میں یہ سوالات اٹھائے گئے وہ زمانہ پاکستانی ادیبوں میں قومی مسائل سے لاتعلقی کا زمانہ تھا۔ چنانچہ عالی کے معاصرین نے خود اکتسابی کی راہ اپنانے کی بجائے دشنام طرازی کے چلن کو اپنایا:

عالی اپنے دیس کی لکھیں اور ٹوڈی کہلائیں
سورما لوگ بدیسی پیسے کھائیں اور اترائیں
پیسے کھانے کی ترکیبیں نقد وظیفہ سیر
اب جو کوئی جس کا کھائے مانگے اسی کی خیر
کوئی کھل کر جاپان گھمائے اور کوئی چھپ کر چین
کہیں بدیسی ڈفلی باجے کہیں بدیسی بین
پی ای این کے پوجن ہارے جگ کی سیر کو جائیں
عالی دیکھی سبھا جما کر اپنی ہنسی اڑوائیں

درج بالا شعر میں پی ای این سے مراد امریکی سی آئی اے کے پیسے سے چلنے والی پوئٹس ایسے اسٹس اینڈ ناولسٹ نامی انجمن ہے۔ سن پچاس کی دہائی میں اس انجمن کی بہت دھوم تھی۔ اس انجمن سے وابستہ مغرب نواز ادیب ہوں یا ان کے حریف اشتراکیت پسند انقلابی ادیب ہوں ہر دو گروہوں کا فن قومی اور ملی انداز نظر سے نا آشنا تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک ادیب کا مسلک قومیت کی تعمیر کی بجائے عالمگیریت کا فروغ ہے۔ یوں تو قومیت اور عالمگیریت میں کوئی تضاد نہیں مگر ان لوگوں کے دل میں یہ بات سما گئی تھی کہ عالمی اور آفاقی ادب کی تخلیق کی خاطر مقامی اور قومی مسائل سے چشم پوشی لازم ہے۔ چنانچہ جمیل الدین عالی کی قومی وابستگی کو وہ شک سے دیکھتے تھے۔ یہ لوگ عالی کی پاکستانیت پر سرکاریت کی پھبتی کس کر انہیں ٹوڈی کہتے ہوئے یہ نہ سوچتے تھے کہ عالی تو اپنی قوم اور اپنے پاکستان کے ترانے الاپ رہے ہیں جبکہ وہ خود بیشتر اوقات بین الاقوامی استعماری قوتوں کے ادبی آلہ کار کا کردار سرانجام دینے میں مصروف رہتے ہیں۔

جمیل الدین عالی اس طرح کے الزامات کو کبھی خاطر میں نہ لائے اور اپنی دھن میں پاکستان سے اپنے عشق کا حق ادا کرنے میں مصروف رہے۔ پاکستان کے اندر ایک عادلانہ انسانی معاشرے کی تشکیل و تعمیر ان کی شاعری کا ایک اہم موضوع ہے۔ "پاکستان کتھا" کے زیر عنوان انہوں نے دوہوں میں مروجہ استحصالی نظام کا نقشہ

یوں کھینچا ہے:

سوکھے جسم اور بھوکی روحیں مانگے جن کی لاکھ
کیا کیا ہیرے کیا کیا موتی بنتے جائیں راکھ
کتنی ہیریں کتنے رانجھے اک دوجے سے دور
یہ کیوں سمجھیں یہ کیوں جانیں کون ہے کیوں مجبور

....

آج بھی ہاری کھیت کو ترسے کاریگر بے کار
آج بھی بچے ان پڑھ گھر میں اور مائیں بیزار

....

تیں روپے میں بیس ہیں اس کے دس لیوے دلال
اتنا مہنگا شہر اور اس میں ایسا ستا مال

....

عالی کی باتیں مت سننا گھاتیں اس کی لاکھ
بات کرے اقبال کی لیکن اپنی بڑھائے ساکھ
جب بھی گیت خودی کے گائے بیچے ساتھ ضمیر
اپنے لیے آزادی چاہے سب کے لیے زنجیر

جمیل الدین عالی نے اپنے دوہوں میں پاکستان کی جو کتھا لکھ ڈالی ہے اسے غور سے پڑھیں تو پاکستان میں قومی جذبات کے زوال اور نتیجتاً پاکستانی قومیت کے عدم استحکام کے ذمہ دار افراد اور اداروں کے اعمال یا بدعملی یا بےعملی کی تصویر نگاہوں کے سامنے رقص کرنے لگتی ہے۔ بتاتے ہیں:

دیس کو گورے چھوڑ گئے پر چھوڑ گئے اک پھوڑا
اس پھوڑے نے رس رس کر نس نس سے ناطہ جوڑا
اس پھوڑے کا نام تھا افسر ذات تھی نوکر شاہی
نوکر شاہی ذات پرانی اس نے سب سے باہی

....

افسر بولے یارو ہم کو بھائے نہیں اقبال
یہ بولیں جی شبد کا دھوکا دھیان کا خالی جال
افسر بولے فیض نراجی یہ بولیں غدار

افسر بولے اپنی اکھڑ یہ بولیں مکار
افسر بولے کوئی عالی کو چپ رہنا سکھلاؤ
یہ بولیں جی چپ نہ رہے تو ملک بدر کرواؤ

یہ ہماری خوش بختی ہے کہ عالی کو نہ تو چپ کرایا جا سکا اور نہ ہی ملک بدر۔ چنانچہ وہ اپنے مجاہدۂ فن کے دوران تنقید حیات کا حق ادا کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک نظم ''تلاش'' میں خود کو سکینڈی نیوین کہانی کے اس بچے سے مشابہ قرار دیا ہے جس نے بھرے دربار میں بادشاہ سے کہہ دیا تھا کہ حضور آپ آج ننگے ہی چلے آئے ہیں:

ذری اور سہمی مگر پھر بھی جاری یہ آواز دل چیرتی ہے
ہمارے وطن میں بھی ہوگا
ہمارے وطن میں بھی ہوگا
میں درباریوں میں تو کیا نوکروں کے جلو میں بہت دور تھا
لباسِ شہی کا مدح خواں تو اب بھی نہیں
اشاروں کنایوں
علامات سے یا خرافات سے
کچھ نہ کچھ نظم میں کچھ نہ کچھ نثر میں بڑبڑاتا رہا ہوں
مگر اس بھی یاں کا یہ افسانہ سب کو سناتا رہا ہوں
وہ غالب نہ ہو اور جالب رہے پھر بھی ایسا ہی بچہ
ہمارے وطن میں بھی ہے
اور رہے گا

اوپر دیئے گئے بند میں غالب اور جالب ہم قافیہ ہونے کی وجہ سے ایک ساتھ نہیں آئے بلکہ ہماری قومی زندگی میں حبیب جالب کے انقلابی کردار کو محبت بھری تحسین سخن شناس اور جرات انگیز تائید حق شناس کے طور پر لائے گئے ہیں۔ اپنی نظم ''حبیب جالب'' میں عالی نے حبیب جالب کے تاریخی کردار کو اجاگر کرنے کے لئے ان ارباب احتجاج کا بطور خاص ذکر کیا ہے جو کڑا وقت آنے پر خود اختیار کردہ جلا وطنی کو بہلانے کی خاطر ''مشاعروں کی ذریعے انقلاب لانے'' میں مصروف ہو گئے تھے۔ حبیب جالب کا چلن ان ''ارباب انقلاب'' کے برعکس جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کی ادائیگی سے عبارت تھا:

جب آئے وقت تو وہ شیر کی طرح گرجا
کہا کہ راجہ تجھے مانتی نہیں پرجا

اگرچہ اس کے لے بھی بچھا ہوا تھا وہی فرش صد ہزار انعام
نشستہ جس پہ تھے آرام سے بڑے کئی نام
مگر وہ اپنی صداقت میں اپنے پرچم کو اٹھا روانہ ہوا
بہت سی مصلحتوں نے کہا دوانہ ہوا
ایک ایسے وقت میں جب ایک فضائے عام بنی تھی چلو کمانے چلو
کہا کہ تھانے چلو ورنہ لاڑکانے چلو
جب آئے وقت سر عام درے پڑتے تھے
تو اس کے منہ سے دیکھتے یہ پھول جھڑتے تھے
''وہ کہہ رہے ہیں محبت نہیں وطن سے مجھے
سکھا رہے ہیں محبت مشین گن سے مجھے''

یہ گہری، سچی اور کھری پاکستانیت ریڈیو اور ٹی وی کے ترانوں میں کہاں ملے گی؟ اگر کہیں ملے گی بھی تو معرکۂ ستمبر کے ترانوں اور گیتوں میں ملے گی۔ بھارت نے بغیر اعلان کے پاکستان پر حملہ کیا تو ہمارے شاعر کے خون میں رچی ہوئی اقبال کی شاعری نے جوش مارا۔ ان چند دنوں کے دوران نہایت عمدہ، بے حد اثر انگیز اور سچے اور بے لوث جذبات سے لبریز نغمات تخلیق کیے گئے۔ جمیل الدین عالی نے بھی اس محاذ پر داد شجاعت دی۔ اعلان تاشقند میں اس محاذ کو آن کی آن یوں ٹھنڈا کیا کہ ہمارے ذرائع ابلاغ نے اس ڈائریکٹو کے تحت دشمن کو ''ہمسایہ ماں جایا'' کے القاب و آداب کے ساتھ یاد فرمانے لگے جو مرحوم الطاف گوہر نے تاشقند سے جاری فرمایا تھا۔ اگر کسی شاعر نے اس فرمان کی پروا نہ کی اور اسی جوش و جذبے کے ساتھ پاکستان کی حمد و ثنا میں نغمہ زن رہا تو وہ جمیل الدین عالی ہیں۔ عالی نے حیرت انگیز تسلسل اور تواتر کے ساتھ پاکستانیت کی تبلیغ میں شاعری کو ایک موثر وسیلہ اظہار بنایا۔ تب سے لے کر اب تک عالی دوہے گیت غزلیں نظمیں لکھ لکھ کر پاکستانیت کا بول بالا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے مقبول عام لوک دھنوں کو بڑی خوبی کے ساتھ آزمایا ہے' لوک گیتوں کا پیرایۂ اظہار اپنایا اور مقبول عام علاقائی اصناف اظہار مثلاً کافی اور وائی کو اردوایا ہے۔ سندھی لوک دھن میں ایک ''وائی'' کے چند بند ملاحظہ ہوں:

اتنے بڑے جیون ساگر میں
ساحل ابھرا بیچ بھنور میں
ایک نیا امکان دیا
تو نے پاکستان دیا
ہو اللہ ہو اللہ

اک دن ساری دنیا کہہ دے
تو نے اس دھرتی کے رستے
ایک نیا انسان دیا
تو نے پاکستان دیا
ہو اللہ ہو اللہ

شاہ لطیف سے برکت پائیں
علن اور عالی کی دعائیں
جن کو وطن نے مان دیا
تو نے پاکستان دیا
ہو اللہ ہو اللہ

پاکستا کے دولخت کر دیے جانے کے سانحہ نے عالی کی شاعری میں پاکستانیت کی لے کو تیز تر اور موثر تر کر دیا۔ ایک ایسے زمانے میں جب پاکستان کے ٹوٹنے پر لوگوں کے دلوں میں صف ماتم بچھی ہوئی تھی عالی کے ''جیوے جیوے پاکستان'' کے موضوع پر لکھے گئے ترانوں نے پوری قوم کو مایوسی کے گرداب سے نکال کر امید اور رجائیت کا پیغام دیا۔ تخریب کے ملبے پر بیٹھے ہوئے پاکستانیوں کو عالی کے ترانوں نے جذبۂ تعمیر سے سرشار کر دینے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ عالی نے دوسرے اداروں اور دوسرے افراد کو دوش دینے کے مروجہ چلن کو خیر باد کہتے ہوئے خود کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ اقبال کے حضور ان کا یہ اعتراف بڑا معنی خیز ہے:

ہاں میرے بابا' ہاں میرے مرشد میں تجھ پر قربان
تو نے بنایا' میں نے بگاڑا تیرا پاکستان

یہاں اس امر کی جانب اشارہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کہ اس شعر کا صیغۂ واحد متکلم ہر پاکستانی کے جذبات کا ترجمان ہے جو شخص بھی اس شعر کو پڑھتا ہے یہ اسی کی واردات بن جاتی ہے۔ اس سانحہ نے عالی کو پاکستانیت کا متحرک پیکر بنا دیا:

اب یہ اندازِ انجمن ہو گا
ہر زباں پر وطن وطن ہو گا
دشمنوں سے مقابلے کے لیے
تار فولاد پیرہن ہو گا
اے مری روح میرے پاکستان

تو ہی میری بقائے فن ہو گا

دوہے کی مقبول عام صنف اظہار سے عالی نے اپنے سیاسی پیغام کو مقبول خاص و عام بنانے کا کام لیا۔ جب ذوالفقار علی بھٹو ایوب آمریت اور یحییٰ شاہی کے خلاف شمشیر برہنہ بن کر نکلے تو پاکستان کے عوام ان کے ہر اشارے پر والہانہ انداز میں رقص کرنے لگے۔ ایک عوامی جمہوری تحریک نمودار ہوئی۔ انقلاب کے ترانے گلی کوچوں میں گونجنے لگے۔ عالی کے ہاں بھی انقلابی آرزومندی لہر در لہر جلوہ گر ہوئی:

او دیوار پرانی ہٹ جا تیز ہے جنتا دھار
اب تیری بنسی نہیں بجے گی چلے گی اب تلوار

یہ تو رہی دوہے کے پیرائے میں بغاوت کی للکار۔ اب دیکھیے نظم کی صورت میں انقلاب کی پکار:

زنگ خوردہ اک کردار
انتشار کی دیوار
آخری رکاوٹ ہے
یہ بھی ٹوٹ جائے گی
انقلاب آئے گا
ڈوب جانے والی ہے
دولتیں امیروں کی
طاقتیں وزیروں کی
ان پہ چھانے والی ہیں
مستیاں فقیروں کی
انقلاب آئے گا

بھٹو صاحب اقتدار میں آئے مگر صد حیف کہ انقلاب نہ آیا۔ چنانچہ رجائیت کی یہ لے رفتہ رفتہ قنوطیت کا رنگ پکڑنے لگی۔ ایسے میں مایوسی دلوں میں گھر کرنے لگی۔ جمیل الدین عالی حکمران طبقے سے تو ضرور گلہ مند ہوئے مگر پاکستان کے مستقبل سے کبھی ناامید نہیں ہوئے۔ ہمارے ہاں پاکستانیت کے فروغ اور استحکام کے سلسلے میں جمیل الدین عالی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ پاکستان کا تصور اور پاکستان کی حقیقت جمیل الدین عالی کی شاعری کے مرکزی موضوعات میں سے ایک دل پسند موضوع ہے۔ اسی طرح عالی نے گیت کی روحانی جذباتیت کو نظریاتی استقامت کے ساتھ یوں شیر و شکر کر دیا ہے کہ یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ''جیوے جیوے پاکستان'' گیت ہے، ترانہ ہے یا پیمان جنون ہے۔

جمیل الدین عالی پاکستان کے پہلے شاعر ہیں جنھوں نے پاکستان کو بطور موضوع سخن سوچا، چاہا اور پیش

کیا ہے۔ پاکستان عالی کی شاعری کا اہم ترین موضوع ہے۔ پاکستانی زندگی کے بھیانک سے بھیانک حقائق بھی ان سے پاکستان کے تصور کی صداقت پر یقین' تحریک پاکستان سے محبت اور پاکستان کے اندر تصور پاکستان کو زندہ اور متحرک حقیقت میں بدلنے کا جذبہ نہ چھین سکے۔ پاکستانیت' اسلامیت اور عالمگیریت کے باہمی ربط و تعلق کو بھی وہ ہمیشہ اپنے پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس وقت مجھے ''ہم قلم'' کا جنوری 1961ء کا شمارہ یاد آ رہا ہے جو الجزائر کی تحریک آزادی کے لئے وقف کر دیا گیا تھا' خود عالی نے اپنے دوہوں میں ''الجزائر کو سلام'' پیش کیا ہے۔ یہ دوہے صداقت احساس اور رزمیہ آہنگ میں ایک منفرد تخلیقی شان رکھتے ہیں:

بے کس بے ہتھیار کلا نے بھیجا ہے پیغام
جو نہ لکھے الجیریا بانی اس پر شعر حرام
جگ کے دریا روئیں تو عالی چپ بیٹھا شرمائے
چپ بیٹھا شرمائے کہ عالی حلوہ روٹی کھائے
حلوہ روٹی کھا مرے پیارے پی شمپین کے جام
تو جس دیس کا راگ الاپے وہاں ترا کیا کام
بان چلیں اور پیرس رانی سہمی سہمی جائے
پیرس رانی ڈری تو پنڈت یو این بھی گھبرائے
یو این جی کا جنتر منتر دھن اور گیان اور دھیان
آج نہیں تو کل دیکھیں گے سے بڑا بلوان

صدیوں پہلے جب حضرت فریدالدین مسعود گنج شکرؒ نے دوہے کو صوفیانہ تفکر اور لوک دانش کی ترسیل کا ذریعہ بنایا تھا اس وقت کون سوچ سکتا تھا کہ سات سو سال بعد یہی صنف اظہار ایک آتشیں سیاسی پیغام کی موثر ترجمان بن جائے گی عالی کے یہ دوہے ایک ہنگامی اور وقتی صورت حال کا ردعمل بن کر وجود میں آئے تھے مگر تخلیقی عمل کی کرشمہ سازی دیکھئے کہ ''الجزائر کو سلام'' کے دوہے الجزائر کی آج کی صورت حال کے حقیقت افروز ترجمان ہیں۔ میں جب بھی الجزائر کے آج کے مصائب سے اپنی اور اپنے ہم وطنوں کی بے حسی اور لاتعلقی کا خیال کرتا ہوں تو یہ مصرع بے ساختہ ذہن میں گونجنے لگتا ہے:

جو نہ لکھے الجیریا بانی اس پر شعر حرام

لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے دوران عالی کے جس ترانہ نے اپنی موسیقیت اور نغمگی سے دنیائے اسلام میں بولی جانے والی ان گنت زبانوں کی حدود سے اوپر اٹھ کر سب سے کلام کیا اس کے صرف پہلے بند پر غور فرمائیے:

ہم تابہ ابد سعی و تغیر کے ولی ہیں

ہم مصطفویؐ ، مصطفویؐ ، مصطفویؐ ہیں
دین ہمارا دین مکمل
استعمار ہے باطل ارزل
خیر ہے جدوجہد مسلسل
عنداللہ.........عنداللہ
اللہ اکبر ، اللہ اکبر۔ اللہ اکبر ، اللہ اکبر

عالی کے نزدیک ہماری دینی عصبیت کا ناگزیر تقاضا یہ ہے کہ ہم استعمار کے خلاف مسلسل جدوجہد جاری رکھیں اور دنیائے انسانیت کو استعماری طاقتوں کے چنگل سے آزاد کرا کر روئے زمین پر توحید کا بول بالا کریں۔ عالی کی مشکل یہ ہے کہ مسلمان ملکوں کے حکمران طبقے استعماری طاقتوں کی چاکری پر نازاں ہیں۔ وہ کہنے کو توحید پرست ہیں مگر فی الواقع ان استعماری طاقتوں کو اپنا حامی و ناصر اور آقا و مولا تسلیم کرتے ہیں۔ یہی استعماری طاقتیں ان کی خاندانی بادشاہتوں یا ان کے جمہوری تماشوں کی محافظ ہیں۔ اس وقت قریب قریب ساری دنیائے اسلام ان ہی غلام ابن غلام حکمرانوں کی غلامی میں پڑی تڑپ رہی ہے۔ نتیجہ یہ کہ ''دین مکمل'' پر نہایت کڑا وقت آ پڑا ہے۔ اس آشوب پر عالی کی نظم ''اے خدا'' روشنی ڈالتی ہے:

میں نے دیوار کعبہ سے اک دم چمٹ کر کہا
اے خدا
اے خدا
اے خدا
اور پھر کچھ نہیں کہہ سکا!

اس نظم کا سارا کا سارا حسن کم بیانی میں ہے۔ عالی شدت غم میں اللہ میاں سے کچھ نہیں کہہ سکے۔ مگر اس ''کچھ نہیں'' میں انہوں نے اتنا کچھ کہہ دیا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ یہ نظم آخری مصرعے پر ختم نہیں ہوتی بلکہ آخری مصرعے سے شروع ہوتی ہے اور ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ آخری مصرع اَن گنت مصرعوں کو آواز دیتا ہے اور اقبال کی فریاد کی لے فضا میں گونجنے لگتی ہے۔ رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر/ برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر/ حضور نذر کو ایک آبگینہ لایا ہوں/ جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں/ طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں/ کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے/ بات کہنے کی نہیں تو بھی تو...... وغیرہ وغیرہ/ پھر یک دم...... افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر/ کچھ بھی پیغام محمد کا تجھے پاس نہیں/ یہی شیخ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے/ گلیم بوذر و دلق اویس و چادر زہرہ/ مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب...... یوں محسوس ہونے لگتا ہے جیسے چارسو تاریکی خیمہ زن ہو اور اس تاریکی میں ہر جانب شرار بولہبی کا رقص برپا ہو۔ ایسے میں عالی چراغ

مصطفوی کی جستجو میں نغمہ سرائی کرنے لگتے ہیں۔ نظم ''چھپکلی کا دماغ'' اسی جستجو کی صورت گری ہے۔ اس نظم کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرتے وقت ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ:

شاعر نے علم الحیات کا بھی مطالعہ کر رکھا ہے اور اسے علم ہے کہ آدمی کے دماغ کے اندر کہیں ایک reptile بھی رہتا ہے جو مجسم درندگی اور بربریت ہے۔ اس کے لئے اس نے ''چھپکلی'' کا نام تجویز کیا ہے۔ علم الحیات سے تھوڑی بہت واقفیت رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ آدمی کا دماغ دراصل تین دماغوں پر مشتمل ہے۔ ان میں قدیم ترین دماغ مزاج اور وضع کے اعتبار سے reptilian ہے۔ انسان کی جملہ جبلتیں اپنی ننگی صورت میں اس دماغ کے اندر ہی آباد ہیں۔ یہ دماغ بھوک، شہوت اور غلبہ پانے کی اندھی خواہشوں کے تحت اچھے اور برے نیک اور بد گناہ اور ثواب سے قطعاً لاتعلق ہے۔ اس کا واحد مقصد اپنی بقا یعنی Survival ہے جس کے لئے وہ کوئی بھی طریق اختیار کر سکتا ہے۔ ارتقا کی دوڑ میں اگلا مقام اس وقت آیا جب ریپٹائل دماغ کی سطح پر mammalian دماغ اُگ آیا جس دماغ کا امتیازی وصف گہری لکیریں یا تجربات کی کھائیاں بنانا تھا۔ نفسیات نے انہیں آرکی ٹائپ کہا ہے۔ یہ وہ ساختیں یا خاکے ہیں جنہیں متخیلہ بھرتا ہے۔ بچہ جننے اور دودھ پلانے والے جانوروں کے حوالے سے یہ دماغ مامتا، شفقت اور خواب کاری کا مسکن ہے۔ بعد ازاں اس دائیں دماغ کے اندر ایک اور دماغ پیدا ہوا جسے بایاں دماغ کہا جاتا ہے۔ یہ دماغ ریشنل (rational) تھا۔ منطق اس کا ہتھیار اور تجزیہ اس کا تفاعل تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ انسانی دماغ کے اندر یہ تینوں دماغ بیک وقت موجود ہوتے ہیں ان میں سے پہلا دماغ مجسم بربریت ہے اور تیسرا (یعنی بایاں) دماغ مجسم معروضیت درمیان میں کہیں مہا بھارت کا وہ میدان جنگ ہے جہاں بربریت اور شفقت ایک دوسرے کے روبرو کھڑے ہیں۔ یہیں خیر اور شر، گناہ اور ثواب، اچھے اور برے تصادم میں بربریت کا پلہ ہمیشہ بھاری رہا ہے۔''

جمیل الدین عالی نے اپنے شہر اور اپنے وطن میں رونما ہونے والے دہشت و بربریت کے ہولناک مناظر کی پوری معنویت کو سمجھنے کی خاطر درج بالا سائنسی حقائق کو شاعری کے خوبصورت قالب میں ڈھالا ہے۔ جب عالی نے ان سائنسی انکشافات کو اپنے تہذیبی وجود میں جذب کر کے اپنی تخلیقی شخصیت میں ہضم کر لیا تب کہیں جا کر ان پر یہ نظم وارد ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے عالمانہ تجزیاتی مطالعہ میں مجھے مہا بھارت کے میدان جنگ کا ذکر بے محل نظر آیا۔ انسانی دماغ کی جن گہری، زیریں تہوں کو سائنسدان ریپٹائلین کامپلیکس کا نام دیتے ہیں انہیں عالی نے ''چھپکلی کا دماغ'' کے ساتھ ساتھ شرار بولہبی سے بھی موسوم کیا ہے۔ چنانچہ نظم یوں شروع ہوتی ہے:

ہمارے مغز میں شامل ہے چھپکلی کا دماغ
شرار بولہبی؟

بہت قدیم دماغ
وہ کہتے ہیں کہ وہ جو رینگنے والے تھے ان کا ورثہ ہے
مگر کچھ ایسے کہ اب بھی ہمارے ذہن کا اک ناگزیر حصہ ہے
میں قافیوں کا پجاری نہیں جو خوف وعقیدت سے کھینچ کھانچ کے کچھ یوں کہوں کہ
قصہ ہے

وہی کہوں گا جو کہتے ہیں یعنی ورثہ ہے

شرار بولہبی سے منسلک تلازمات ہمیں چراغ مصطفوی اور پھر انسانی وجود کے باطن اور بساط عالم کے خارج میں برپا خیر وشر کی کشمکش کو چراغ مصطفوی اور شرار بولہبی کے مابین کشمکش کے استعاروں میں پیش کرنے والے اقبال کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اقبال نے انسانی ارتقاء کی کہانی ہمارے دین کی باطنی روح سے برآمد ہونے والے استعاروں میں بیان کر رکھی ہے۔ عالی کی نظم ''چھپکلی کا مزاج'' ایک ایسے انداز فکر اور طرز احساس کو پھر سے تازگی بخشتی ہے جسے فراموش کر دینے کی روش کو عالی کے معاصرین ترقی پسندی اور جدت پرستی کا نام دیتے آئے ہیں۔ عالی اس نظم میں سوال اٹھاتے ہیں کہ:

جب ارتقاء نے ہمیں احسن تقویم کا مقام ہزار احترام دلوایا
تو کیا یہ طے ہے کہ آئندہ صدیوں میں بھی رہے گا ہمارے مغز کا یہ حصہ شیطنت مایہ
ہم آج عشق و جمال
بہت سے نیک خصال
ہماری زد میں بھی اور دسترس میں بھی ہے برابر کمال بعدِ کمال
ہمیں پہ کھلنے لگے ہیں وہ ان گنت اسرار
کبھی تھا جن کا حجابات آگہی میں شمار
اگرچہ اب بھی نہیں علم اور فقط معلوم
مگر فصوص حِکَم سے تو ہم نہیں محروم
ہزار ہا دُرِ آبدار سامنے ہیں
وہ منزلیں ہوں کہ ہیں رہ گزار سامنے ہیں

وہ جینیات کے حیرت انگیز حقائق ہوں یا روحانیت کے حجابات، عصر رواں کے سائنسی علوم ان تہہ بہ تہہ پردوں کو تیزی کے ساتھ چاک کرتے چلے جا رہے۔ عالی اپنے زمانے کی اس سائنسی ترقی کا امید اور رجائیت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔ وہ عہد حاضر کے آدمی کو مایوسی کے لپیٹ سے نکال کر یہ مژدہ سناتے ہیں کہ آدمی کے مغز میں کارفرما چھپکلی کا دماغ.... شرار بولہبی انسان کے مسلسل مادی اور روحانی ارتقاء کی بدولت بالآخر بجھ کر رہ

جائے گا:

خدا رحیم ہے وہ کیوں یہ چاہے گا اے جان
کہ تا ابد رہے انسان سے اس طرح منسلک شیطان
کہ اس پہ حاوی کبھی بھی نہ ہو سکے ایمان
وہ کیوں یہ چاہے گا آخر میں بھی ضرور گنہ گار چند بندے ہوں
جو بعد مرگ جہنم رسید کندے ہوں

عالی نے یہ نظم سن 1994ء میں لکھی تھی۔ یہ سال ان کی تخلیقی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے یہ تخلیقی وفور کا سال ہے۔ اس سال کے دوران انہوں نے بہت لکھا ہے اور بہت خوب لکھا ہے۔ "تجھی"، "امکان" اور "گواہی" کی سی منفرد نظمیں اسی سال وجود میں آئیں' مگر میری نظر میں اس سال کی ایک اہمیت اور بھی ہے۔ یہ سال صرف عالی ہی نہیں بلکہ اقبال کے بعد کی پوری اردو شاعری میں ایک نئے موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ عالی کی یہ نظمیں ترقی پسند شاعری' جدید شاعری اور ہر دور کے خلاف ردعمل کا نقشہ پیش کرنے والی نئی شاعری کی روایت میں ایک نئے نشان منزل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں ہمارے ادبی دنیا میں پیروی مغرب کا جو چلن عام ہو گیا تھا' اس کے زیر اثر مسلمانوں کی شعری روایت سے ہمارے شاعروں کا رشتہ کٹ کر رہ گیا تھا۔ اس زمانے میں اس عظیم شعری روایت کے سب سے بڑے ترجمان اقبال تھے جنہوں نے عہد حاضر کے سائنسی اور فکری ارتقاء کی روشنی میں اس روایت کو نیا رنگ و آہنگ بخشا تھا۔ مسلمانوں کے اس جدید تر رنگ سخن سے شعوری انحراف کی شعری روایت نے ہمیں چند اچھے شاعر تو ضرور دیئے مگر کوئی بڑا شاعر نہ دے سکی۔ جمیل الدین عالی کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ہماری شاعری کو اس تخلیقی بحران سے نکلنے کا راستہ دکھایا ہے۔ اس طرح انہوں نے ہماری شاعری کا رشتہ پھر سے مسلمانوں کی اس عظیم شعری روایت سے جوڑ دیا جس کی ترجمانی' تجدید اور احیا کا حق اقبال نے بے مثال شان و شوکت کے ساتھ ادا کیا ہے۔ عالی نے ہماری منحرف شعری روایت کو پھر سے اقبال کے اثبات کا چلن شعوری طور پر سکھایا ہے چنانچہ سن 1994ء ہی وہ سال ہے جس میں عالی نے اپنی شاعری کے نئے منشور کا اعلان یوں کیا تھا:

آگے جانا ہے تو رہوار بدلنے ہوں گے
ہم کو معیاروں کے معیار بدلنے ہوں گے

عالی کے عہد کی شاعری میں کارل مارکس کی مساوات شکم اور سگمنڈ فرائڈ کے جنسی ہمہ اوست سے پھوٹنے والی شاعری کے باغیانہ معیار اب تک مقبول و مروج چلے آ رہے ہیں۔ یہ معیار جزوی صداقت کو کل صداقت کا بدل ٹھہراتے ہیں۔ یہ جزوی صداقت عالم اشیاء ہی کو کل کائنات قرار دیتی ہے۔ اس کی رسائی فقط ظاہر و موجود تک ہے۔ چنانچہ اس شاعری میں باغیانہ گھن گرج تو موجود ہے مگر حکیمانہ نظر مفقود ہے۔ عالی نے اس

شاعری کے مروجہ معیاروں کو رد کر کے حکیمانہ شاعری کے گمشدہ معیاروں کی بازیافت اور عصر رواں کے علمی اور سائنسی سیاق و سباق میں ان کی تشکیل نو کا بار امانت قبول کیا ہے۔ ان کی نظم ''گواہی'' گویا حکیمانہ شاعری کے قدیم اور جدید تصورات کو باہم دگر آمیز کر کے شاعر فردا کو آواز دے رہی ہے۔ سعدی سے ماؤ تک..... گلستاں و بوستاں سے لے کر مذاکرات یناں تک..... حکیمانہ شاعری کی آفاقی اور دوامی تصورات کو حالی نے یوں زبان دی ہے:

تپاں تھا قلب ہر اک سوزش دوام سے بھی
جڑے ہوئے تھے مگر اپنے خاص و عام سے بھی
وہ جانتے تھے سب اصناف شعر کے آداب
وہ جانتے تھے کہ کب کس طرح ہو روئے خطاب
ادھر کچوکے لگاتے ہیں ذہن پر ہر آن
پچاس سال سے تازہ مذاکراتِ یونان
کہ اپنی سطح سے سطحِ عوام تک آؤ
اور ان کے فکر و خیال اپنی سطح پر لاؤ

اقبال تک پہنچتی ہوئی حکیمانہ شاعری کی روایت کو آگے بڑھانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اقبال کے اسلوب کی پیروی اور اقبال کے خیالات کی جگالی کی جائے۔ اس کے برعکس اقبال کی روایت کو آگے بڑھانے کا مطلب یہ ہے کہ اقبال نے اپنا کام جہاں چھوڑا ہے وہاں سے آگے کا سفر مسلسل اور مدام جاری رکھا جائے' سائنس اور فلسفہ کے ہر آن پھیلتے ہوئے آفاق کی سیاحی کو عبادت کا درجہ دیا جائے اور سائنس اور فلسفہ کو شیخ سعدی اور ماؤزے تنگ کے ''اپنی سطح سے سطح عوام تک آنے'' اور عوام'' کے فکر و خیال کو اپنی سطح پر لانے'' کے فنی معیاروں کے مطابق شاعری کا موضوع بنا دیا جائے۔ حالی نے جب شاعری کے اس نئے معیار کو اپنایا تو پرانے معیار یوں نظر آئے:

ذرا دیر افلاکِ افکار دیکھے
سو اب تنگ ایسے سخن کی زمیں ہے

علامہ اقبال نے اسلامی فکر کی تشکیل نو کے موضوع پر اپنے شہرۂ آفاق خطبات کے ابتدائیہ میں اس بات کی نشاندہی کرنا ضروری سمجھا تھا کہ ان کے بعد آنے والی نسلوں کے مسلمان حکماء اور شعراء کو ان خطبات میں پیش کیے گئے خیالات سے اختلاف کا حق حاصل ہے۔ انہوں نے رد و قبول کے اس فطری عمل کا جواز یہ کہہ کر پیش کیا تھا کہ سائنسی اور فنی علوم میں ترقی کی موجودہ رفتار ان کے بعد آنے والے زمانوں میں حیرت انگیز طور پر تیز ہو جائے گی۔ چنانچہ ان کے بعد آنے والی خوش نصیب نسلیں ان علمی اور سائنسی خزانوں سے بھی بہرہ مند ہو سکیں گی جن تک اقبال کے عہد کی رسائی نہیں۔ المیہ یہ ہوا کہ اقبال کے بعد ہمارے ہاں اقبال جتنا پڑھا لکھا آدمی ہی پیدا

نہ ہو سکا۔ نتیجہ یہ کہ ہماری شاعری سائنس و فلسفہ کی نت نئی فتوحات سے بیگانہ محض بن کر رہ گئی۔ ایک مدت بعد عالی نے عصری شاعری کا رشتہ سائنس اور فلسفہ سے از سر نو بحال کر دیا۔ اپنی شاعری کو سائنس اور حکمت سے متعارف کراتے وقت عالی کا انکسار قابل غور ہے:

مری مشق سخن تنگ سخن نکلی

یہ محاکمہ عالی کی اپنی شاعری پر پورا اترتا ہو یا نہ اترتا ہو ان کے معاصرین کی شاعری پر ضرور پورا اترتا ہے۔ خدا سے اپنے ''عجز بیان کی معذرت'' طلب کرتے ہوئے وہ دعا کرتے ہیں:

خداوندا
مجھے تو کم سے کم اتنی ہی صدیاں اور دے
دیکھوں، پڑھوں، سوچوں، لکھوں، کچھ کام کر جاؤں
اگر انعام ہوتے ہیں تو کوئی کارنامہ لائق انعام کر جاؤں
نہیں میں یہ نہیں کہتا کہ اب یا عہدہ آئندہ میں کوئی نام کر جاؤں
مگر ممکن تو ہے تیرے کرم سے جرم گاہ زندگی میں خود کو بے الزام کر جاؤں
یہ صدیاں تو الف بے تھیں

یہ گویا آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پسندیدہ دعا کو اپنے انداز میں دہرانے کا عمل ہے: رب زدنی علما...... عالی یہ دعا اس اعتراف کے ساتھ مانگتے ہیں کہ:

ابھی تک میں نہیں سمجھا
جو میرا حق بھی تھا اور فرض بھی اور آنے والوں جانے والوں کی طرف سے قرض بھی ہوگا
کہ اتنی کہکشاؤں، ماوراؤں، کے عناصر
باہر و ظاہر
اور ان کے علاوہ جو بھی ہیں وہ کیسے بنتے کیسے رہتے کس طرح چکر لگاتے ہیں
مری تقویم میں کیوں ساعتوں سے لے کے صدیوں تک پیمانے ہی آتے ہیں
مری تفہیم وہ شعشے ہی کیوں ٹھہرے جو فوراً بکھر کر ٹوٹ جاتے ہیں
سنانے والے بے نام ونشاں تاریک بے دیوار و در غاروں کے قصے بھی سناتے ہیں
وہ کہتے ہیں یہ مردہ ثابت و سیار ہیں ایسے کشش آثار
جن کے سامنے سے روشنی گزرے تو وہ اس کو بھی اندر کھینچ لاتے ہیں
غضب یہ ہے کہ سب سے میرا رشتہ بھی بتاتے ہیں
وہ کیا رشتہ ہے یہ پوچھو تو گاہے طنز گاہے بے بسی سے مسکراتے ہیں

یہ صدیاں تو الف بے تھیں

....

تجی؟
تجی' کہکشائیں' ماورائیں' دائرے' غاز ان کے اسرار کشش' تقویم عشاقی؟
گزر کر خاور وگل کچھ الفتوں سے' عشرتوں سے' چشم و ابرو لذتوں سے رہ گیا جب
بے مئے و ساقی

ترا دریوزہ گر ذہن اب تڑپتا ہے برائے منصب تفہیم خلاقی
ارے بے ذوق فتح منتہائے شوق تجھ سے ہو نہ پائے گی
یہ دیوار ازل پر موٹے موٹے لفظ کندہ دیکھ کیا لکھا ہے
یہ لکھا ہے کہ تجھ جیسوں کے حصے میں کبھی جمعیت خاطر نہ آئے گی
پڑا رہ بس اسیر فانی و باقی

....

یہ بات بڑی معنی خیز ہے کہ فن کے مقصد و منتہا کے باب میں ماؤزے تنگ کے فرمودات پڑھ کر عالی کو شیخ سعدی یاد آئے ہیں۔ ماؤ نے سعدی سے انحراف کے زمانے میں سعدی کے نظریات کا اثبات کیا ہے۔ عالی سائنس اور فلسفہ کے نت نئے آفاق کی سیر کرتے وقت اپنے تجربات و مشاہدات کو مسلمانوں کی علمی و فکری روایت کی روشنی میں پیش کرتے ہیں۔ یہ نئی سچائیاں ہماری تہذیب کی روح میں رچ بس کر ایک ایسا شعری پیکر اختیار کرتی ہیں کہ قدیم شعری روایت سے اخذ کردہ لفظیات' محاکات اور تراکیب نئے حقائق اور تازہ تر انکشافات سے تھرتھرانے لگتی ہیں۔ یوں سائنس اور فلسفے کی ہر نئی کروٹ مسلمانوں کی اپنی تہذیبی روایت کی توسیع اور تجدید کا فریضہ سرانجام دیتی نظر آتی ہے۔ نظم ''تجی'' میں جب وہ زماں اور لا زماں' مکاں اور لامکاں کے اسرار پر غور و فکر کے دوران ''عشق کی تقویم'' کی جانب آتے ہیں تو ''عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا' اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام'' ...... ''اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں'' ...... ''جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود'' ...... ''ہر اک منتظر تیری یلغار کا' تری شوخی فکر و کردار کا'' ...... کے سے مصرعے پڑھنے والے کے دل و دماغ پر منڈلانے لگتے ہیں۔ گویا عالی اب اپنے فکری ارتقاء کے اس مرحلے میں داخل ہو گئے ہیں جہاں ان کی شاعری اقبال کی شاعری کو آواز دینے لگی ہے۔ وہ اپنی طویل اور ابھی تک ناتمام نظم ''انسان'' میں ایک فکر انگیز شوخی کے ساتھ پکار اٹھتے ہیں:

چل اتنی بہت سی کائناتیں
کیا ان میں بس اک کُرے کی باتیں

انفس و آفاق کے سائنسی مطالعہ اور حکیمانہ تجزیہ کے علمی انکشافات پر تخلیقی انداز میں غور وفکر میں عالی کے روز افزوں انہماک نے انہیں ذات خداوندی کی جانب والہانہ پیش قدمی پر مجبور کر دیا ہے۔ ذات باری اب ان کی شاعری کا ایک مستقل موضوع ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے خدا کا ایک ارتقائی تصور اپنا لیا ہے۔ اپنی نظم ارتقاء میں کہتے ہیں:

اگر ارتقاء بھی تخلیق و تفتیش و تحقیق کا سلسلہ ہے
تو پھر ارتقا خود ہی کہنے لگا ہے
کہ اس کا بھی مخزن خدا ہے
خدا ارتقا ہے اور اس سے سوا ہے
اور اس سے سوا کیا ہے
وہ
وہ خدا ہے
خدا ہے

....

خدا کا یہ تصور ایک منفرد انداز میں اقبال کے تصور خدا کا اثبات کرتا ہے۔ یہ علمی جرات اور شاعرانہ صداقت کی ایک مثال ہے۔ قدامت پسند علمائے دین تو رہے ایک طرف جدیدیت اور سائنسی حقیقت نگاری کا دم بھرنے والوں نے بھی اقبال کے ہاں خدا کے ارتقائی تصور کی نفی کر رکھی ہے۔ یورپ سے اس تصور کی تردید میں ''Iqbal's concept of God'' کے سے عنوانات پر پوری کی پوری کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ایسے میں سن 1984ء میں لکھی جانے والی اس نظم میں اقبال کی تردید کرنے والوں کی تردید کر دی گئی ہے۔ اقبال نے اسلام میں ''خدا کے تصور اور عبادت کے مفہوم پر'' اپنی فلسفیانہ تحریروں میں جدید فلسفہ اور سائنس کی روشنی میں قرآن حکیم میں خدا کے تصور سے بحث کرتے ہوئے ذات باری کو بھی مسلسل ارتقا سے تعبیر کیا ہے ''کل یوم ھو فی شان'' کی سی آیات کریمہ کی عالمانہ تشریح قدامت پسند دینی حلقوں کی تنقید کا ہدف چلی آ رہی ہے۔ عالی نے اس باب میں مقلدانہ روش اپنانے کی بجائے اقبال کا اجتہاد پسندانہ رویہ اپنایا ہے۔ چنانچہ ان کے ہاں بھی کائنات کی سائنسی تعبیر کائنات کی روحانی تعبیر کا مقام پا لیتی ہے۔ یہ اتنی بہت سی کائناتیں' یہ زمان بے زماں اور یہ مکان بے مکاں یونہی کھیل کھیل میں بس حادثاتاً ہی پیدا نہیں ہو گئیں۔ ان کا ایک خالق ہے...... خالق اکبر' جس نے ایک خاص مقصد سے ان کائناتوں کو پیدا کیا ہے۔ وہ ہر لحظہ ہمیں خبردار کرتا چلا آ رہا ہے کہ:

ما خلقتا ھذا باطلاً

تہ در تہ معانی و مفاہیم سی لبریز ہر ذرہ کائنات سائنسی تعبیر کا تقاضا کر رہا ہے۔ اس تقاضے پر لبیک کہنے

والوں میں عالی بھی آ شامل ہوئے ہیں۔ اب وہ بھی خالق اکبر کی ہر آن تازہ تر نمود (کہ ہر لحظہ ہی تازہ شان وجود) کے سیاق و سباق میں کائنات اور مظاہر کائنات کی سائنسی تفہیم اور فلسفیانہ تفسیر میں عبادت کا سا انہماک رکھتے ہیں۔ چنانچہ کبھی تو وہ خدا کو ''عالم اندروں'' کے طور پر پہچانتے ہیں اور کبھی اپنے ضمیر کے آئینے میں اس کا عکس ڈھونڈتے ہیں:

ابتدائے سفر میں ہے اک شے ضمیر
بعد میں جتنا آلودہ ہوتا چلا جائے آغاز میں ہے منزہ مقطع، سمیع بصیر
وہ بھی دیتا ہے سب خامیوں کا پتا
وہ بھی بانگِ خودی
وہ بھی صوت خدا
اس کو مرنے نہ دے
اس کو اک زخم ہی کی طرح دل میں رکھ اور بھرنے نہ دے
جب رسے گا بڑا ہی غضب ڈھائے گا
جانے کن کن دکھوں میں تجھے کیسا کیسا مزہ آئے گا

شعور و عرفان کے اس مقام نظر سے دیکھیں تو ضمیر ذات اور ضمیر کائنات ایک دوسرے کا عکس معلوم دیتے ہیں۔ ہزار شیوہ زندگی کی معرفت کے اس مقام پر عالی مسلمانوں کی شعری روایت کو جدید سائنس اور عصری فلسفہ کی روشنی میں اپنا کر پہنچے ہیں۔ دردمندی کا جو تصور نظم ''انسان'' کی اوپر دی گئی لائنوں میں جلوہ گر ہے وہ مسلمانوں کی شعری روایت کا بنیادی تصور ہے۔ یہ تصور عالی کے دور کی شاعری نے گم کر دیا تھا۔ مسلمانوں کی انسان دوستی کی روایت میں لہو کی مانند رواں یہ تصور عالی کے معاصرین کی شاعری میں کچھ مفقود سا ہو کر رہ گیا تھا۔ عالی نے اس روحانی تصور کی بازیافت سے عصری شاعری کو ایک نئی سمت دی ہے...... حکیمانہ شاعری کی سمت۔ دیکھنا چاہئے کہ عالی کے معاصرین اس سمت اپنے سفر کا آغاز کب کرتے ہیں؟

(۳)

اپنی نظم ''تیسرا'' میں عالی نے بڑا برمحل سوال اٹھایا ہے۔ پوچھتے ہیں:

غالب و اقبال جیسا تیسرا
اس صدی کے اس دہے میں بھی نمو پاتا نظر آتا نہیں
پھر تو ڈر ہے تیسرا اگلی صدی کا نصف بھی پاتا نہیں
کیا ہوا وہ ارتقا

بعد آزادی ہماری جی نیں اس پر کیسے بادل چھا گئے
کیا تمہارا ارتقاء کے فلسفے میں شاونیت کے عناصر آ گئے؟

عالی اس سوال کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں اس کی وجہ ذہنی غلامی سے پیدا ہونے والا تہذیبی زوال ہے۔ یہ زوال اب اس حد تک آ پہنچا ہے کہ خود ہمارے ادبی اور تہذیبی زعماء اس زوال کی لپیٹ میں ہیں اور زوال پسندی ان کا مسلک بن کر رہ گیا ہے۔ اس زوال کو سمجھنے اور روکنے کا ہر سوال ان کی طبع نازک پر انتہائی گراں گزرتا ہے:

ارتقا کا نام ہے جہد بقا
جب تجھے انگریز نے چھوڑا تو تیرا قافلہ کیسے چلا
تو نے انگریزی کو خود اپنی زبانوں اور ذہنوں پر مسلط کر لیا
پھر جو ہونا تھا ہوا
ناطقہ بے جان ہے
فکر کا میدان بھی ویران ہے
وہ جو دو تھے وہ غلامی میں بھی پیوست زمیں
اب کروڑوں کہنے کو آزاد اپنے آپ سے واقف نہیں
شاونیت کا نہیں کوئی سوال
یہ تو اسباب ونتائج کا ہے جال
ست ہو جاتی ہے جب جہد بقا
دیریاب و پست سطح ارتقا
گر اسی رفتار اور گفتار کا انداز تم کو بھائے گا
چند صدیوں بعد ہی کوئی تیسرا 'گر آ سکا تو' آئے گا
ہاں
میاں
یہ سوال آئندہ اور کھل کر نہ کرنا ورنہ استادوں میں اور ایوان ہائے مقتدر میں مضحکہ
بن جائے گا

یہاں ''استادوں'' اور ''ایوان ہائے مقتدر'' کی طنزیہ کاٹ بڑی معنی خیز ہے۔ اقبال کے بعد ہمارے ہاں اردو میں جو چند اچھے اور مقبول شاعر نمودار ہوئے ہیں وہ شہرت اور مقبولیت کے اولیں مقام تک پہنچتے ہی اپنی شہرت میں اسیر ہو کر رہ گئے۔ اپنی شاعرانہ قد و قامت کی حفاظت ہی ان کی ادبی سرگرمیوں کا محور بن کر رہ گیا۔ یہ

بھی ذات کی اس اسیری ہی کا ایک شاخسانہ ہے کہ ایک ہی ادبی تحریک کے وابستگان نے بھی نظریہ کو پس پشت ڈال کر اپنی اپنی ذات کو پرچم بنالیا' اپنے اپنے جشن کے اہتمام اور اپنی اپنی سپاہ کے انتظام و انصرام میں لگ گئے۔ ایسے میں اقبال کا یہ فنی مسلک کسی کو بھول کر بھی یاد نہ آیا:

نغمہ کجا و من کجا' ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقہ بے مہار را

چنانچہ بزم ادب میں اپنی اپنی مسند کی حفاظت کی جدوجہد ہی ادبی تخلیق کی سچی لگن کا بدل بن کر رہ گئی۔ غالب اور اقبال کی ادبی روایت کے مستقبل کو ہمارے قومی مستقبل کے حوالے سے سنوارنے اور نکھارنے کا جذبہ عالی کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے کہ ہمارا ادبی اور قومی ارتقا انجماد سے حرکت کے مرحلے میں کب داخل ہوگا؟ اس سوال کا جواب خوش آئند نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عالی اپنے زمانے کے ادبی رجحانات' اپنے عہد کی ادبی شخصیات اور تحریکات کے فیضان کا سرے سے اعتراف ہی نہیں کرتے۔ اس کے برعکس وہ بصد عجز و انکسار اپنی شاعری پر ان سب کے مثبت اثرات کا اعتراف کرتے ہیں:

میرے عجز بیاں کی معذرت
گنج گہرہائے بزرگاں محترم ہیں
وہ سب مخصوص لہجے بھی جو میرے دور پر چھائے ہوئے بادل' پناہِ پیروانِ تازہ دم
اور خواب اونچے اونچے پرچم ہیں
دبستانِ مراتب' صد مناقب' سجدہ تعظیم کے ارکان واجب' اپنا اپنا ایک عالم ہیں
میں ان کی خوشہ چینی سے نہیں تقلید میں امکانِ گستاخی سے ڈرتا ہوں
''تتبع''

عالی نے تقلیدی کی بجائے اجتہادی انداز نظر کے ساتھ اپنے زمانے اور اپنے معاصرین کے ادب سے اکتساب فیض کیا ہے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ اپنے عہد کی کون سی دو آوازیں عالی کے دل کے کانوں کو بے حد پرکشش سنائی دیتی ہیں تو میں کہوں گا کہ حبیب جالب اور میرا جی۔ عالی نے ہر دو شاعروں پر بڑی خوبصورت نظمیں کہہ رکھی ہیں۔ حبیب جالب کی اپنے سامراج دشمن اور عوام دوست ادبی اور سیاسی مسلک سے سرفروشانہ وابستگی عالی کو بہت بھلی لگتی ہے۔ اپنی نظم میں حبیب جالب کو خراج تحسین پیش کرتے وقت وہ ان کے فیضان کی ان الفاظ میں تحسین کرتے ہیں:

نہ تھا مسیح مگر وہ عظیم بے چارہ
ہے اور صدیوں رہے گا ہماری بے بختی اور سخن کا کفارہ

میرا جی ادب کے جس جمالیاتی دبستان کی روح رواں تھے حبیب جالب کا انقلابی شعری نصب العین

اس کی ضد مانا جاتا ہے۔ جمیل الدین عالی نے ہر دو گھاٹ کا پانی پیا ہے اور مزے لے لے کر پیا ہے۔ اپنی نظم ''میراجی صاحب'' میں وہ میراجی کو اپنے عہد کا سب سے بڑا شاعر قرار دیتے ہیں۔ میراجی کا پورا کلام یکجا شائع ہوا تو عالی نے فخریہ مسرت کے ساتھ کہا کہ:

اب فیض بھی ہیں اور راشد بھی
وہ بہت بڑے پر میراجی!
ہاں میراجی وہ چمکتے ہیں
کیا کیا ہیرے کیا کیا موتی کس شان کے ساتھ دمکتے ہیں

....

اے یارِ غیاب مجید امجد
خاموش شکارِ رشک وحسد
بے تشہیری کے صید زبوں
کب جھنگ میں آ کر تجھ سے کہوں
لے وہ سچ واپس آیا ہے
جو جس کا حق ہو ایک نہ ایک دن اس نے پورا پایا ہے

جمیل الدین عالی نے اپنے عہد کے سب لہجوں' ساری آوازوں اور متعدد تحریکوں سے وہ سب کچھ سیکھا جو ان جیسا منفرد فنکار سیکھ سکتا تھا' سب کی تحسین و تعظیم کی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک مہذب تنقیدی کسوٹی پر سب کو پرکھا۔ رد و قبول اور تحسین و تردید کا یہ سلسلہ ایک طویل مدت پر پھیلا ہوا ہے۔ مجاہدۂ فن کے اس عمل کے دوران بالآخر وہ اس سوال پر آ پہنچے کہ اردو شاعری میں ''غالب و اقبال جیسا تیسرا'' کیوں پیدا نہ ہو سکا؟..........
اس سوال پر تخلیقی تفکر نے انہیں جدید حکیمانہ شاعری کی راہ پر لا ڈالا۔ اب سعدیؔ' ماؤ' اقبال کا شعری مسلک ان کے پیش نظر ہے۔ مروجہ پامال راستوں کی دھول سے باہر نکل کر اب ان کی شاعری ایک نئے چیلنج کے روبرو ہے۔ سن 1994ء سے وہ اس چیلنج سے عہدہ برآ ہونے میں کوشاں ہیں۔ ''تہجی''، ''چھپکلی کا دماغ'' اور طویل نا تمام نظم ''انسان'' اس کوشش کا حاصل ہیں۔ اقبال اور ن۔م۔راشد کے بعد اب تک ہمارے ہاں موضوع' اسلوب اور طرزِ احساس کے اعتبار سے ایسی کوئی نظم نہیں لکھی گئی۔ عالی کو ان نظموں پر ناز ہو نہ ہو اردو شاعری اس نادر و نایاب دولت پر ضرور نازاں ہے۔

•.....•.....•

۵۱=۳×۱۷

منشا یاد

''کہانیاں گم ہو جاتی ہیں'' کتاب کا نام بہت اچھا لگا۔ کہانیوں کا خیال رکھنا چاہئے کہ واقعی یہ گم ہو جاتی' بھول جاتی اور بچھڑ جاتی ہیں۔ اور کبھی کبھی مر مٹ بھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات زندہ دفن ہو جاتی ہیں۔ اور ہم خود انہیں زمین میں گڑی رہنے دینا چاہتے ہیں۔ اور اگرچہ بعض کہانیاں جسم یا روح پر لگے ان مٹ زخموں کی طرح ہوتی ہیں لیکن زیادہ تر تتلیوں اور جگنوؤں کی طرح نازک ہوتی ہیں۔ لحظہ بھر کے لئے اڑتی ٹمٹماتی ہیں اور اس سے پہلے کہ انہیں مٹھی میں بند کر لیا جائے نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ایسی کہانیوں کو بروقت سنا دینا' لکھ دینا یا ریکارڈ کر لینا چاہئے۔ ورنہ یہ گم ہو جاتی ہیں۔ دوبارہ ہاتھ نہیں آتیں۔

فاطمہ حسن نے بہت اچھا کیا کہ اوائل عمری کی ان خوب صورت کہانیوں کو ان کے گم ہونے یا بھول جانے سے پہلے ڈائری میں ریکارڈ کر دیا۔ لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ بعض اوقات کہانیاں سنا دینے' کاغذ پر منتقل کر دینے اور چھاپ دینے کے باوجود وقت کے گرد و غبار میں گم ہو جاتی ہیں۔ لیکن یہ دوسری بات ہے۔

اس کتاب میں چھوٹی چھوٹی سترہ کہانیاں ہیں۔ زیادہ تر دو یا تین صفحات کی۔ صرف ایک کہانی ''ٹھہری ہوئی یاد'' سات صفحوں کی ہے۔ کل صفحات ایک سو اکیس ہیں مگر خالی پشت کے عنوانات' تقریظوں اور دیباچوں نے ستر کے قریب صفحات گھیر لئے اور سترہ کہانیاں صرف پچاس اکیاون صفحات میں سمٹ گئی ہیں۔ اسی لئے میں نے اس مضمون کا عنوان سترہ ضرب تین برابر اکیاون رکھا۔

میں سمجھتا ہوں ہر دور کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ چپ' مائکرو اور ڈیجیٹل کا دور اور پینٹیم فور کا زمانہ ہے۔ ہر شخص تیزی میں ہے اور ہر کام میں تیزی اور اختصار چاہتا ہے۔ محاورتاً نہیں واقعی دریا کو کوزے میں بند دیکھنا چاہتا ہے۔ پوری کتاب ایک ڈسک پر اور انسائیکلو پیڈیا ایک سی ڈی پر ریکارڈ ہو جاتا ہے۔ اٹھارہ انچ کے سیٹلائٹ ڈش انٹینا پر دو سو سے زائد چینل ٹیلی کاسٹ۔ ہانڈی پکانے کے لئے سل بٹے کی بجائے پسے پسائے انسٹنٹ مصالحے۔ بعض جگہوں پر نو گزوں کی قبریں ملتی ہیں۔ کیا پتہ کبھی سچ مچ ستائیس فٹ یعنی پانچ منزلہ بندے بھی ہوتے ہوں۔ مگر اوپر کی چار منزلیں گر چکیں اور اب کوڈو بندوں اور ٹیڈی بکروں کی تعداد میں روز بروز اضافہ

ہوتا جا رہا ہے۔ کبھی مثنویوں اور طویل نظموں کا زمانہ تھا۔ اب شاعری نثری نظم کے بعد ماہیا اور ہائیکو سے دو حواف کر رہی ہے۔ اور مزید آسان رستوں کی تلاش جاری ہے۔ آپ نے بھی فردیات کی طرح کے ردیف اور قافیہ سے ماوراء الگ الگ شعروں پر مشتمل پوری پوری کتاب چھپی ہوئی ضرور دیکھی ہوگی۔ نثر میں بھی اب افسانوں شارٹ شارٹ اسٹوریز اور منی کہانیوں کا (جنہیں منی کہانیاں یا ننھی منھی کہانیاں بھی کہہ سکتے ہیں) کا زیادہ رواج ہو رہا ہے۔ منی کہانیوں میں دراصل افسانوں کی بچی کھچی تھیمز' یسی فرنائیل خیالات اور اپنا ہنر پیش کیا جاتا ہے۔ مگر منٹو کے بعد جوگندر پال کے سوا کسی کو اب تک کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

یوں تو مختصر افسانے یا شارٹ سٹوری کا نام ہی اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ یہ آرٹ اختصار کا متقاضی ہے۔ اور دنیا کی مختصر ترین کہانی کے طور پر یہ کہانی پیش کی جاتی ہے کہ ایک شخص نے دوسرے سے پوچھا کیا تم بھوتوں پر یقین رکھتے ہو۔ اس نے کہا ہاں اور یہ کہہ کر غائب ہو گیا۔ لیکن میں اسے کہانی نہیں چٹکلا یا لطیفہ مانتا ہوں۔ کہانی اگر زیادہ طویل ہوگی تو اپنی تاثیر کھو دے گی اور اگر زیادہ مختصر ہوگی تو کسی کردار کا چہرہ یاد رہے گا نہ کوئی تاثر قائم کر سکے گی۔ اور چٹکلا بن کر رہ جائے گی۔

فاطمہ حسن نے کسی کہانی کو منی کہانی یا چٹکلا نہیں بننے دیا۔ اور غنیمت ہے کہ ان کی کوئی کہانی دو صفحوں سے کم کی نہیں ہے۔ لیکن سات صفحوں کی واحد کہانی جس کا ذکر پہلے آیا ہے اس کے بارے میں خود مصنف کی رائے آصف فرخی کے پس لفظ سے معلوم ہوئی کہ اس میں ڈسکرپشن زیادہ ہو گیا ہے۔ اور یہ کہ یہ کہانی مجھے پسند نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ بھئی اگر آپ کو معلوم تھا کہ ڈسکرپشن زیادہ ہو گیا ہے تو اسے کم کرنے سے آپ کو کس نے روکا تھا۔ ایک اسی کہانی میں تو پورے قد کی بڑی کہانی بننے کے امکانات تھے۔ اور ڈسکرپشن اس لئے زیادہ ہو گیا ہے کہ کہانی میں غیر متعلق لوگ زیادہ آ گھسے ہیں۔ دوستوں اور رشتہ داروں کا ہجوم ہو گیا ہے اور اگر چچا زاد ناصر کو کہانی اور سیما سے کچھ لینا دینا نہیں تھا تو اس کے کینچوں' پتنگوں اور رنگین چیزیں جمع کرنے کے شوق فضول کا تفصیلی ذکر کس خوشی میں؟ مگر ڈسکرپشن کی اس بری مار کے باوجود کہانی سخت جان نکلی اور سروائیو کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ یوں لگا جیسے کچھ دیر ریت کے کیچڑ پر گھسیٹی جانے والی کہانی کی کشتی پھر سے پانی میں لا کر چھوڑ دی گئی۔ اور وہ نیلگوں سطح آب پر آ کر پھر سے ہلکورے لینے لگی۔

''وہ پچیس برس پیچھے کھڑا تھا' پھر کسی دانت نے تکلیف تو نہیں دی؟''

''تکلیف دینے کے لئے اور بھی بہت کچھ تھا۔ دانت تو نکالے بھی جا سکتے تھے۔ دکھ جو روح میں پھیل گئے ان کا شمار کیسے ہو؟''

سانسوں کا تو کوئی شمار نہیں ہوتا۔ دونوں نے سوچا (یہ دونوں کا ایک ساتھ سوچنا انہونی نہیں عام سی بات ہے) ''کبھی وہاں آنے کا خیال آیا؟ تمہارے پاس تو میرا پتہ تھا۔''

''کبھی کبھی جو چیز جہاں ٹھہر جاتی ہے اس کے وہیں رکے رہنے میں بہتری ہوتی ہے۔ میں نے یادوں

کو اسٹل کر دیا تھا۔ میں انہیں متحرک نہیں کرنا چاہتی۔ تم کیوں آئے ہو۔"

فاطمہ حسن کی زیادہ تر کہانیاں پرانی ہیں۔ اور ان کی نوجوانی کے زمانے کی یادگار۔ مجھے یا کسی کو شاید یہ سوال کرنے کا حق نہیں پہنچتا تھا کہ اتنی اچھی اور اسٹیبلشڈ شاعرہ کو طالب علمی کے زمانے کی یہ کہانیاں چھپوانے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ کیونکہ اس طرح تو ہر تخلیق کار سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے ہر شخص کو اپنا ماضی خواہ وہ کیسا ہی ہو، بہت عزیز ہوتا ہے۔ اور جیسے جیسے عمر زیادہ ہوتی جاتی ہے آدمی کو اپنا بچپن اور عہد شباب زیادہ بانٹ کرنے لگتا ہے۔ ہوسکتا ہے فاطمہ حسن کا بھی یہی معاملہ ہو۔ بہر حال میں نے مطالعے کے دوران میں اندازے سے بعض کہانیوں کے لکھے جانے کی عمر درج کر دی مثلاً:

"چوتھے کونے کا آسیب" .... کم عمری میں لکھی گئی کہانی

"سفر" .... اور بھی کم عمری میں لکھی گئی

"جھوٹے پھل" .... عہد طفولیت کی اولین کہانی

"کہانی ایک شہزادی کی" .... ہائی سکول میں داخل ہونے سے پہلے لکھی گئی۔ لیکن پھر ہائی کا لفظ کاٹ دیا۔

"چھتیس نمبر" .... آپ اٹھائیس چھتیس کا فارمولا سمجھتے ہیں نا۔ برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن، جوانی کی راتیں مرادوں کے دن۔

ذہنی اور جسمانی بلوغت کے دور کی ایک اور یادگار کہانی "زمین کی حکایت" کے بیج بہت زرخیز تھے بلکہ خوبصورت خیالوں کے انکھوے بھی پھوٹ نکلے تھے۔ مگر غیر ضروری احتیاط نے زمین کی اس دلچسپ حکایت کو مٹی میں رول دیا۔ دو کہانیاں "پری میچور برتھ" اور "وہ بچہ" جیسا کہ ناموں سے ظاہر ہے، بچوں کی پیدائش سے متعلق ہیں۔ پہلی تو چونکاتی ہے اور کچھ بجھاتی بھی ہے۔ مگر دوسری میں ایک خواب کا ذکر ہے۔ مانا کہ خواب ایسے ہی الٹے پلٹے ہوتے ہیں مگر کیا ضروری ہے ہر خواب بیان بھی کیا جائے۔ اور اس خواب کے بیان میں تو بے چارے علامتی افسانے کو بھی لپیٹ دیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"میں نے دیکھا کہ ایک عورت جو دوسری طرف منہ کر کے لیٹی تھی اس کا رحم کھلا اور اس میں سے ایک بچہ باہر آیا۔ مگر بچے کو کوئی تھامنے والا نہیں تھا۔ بچہ پھر اندر چلا گیا۔ میں نے وہاں کھڑی عورتوں سے کہا کہ تم بچے کو پکڑتی کیوں نہیں ہو۔ انہوں نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ تم کیوں نہیں پکڑتیں۔ میں نے کہا مجھے بچے پیدا کرانا نہیں آتا۔ ڈاکٹر کو بلاؤ۔ اس عورت نے کروٹ لی۔ وہ میری ماں تھی۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ اور پھر دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ خواب میرے حواس پر چھایا ہوا تھا۔ اگر مجھے پہلے ہی پتہ ہو کہ یہ عورت میری ماں ہے تو کیا میں ڈاکٹر کو بلاتی۔ کیا میں خود بچے کو تھام لیتی۔ میں نے یہ خواب دیکھا کیوں۔ اسے لکھوں تو علامتی کہانی بن جائے۔ اتنی واضح علامت ...... ماں بار بار بچے کو جنم دے رہی ہے ہم سنبھال نہیں پاتے۔ یہ سب سوچتی رہی اور خواب بدستور میرے ذہن پر چھایا رہا۔ ماں ہی کو کیوں دیکھا۔ اس کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ بچہ باہر تھا یا پھر اندر چلا

گیا تھا' اب وہ کہاں ہے''۔

اب آخر میں میں ایک ایسی کہانی کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو اپنے اختصار کے باوجود نہایت موثر اور کامیاب کہانی ہے۔ اس کا عنوان ہے ''وہ مجھے دیکھ رہی تھی''

یہ ایک پرفیکٹ کہانی ہے۔ اور کتاب کے دیباچے میں ضمیر علی بدایونی نے ورجینا وولف وغیرہ کے حوالے سے جس نسائی تحریک اور نقطۂ نظر کا ذکر کیا ہے وہ شاید اسی کہانی کو ذہن میں رکھ کر کیا ہے۔ اس میں نہایت لطیف اور تخلیقی انداز میں مرد کے غلبے اور اپنے نسائی تشخص کی تلاش کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ دو شخصوں کی کہانی ہے۔ اس کہانی سے یہ بھی باور آیا کہ اچھی کہانی کے لئے طوالت ضروری نہیں۔ یہ کہانی جیسا کہ اس کے واقعات سے ظاہر ہوتا ہے اگر بہت تازہ نہیں تو بھی ماضی قریب میں لکھی گئی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے میرا خیال ہے کہ اگر فاطمہ حسن اب کہانیاں لکھیں تو وہ اسی معیار اور مرتبے کی حامل ہوں گی۔ یوں بھی فالو اپ ضروری ہے ورنہ یہی ابتدائی کہانیاں ان کے کریڈٹ پر رہ جائیں گی۔

اس کتاب کی بیشتر یا شاید بھی کہانیاں ایک جواں سال واحد متکلم لڑکی کی زبانی بیان ہوئی ہیں۔ جو بہت حساس ہے اور دوسروں سے مختلف سوچتی اور منفرد نظر آتی ہے۔ اس میں احساس جمال ہے۔ وہ بسا اوقات ایک مصورہ ہے یا اسے اپنی انگلیاں بہت خوبصورت اور ایک آرٹسٹ کی انگلیاں معلوم ہوتی ہیں۔ اس کے کچھ خواب ہیں' خواہشیں اور تمنائیں ہیں۔ جسم کی اپنی ضروریات اور نسائی جذبوں کے اپنے تقاضے ہیں مگر وہ ڈری بدکی ہوئی' بے یقینی اور عدم تحفظ کی شکار لڑکی ہے۔ اپنے لئے کوئی اچھا فیصلہ نہیں کر پاتی اور محرومی سے ہمکنار رہتی ہے۔ اس کے آس پاس ایک اور لڑکی ہے۔ جو کبھی خارج میں کسی دوست کی صورت اور کبھی اس کے اندر سیلف سے کسی مونس اور ہم راز کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ دوسری لڑکی کبھی اس کی رقیب یا حاسد کا روپ بھی اختیار کر لیتی ہے۔ اور دونوں ایک ہی پیڑ کے پھل سے اپنی اپنی پیاس بجھانا چاہتی ہیں۔ اس دوسری لڑکی کا ''وہ'' کے سوا کوئی نام نہیں۔ اس کے علاوہ ایک مردانہ ''وہ'' بھی کہیں آس پاس یا پس منظر میں موجود ہے۔ جو اس سارے فساد کی جڑ ہے۔ مگر کہانی کار کا اس سے سلوک اچھا نہیں ہے۔ اور جیسا کہ اکثر خواتین لکھنے والیاں (قرۃ العین حیدر سمیت) مردانہ اور زنانہ کرداروں کو کھل کھیلنے کی اجازت نہیں دیتیں' فاطمہ حسن بھی اس بیچارے ''وہ'' کو خوب تگنی کا ناچ نچاتی ہیں۔ ان افسانوں کی مرکزی کردار لڑکی مرد کردار کے بارے میں کئی طرح کے واہموں بدگمانیوں اور اندیشوں میں مبتلا رہتی ہے۔ اس کی کسی بات پر یقین کرتی ہے نہ اسے ذہن سے نکال پھینک سکتی ہے۔ لیکن اس طرح قاری کو بعض نئے اور لطیف انسانی تجربوں سے آشنائی حاصل ہوتی اور خصوصاً نسائی دنیا کی بہت سی نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی مسائل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مجموعی طور پر اس کتاب کی کہانیوں میں نوخیز ذہن کی سوچیں اور انسانی جذبوں کے متنوع رنگ موجود ہیں۔ مجھے اوائل عمری کی کہانیاں جب انسان نے ابھی چالاکی' مکاری اور اداکاری زیادہ نہیں سیکھی ہوتی بہت پسند

ہیں۔ یوں بھی اوائل عمری کے کچے پکے جذبوں کے رنگ بڑے پکے ہوتے ہیں ان میں سچائی اور خلوص اور جوانی کا زور ہوتا ہے۔ فاطمہ حسن کی ان کہانیوں میں بھی سادگی اور سچائی کا عنصر زیادہ اور بناوٹ بہت کم ہے۔ میں توقع رکھتا ہوں کہ اب   کہ وہ فنی پختگی کے ساتھ ساتھ انسانی اعمال اور معاشرتی احوال کا زیادہ تجربہ رکھتی ہیں' شعری سفر کے علاوہ کہانی پر بھی توجہ دیتی رہیں گی۔ یقیناً ان میں ایک بڑی کہانی کار کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔

محمد خالد اختر --- ایک مطالعہ

ڈاکٹر خالق تنویر

فیض صاحب نے بہت عرصہ پہلے ایک انٹرویو میں اور پھر اشفاق احمد کے ساتھ ایک نجی گفتگو کے دوران میں محمد خالد اختر کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا:

''بھئی ہم کو تو محمد خالد اختر کی تحریر پسند ہے اور ہم تو ''چاکی واڑہ میں وصال'' کو اردو کا عظیم ناول سمجھتے ہیں۔''

کنہیا لال کپور نے ان کے اولین ناول 2011 کے بارے میں یہ رائے دی تھی:

''کاش میں اس کا مصنف ہوتا۔''

قرۃ العین حیدر نے ''پکچر گیلری'' میں شامل ایک مضمون میں محمد خالد اختر کو نظر انداز کئے جانے پر برہمی کا اظہار کیا تھا۔ فیض احمد فیض، کنہیا لال کپور اور قرۃ العین حیدر کا ادبی مقام و مرتبہ مسلّمہ ہے۔ تینوں مشاہیر کا محمد خالد اختر سے تعلق دوستی کی ذیل میں بھی نہیں آتا' اس لئے یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ یہ آرا نہ صرف بے لاگ ہیں بلکہ محمد خالد اختر کی تخلیقی شخصیت کا تعین بھی کرتی ہیں۔ اب ہمارے سامنے دو سوال ہیں:

اولاً: ان کا تنقید میں تذکرہ اتنا کم کیوں ہے؟

ثانیاً: محمد خالد اختر کی تحریریں قارئین کا وسیع حلقہ کیوں نہ پیدا کر سکیں؟

جہاں تک ناقدین کا تعلق ہے انہوں نے کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایسا نہیں کیا۔ تحقیق و دریافت کا عمل ادبی commitment کا تقاضا کرتا ہے جسے پورا کرنا سہل پسند نقاد کا کام نہیں۔ اس کام کے لئے جس یکسوئی اور تخلیقی و تحقیقی انہماک کی ضرورت ہوتی ہے' اس سے بیشتر ناقدین محروم ہیں۔ اس کے پیچھے بہت سے ادبی اور غیر ادبی محرکات و عوامل بھی کارفرما ہیں۔ اولیور گولڈ سمتھ (Oliver Goldsmith) کے ناول وکر آف ویک فیلڈ (The Vicar of Wakefield) کا ایک کردار دوسرے کردار سے ...... اس کے paradoxes کے بارے میں پڑھے لکھے لوگوں کی رائے معلوم کرتا ہے تو وہ کہتا ہے:

"The learned word said nothing to my paradoxes, nothing at all, sir. Every man of them is employed in praising his friends and himself, or condemning his enemies; and unfortunately as I had neither, I suffered the cruelest mortification, neglect."

یہاں تک محمد خالد اختر کی تحریروں تک قارئین کی رسائی نہ ہونے کا تعلق ہے' اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ کلاسیکل انگریزی ادب نے خالد کے تحقیقی مزاج کی آبیاری کی ہے چنانچہ وہ اپنے لئے ایسا اسلوب اور طنز و مزاح کا ایسا معیار منتخب نہ کر سکے جو عام پذیرائی کی شرط ہے۔ میرے خیال میں یہی چیز خالد کے اسلوب کو انفرادیت اور طنز و مزاح کی شائستگی کا وہ معیار عطا کرتی ہے جو ہمارے ہاں کم یاب ہے۔ وہ شائستہ و مہذب مزاح نگاروں کی اس پہلی صف میں شامل ہیں جن کی نگارشات ہمارا کلاسیکی ورثہ ہیں۔

محمد خالد اختر ایک ہمہ جہت ادیب ہیں۔ فکشن' تحریف' سفر نامہ' تبصراتی تنقید اور ڈائری وغیرہ ان کے منطقہ تحریر میں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کئی کتابوں کے ترجمے بھی کئے۔ انہوں نے ناول '2011ء'، 'چاکی واڑہ میں وصال'، 'عبدالباقی کہانیاں'، اور ڈائریاں طنز و مزاح کے عنصر کو اولیت دیتے ہوئے لکھی ہیں۔ دوسری تحریروں کے تخلیقی مقاصد مختلف تھے لیکن مزاح کی ایک زیریں لہر ان کے اندر بھی موجود ہے جو اوپر کی سنجیدہ و متین لہر کے ساتھ مل کر قاری کے لئے کیف و سرور کے نقش بناتی چلی جاتی ہے۔

محمد خالد اختر زندگی کے تمام مظاہر کا ایسا ذہین ناظر ہے کہ سات پردوں کے پیچھے چھپی حقیقتیں بھی ان کی نظروں سے اپنے آپ کو بچا نہیں سکتیں' وہ حقیقتیں جو ہمارے آس پاس اور ہمارے اندر کہیں موجود ہوتی ہیں لیکن ہماری دسترس سے باہر-- خالد جب انہیں ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں تو ہم ایسے تحیر سے دوچار ہوتے ہیں جس میں کچھ پا لینے کی مسرت کے ساتھ ساتھ اپنی نارسائی کا ملال بھی شامل ہوتا ہے۔ یہ وژن کتابی نہیں بلکہ انسان اور زمین سے ان کی والہانہ وابستگی کا نتیجہ ہے' جو صدیوں پر پھیلی صوفیانہ روایت کا حصہ بننے سے میسر آتی ہے۔ انسان پرستی ہی ان کے موضوعات کا سرچشمہ ہے۔ استحصال کی مختلف صورتیں-- معاشی یا معاشرتی' انسانی توہین' ذہنی افلاس اور انسانی حماقتیں-- عقائد کی بنیاد پر دل آزاری ہو یا منافقت اور ریاکاری کے مظاہر ہوں' ادیبوں کے غیر تخلیقی رویے اور خود نمائی کے بے ڈھنگے انداز ہوں یا ایوان سیاست کے مکر و فریب ہوں' محمد خالد اختر کے تخلیقی عمل کے لئے انگیخت کا باعث بنتے ہیں۔ ان کے پاس طنز و مزاح کے کئی سانچے' مختلف اصناف کی صورت میں موجود ہوتے ہیں۔ جو سانچہ جس موضوع سے مطابقت رکھتا ہے' اس پر چڑھا کر قاری کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ یہاں جابر علی سید کے مضمون ''عصر حاضر کا ایک ہیومنسٹ'' سے ایک اقتباس بے محل نہیں ہوگا:

> ''طنز و مزاح' جس کی ایک اہم ترین صورت پیروڈی ہے' جو خود خالد کے ہاں ایک بالکل نئی فارم بن گئی ہے یعنی مزاح کی بجائے سنجیدہ موضوع ہے' انسان دوستی کو

نشاط پسندی اور بہجت افروزی کی شکل میں بروئے کار لاتی ہے۔"

محمد خالد اختر کی پیروڈیاں مختلف شکلوں میں سامنے آتی ہیں مثلاً "مکاتیب خضر' ریلوے ملازمین کا مینوئل' سیاسی ڈکشنری' حکایات الہپ' ڈائریاں اور نیا قاعدہ وغیرہ۔ ان میں سے "مکاتیب خضر" کچھ موضوعات کے تنوع' ڈکشن اور حسن اظہار کے لحاظ سے ایسی تخلیق کا درجہ حاصل ہے کہ اردو کی نثری تحریف نگاری میں اس کی کوئی مثال موجود نہیں۔ غالب کے انداز میں لکھے گئے ان خطوط میں' ایسے سنجیدہ معاملات کو ہدف بنایا گیا ہے جو ادب' سیاست' مذہب' صحافت' نجی ربط وتعلق اور انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس انداز کی ایک کوشش انور سدید کی کتاب' "غالب کے نئے خطوط" ہے۔ ان مکاتیب کا مخاطب ایک ہی شخص ماہنامہ تخلیق کے مدیر اظہر جاوید ہیں' جس کی وجہ سے موضوع ادب تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے دوران میں قاری یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس ساری کدو کاوش کا مقصد مخالف ادبی گروہ سے متعلق ادبا وشعرا کی تنقیص وتعریض اور اپنی اور اپنے دوستوں کی تعریف وتوصیف کے سوا کچھ نہیں۔ احمد ندیم قاسمی' ڈاکٹر سلیم اختر' طاہر تونسوی اور خالد احمد کے ذکر پر ان کے لہجے کی تلخی' اپنے مرد مبارز اور حق گو ہونے پر اصرار قاری کو کھلتا ہے.........اور یہ ناگوار یکسانیت قاری کو بدمزہ کر دیتی ہے۔ محمد خالد اختر کے مکاتیب کا منظر نامہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ ان خطوط کے بارے میں سید محمد کاظم کی یہ رائے بڑی اہمیت رکھتی ہے:

> ان خطوط میں مکتوب الیہ کی شخصیت اور کردار کی مناسبت سے ایک خوش طبع چھیڑ چھاڑ بھی ہے' گلہ وشکوہ بھی ہے' طنز بھی ہے' استہزائے خفی بھی ہے اور عہد کے بدلتے ہوئے سیاسی' سماجی اور ثقافتی حالات پر رائے زنی بھی اور ان ساری باتوں کی تہہ میں وہ "سچ" ہے جو محمد خالد اختر ہمیشہ بولنا چاہتا تھا لیکن اس کے لئے شاید مناسب موقع یا مناسب پیرائیہ اظہار نہیں پا رہا تھا۔ یہ پیرائیہ اظہار اسے غالب کے اس طرز مکتوب نگاری نے مہیا کیا۔"

ان مکاتیب کا نمایاں پہلو یہی ہے کہ خالد نے مکمل سچائی کو اظہار کا معیار بنایا ہے اور سچی بات کہتے ہوئے تامل وہچکچاہٹ یا لہجے میں لکنت کا احساس نہیں ہوتا۔ وہ میدان ادب وصحافت اور سیاست کی معروف ترین شخصیات' اپنے قریبی دوستوں' رشتہ داروں حتیٰ کہ اپنی ذات کے بارے میں اسی ہموار لہجے میں سچی بات کہہ دیتے ہیں۔ دنیائے ادب کے جن مشاہیر کے نام خطوط لکھے گئے ہیں ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ اس فہرست میں دیگر ناموں کے علاوہ فیض احمد فیض' جوش ملیح آبادی' رئیس امروہوی' ضمیر جعفری' قدرت اللہ شہاب اور فہمیدہ ریاض شامل ہیں۔ شعبہ صحافت سے محمد طفیل' شورش کاشمیری اور الطاف قریشی ان کے مخاطب ہیں۔ سیاسی ومذہبی شخصیات میں ممتاز دولتانہ' ذوالفقار علی بھٹو' مولانا مودودی' یحییٰ خان اور مفتی محمود شامل ہیں۔ جن قریبی دوستوں کو خط لکھے گئے ان کے نام ہیں: شفیق الرحمٰن' احمد ندیم قاسمی' سید محمد کاظم' سید انور اور ریاض الرحمٰن۔ اس کتاب میں شامل دو

خوب صورت خط نپولین اور محمد شاہ رنگیلا کے نام لکھے گئے ہیں۔ بیٹی سارہ اور گھریلو ملازمین کے علاوہ شو بزنس سے تعلق رکھنے والی دو شخصیتوں ضیا محی الدین اور وحید مراد کو لکھے گئے خط بھی اس مجموعے میں موجود ہیں۔ دنیائے ادب سے تعلق رکھنے والے مشاہیر کی فہرست خاصی طویل ہے اس لئے بہت سے ناموں کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

اتنی نامور ہستیوں اور ان کے دوائر فکر و عمل کے تناظر میں ان مکاتیب کے موضوعات کے پھیلاؤ اور رنگارنگی کا اندازہ بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے۔ مخاطبین کے میلانات طبع اور پیشہ ورانہ دلچسپیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے سچائی کا یوں اظہار کہ توازن کا دامن چھوٹنے نہ پائے' آسان کام نہیں تھا۔ محمد خالد اختر نے اس تخلیقی عمل کے مقاصد فہمیدہ ریاض کے نام خط میں یوں بیان کئے ہیں:

''مقصد دلوں سے دل آزاری' واللہ نہیں' ان کی ہنسی اڑانا نہیں۔ محض یہ چاہتا ہوں کہ اپنے کو پہچانیں' آگہی و ہدایت پائیں' دولت خاکساری کو ڈھونڈیں۔ خود کو ان سے حقیقت میں کم تر اور فروتر جانا۔ جب بھی خلوت میں اپنے باطن کو آئینہ دکھاتا ہوں تو ہول آتا ہے۔''

محمد خالد اختر کے مکاتیب کی نمایاں ترین خوبی یہ ہے کہ انہوں نے سچائی کی تلاش اور اظہار کے ضمن میں اپنے اور غیر کے امتیاز کو کہیں روا نہ رکھا بلکہ اپنی ذات اور اپنی عزیز ترین ہستیوں کو بھی طنز و مزاح کا ہدف بناتے ہوئے صداقت اظہار کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ شفیق الرحمٰن کے نام خط میں اپنی کاہلی کا ان الفاظ میں مضحکہ اڑایا ہے:

''جب سے ملتان پہنچا ہوں یعنی پانچ ماہ سے حجامت نہیں بنوائی۔ روز خط بنوانے کا قصد کرتا ہوں' پھر کاہلی آڑے آتی ہے اور یہ سوچ کر بھی کہ تھوڑے بہت بال جو سر کے پچھلے نصف پر رہ گئے ہیں' وہ بھی حجام مونڈ دے گا' حجامت کے تکلف و اہتمام کا مزاج اب متحمل نہیں۔''

اسی خط میں اپنے نسیان کا ذکر انتہائی شگفتہ انداز میں کیا ہے:

''رمضان کا مبارک مہینہ ہے۔ روزہ میں رکھتا ہوں لیکن لعنت میرے نسیان کو کرو کہ روزہ رکھ کر بھول جاتا ہوں۔ بعد تناول غذا کے یاد آتا ہے کہ روزے سے ہوں۔''

صداقت اظہار محض اس چیز کا نام نہیں کہ دوسروں کے عیب ان کے منہ پر بیان کئے جائیں۔ دوسروں کے کمالات کا اعتراف بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ ان مکاتیب میں خالد نے اپنے عجز اور معاصرین کی خوبیوں کا کھل کر ذکر کیا ہے۔ سید ضمیر جعفری کے نام مکتوب کا اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''تم اکثر امور میں میرے ہم طالع و ہم درد ہو۔ دونوں ناوک بے داد کے

زخم خوردہ' فراوانی بے ذوقی و کور چشمی سے نالاں' راہ سخن سے بجز اس نکالنے والے۔فرق یہ کہ میں بے ہنری و ہیچ مدانی میں صاحب کمال' تم اپنے فن پر حاوی!"

اس مکتوب میں تخلیقی محرکات کا تذکرہ بھی ہے اور ضمیر جعفری کے فنی کمالات کا خلوص دل سے اعتراف بھی۔ سب سے خوش گوار پہلو وہ کسر نفسی ہے جو محمد خالد اختر کی دوسری تحریروں میں بھی ان مواقع پر موجود ہے جہاں ان کی اپنی ذات زیر بحث آئی۔ سچی بات یہ ہے کہ خالد نے اگر صاف گوئی سے دوسروں کے ناروا رویوں کو نشانہ طنز بنایا ہے تو اپنی ذات کو ایسی بے دردی کے ساتھ ملامت کا ہدف بنایا کہ فرقہ ملامتیہ سے سلسلہ جڑتا محسوس ہوتا ہے۔

میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ محمد خالد اختر کے مخاطبین کسی ایک طبقے سے متعلق نہیں۔ ضروری تھا کہ وہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی ان شخصیات کے ذاتی کوائف' ان کی دلچسپیوں کے محور' ان کے میلانات' ان کے شعبوں کے اسرار و رموز اور ان کی ناکامیوں اور کامرانیوں سے پوری طرح آگاہ ہوتے تاکہ یہ مراسلت ایسی تخلیق میں ڈھل جاتی جس میں قاری' مکتوب الیہ کو سانس لیتا محسوس کرتا۔ محمد طفیل کے خاکوں میں برتے گئے اسلوب سے واقف احباب اس اقتباس میں مکتوب الیہ کا عکس واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں:

"خاکہ نگاری میں تمہارے کمال پر رشک آتا ہے۔ اپنے حسن طبع سے اپنے ممدوحین کی سرشت بشری کا اس پیرائے میں انعکاس کرنا کہ وہ مجموعہ خباثت بن جائیں کوئی تم سے سیکھے--عنوانات-سبحان اللہ "آپ"-"صاحب"-"جناب"-"حضرت" وغیرہم۔ گستاخی پر محمول نہ کرو تو آئندہ تصنیفات کے کچھ عنوان معروض کرتا ہوں۔ چاہے شرف قبولیت بخشو' چاہے رد کرو' مولانا' قبلہ' فدوی' مابدولت۔"

محمد طفیل کے خاکوں میں اظہار عجز کے پیچھے چھپی خود پسندی کے تناظر میں "مابدولت" پر لطف معنویت کا حامل ہے۔

نپولین کے نام مکتوب کو تخلیق کے درجے تک پہنچانا آسان کام نہیں تھا۔ اس کے لئے مکتوب نگار کا انیسویں صدی کے یورپ کی روح' اس دور کی sensibility اور مکتوب الیہ کی نفسیات سے پوری طرح آگاہ ہونا ضروری تھا۔ اس مکتوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ خضر نے سینکڑوں سال پر پھیلے یورپی تہذیب و تمدن' ہوس جہانگیری اور انداز حکمرانی کے اندر جھانک کر وہ ادراک حاصل کیا جو اس خط کا محرک بنا اور پھر اسے ایک ادبی شاہکار بنا دیا۔ واٹرلو میں شکست کے بعد سینٹ ہلینا (Helena) میں قید کے دوران میں نپولین پر بیتنے والی کیفیات اور ان ایام کے دردآمیز تذکرے کو اپنی شوخی طبع سے پر لطف بنا دیا ہے۔

خضر کو خود بینی اور خود ستائی سے شدید نفرت ہے۔ اپنے وجود سے بڑھ کر پھیلنے والے شخص کو ہرگز معاف نہیں کرتے۔ جب کوئی شخص ڈینگیں مارتا ہے تو اس کا خضر کی حس استہزا سے بچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جوش کے نام مکتوب میں ''یادوں کی برات'' کے حوالے سے ان کی یہ حس نقطہ کمال پر پہنچی ہوئی ہے:

''اور سنو! مانا کہ کبھی یوسف ثانی تھے اور جس نازنین کی نگاہ تم پر پڑتی تھی وہ بہ مثل لوٹن کبوتر لوٹ پوٹ ہو جاتی تھی اور اختلاط باہمی کی متمنی و خواہاں! مگر مطلب اس کا یہ نہیں کہ تذکرہ اس امر کا اس تکرار سے کرتے جاؤ کہ شبہ ہذیان کا ہونے لگے۔۔معقول و اشراف لوگ یوں ڈینگ نہیں مارتے۔ جو تصنیف تمہاری پڑھے گا' اخذ مطالعہ سے یہ کرے گا کہ خود بینی و خود نمائی کے جاں گداز عارضے میں ذہن تمہارا گرفتار ہے۔''

رئیس امروہوی دنیائے ادب و صحافت کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ وہ ایک اچھے شاعر تھے اور بالخصوص قطعہ نگاری میں انہیں جو کمال حاصل تھا' اس کی مثال ہمارے ادب و صحافت میں مشکل سے ملی گی۔ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کے اظہار کے لئے ایک اور شعبہ بھی چن رکھا تھا جس کی ان کے اصل شعبے سے کوئی مطابقت نہیں تھی۔ وہ تھا تسخیر جنات' مراقبہ' ٹیلی پیتھی اور ارواح سے ملاقاتیں وغیرہ۔ انہوں نے ان موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں۔ ان معاملات کی حقیقت کا تو علم نہیں تاہم یہ بات واضح ہے کہ مختصر راستوں سے منزل پر پہنچنے کے خواہاں شعبدہ بازوں کے جال میں آسانی سے پھنس جاتے ہیں اور ایسے موضوعات پر لکھی گئی کتابیں بکتی بھی خوب ہیں۔ خضر نے رئیس امروہی کے نام جو خط لکھا اس کے ابتدائی الفاظ ملاحظہ کیجئے:

''امروہہ ولی خیز خطہ ہے اور دوسرے قصبوں کے اولیا جو تھوڑے بہت ہیں' امروہہ والوں کے آگے دم نہیں مار سکتے۔ ویسے تو فقیر بھی ایک عرصے سے اس کیفیت روحانی و سرمدی سے دوچار ہے۔ سوتے جاگتے جنات اور چڑیلوں سے سابقہ پڑتا ہے۔''

ہمارے اجتماعی مسائل کی جڑیں کہاں ہیں؟ اس ضمن میں نقطہ نظر کا اختلاف ہو سکتا ہے لیکن یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ہم نے ان معاملات سے نمٹنے کے لئے توازن فکر کا مظاہرہ کیا ہے اور نہ ہی درست سمت میں اجتماعی کوششوں کو بروئے کار لا سکے۔ مشرقی پاکستان کے المیہ کے پیچھے عوامل تو بے شمار تھے تاہم عمومی بے حسی ان میں سے ایک اہم ترین عامل تھا۔ اجتماعی بے گانگی' ہر معاملے کو خدا پر چھوڑ دینے اور اپنے حال میں مست رہنے کی عادت کو راؤ ریاض الرحمن کے نام مکتوب میں ہلکے پھلکے انداز میں بیان کیا ہے:

''فقیر فکر نہیں کرتا۔ آئمہ عالی کرام و اصحاب سبز پوش ہماری نگہبانی کریں گے۔ دل بہلانے اور وقت گزاری کے لئے شغل نو اختیار کیا ہے۔ اس قصبے

کے کبوتر بازوں میں ایک شخص ہے' اللہ رکھا خاں' میرے محلے میں رہتے ہیں'
ان سے دوستی گانٹھی ہے۔ پہر دن رہے ان کے کوٹھے پر چلا جاتا ہوں اور
کبوتر پروازی میں شریک ہوتا ہوں۔ زنہار دور بھنگ کا بھی چل جاتا ہے۔
بہاول پور میں بھنگ کا بھاؤ کیا ہے؟ بھائی ہم سے پوچھو تو زندگی گزارنے کا
بہترین فلسفہ اللہ رکھا خاں صاحب کے اس بیت میں متشکل ہوا ہے۔

دوری ڈنڈا گھسدا رہے
تے ملک ماہی دا وسدا رہے

ہمیں جن قومی بحران کا ماضی میں سامنا رہا اور جن سے اب بھی دوچار ہیں اور ان سے نمٹنے کے جو انداز ہم نے اپنائے اس کی تصویر کشی اس سے بہتر انداز میں نہیں کی جاسکتی۔ ان مکاتیب سے ایسی بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں جو قاری کو ہنساتی بھی ہیں اور رلاتی بھی ہیں۔ ایسی دردآمیز کیفیات کے بہاؤ میں قاری بے اختیار بہتا چلا جاتا ہے۔

اب رہ گئی القاب و آداب کی بات؟ جو شخص سو سال کے فاصلوں کو مٹا کر غالب کو دور جدید کی حسیات سے ہم آہنگ کر کے اتنی خوب صورت نثر لکھ سکتا ہے' اس کے لئے القاب و آداب کا انتخاب کون سی مشکل بات ہے۔ خضر نے ہر مکتوب الیہ سے اپنے تعلق' اس کے میلان طبع اور اس کے رتبہ و حیثیت کے مطابق طریقہ تخاطب وضع کیا ہے۔ الفاظ کے چناؤ اور ترکیب سازی میں ایسا اہتمام دکھائی دیتا ہے جو قاری کو اس لحاظ سے حیران کر دیتا ہے کہ ایسی احتیاط اور کرافٹ مین شپ خالد کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی--لیکن یہاں مسئلہ پیروی غالب کا تھا اور وہ اس میں یوں سرخرو ہوئے کہ یہ مکاتیب غالب کے وضع کردہ سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جو اپنے اندر غالب کا اسلوب اور فکر و نظر کے زاویے سموئے ہوئے ہیں۔

''حکایات ایسپ'' میں جانوروں سے متعلق کہانیوں کو ایسا twist دیا ہے کہ وہ ہماری سماجی' سیاسی اور معاشی زندگی پر گہری طنز کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ ان کہانیوں سے اخذ کردہ سبق آموز نتائج ہمارے اجتماعی رویے کی پر مزاح تصویریں بن گئی ہیں: مثلاً

''اپنے رسم و رواج اور طور طریقوں کو دوسروں کی پیروی میں ترک نہیں کرنا چاہئے خواہ وہ بیہودہ اور تکلیف دہ ہی کیوں نہ ہوں۔'' بہروپیا کوا

''تمغہ اور سفارت ملنے سے بڑے بڑے سرکش رام ہو جاتے ہیں۔'' شیر اور ہاتھی کی کہانی

''جو کام کل پر ٹالا جاسکتا ہو اسے آج مطلقاً نہ کیجئے۔'' شکرا اور کبوتر

سیاسی ڈکشنری 1970ء اس سے پہلے اور فوری بعد کے سالوں کی سیاسی کشمکش پر ایسی طنز ہے جو سیاست کے ساتھ ساتھ' ادب' صحافت اور فہم مذہب کے ایک مخصوص رخ کو ظاہر کرتی ہے۔ اس ڈکشنری میں

موجود چند الفاظ کے معانی اور تشریحات ملاحظہ کیجئے:

ب ''بیت المال: ملک میں صرف ایک بیت المال ہے۔ قربانی کی کھالیں وہاں جمع کرانی چاہئیں۔ وہ رسید بھی دیتے ہیں۔ آپ اپنی آسانی کے لئے اسے بیت المال کی جگہ بیت الکھال کہہ لیجئے' ایک ہی بات ہے۔''

ذ ''ذم: یہ ایک پہلو ہے جو پہلے شعروں سے نکلتا ہے۔ اب لیڈروں کی تقریروں اور اخباروں کے اداریوں سے بھی نکل آتا ہے۔''

ک ''کراچی: پاکستان کا ایک شہر جو اس لئے مشہور ہے کہ وہاں مولانا احتشام الحق تھانوی عیدین کی نماز پڑھاتے ہیں۔ کراچی کی مچھلیاں بہت مشہور ہیں۔''

ہ ''ہاتھی: ایک جانور جو 1958ء میں مسلم لیگ کا جلوس نکالنے آیا تھا مگر صدر مسلم لیگ عبدالقیوم خاں کا قد کاٹھ اور جسم جثہ دیکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔''

''ریلوے ملازمین کا مینول'' ہمارے مضحکہ خیز دفتری نظام کی مکمل تصویر کشی ہے۔ ہندستان میں برطانوی راج کے خاتمے پر جو نظام ہمیں ورثے میں ملا' ہم نے اس میں موثر اور قومی ضرورتوں سے ہم آہنگ تبدیلی کے لئے کسی تخلیقی اپروچ کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ ہمارے ذہنی وفکری جمود نے اسے ایک قومی المیہ بنا دیا۔ ریلوے ملازمین کا مینول ہمارے اسی رخ کا عکس ہے۔ اس مینول میں ریلوے کے تمام درجوں کے ملازمین کے حقوق و فرائض تفصیل سے درج ہیں۔ اسٹیشن ماسٹر ایک اہم ریلوے ملازم ہے' اس کے فرائض کی طویل فہرست میں سے چند ایک ملاحظہ کیجئے:

(i) عملہ پلیٹ فارم کو گھوڑوں' اونٹوں اور ہاتھیوں وغیرہ سے صاف رکھے گا۔ صرا اسٹیشن ماسٹر کی گائے یا بکری پلیٹ فارم پر گھوم پھر سکتی ہے۔

(ii) وہ اس بات کو یقینی بنانے کے اقدامات کرے گا کہ مرد حضرات عورتوں کے بیت الخلا میں داخل نہ ہوں اور اسی طرح عورتیں مردوں کے بیت الخلا میں نہ جائیں۔

(iii) ریلوے نے مسافروں کی سہولت کے لئے یہ بیت الخلا ہر پلیٹ فارم پر ساتھ ساتھ مہیا کر رکھے ہیں۔ مردوں کے بیت الخلا پر پگڑی والے مرد کی تصویر ہے اور عورتوں کے بیت الخلا پر ایک عورت کی۔ ویسے پگڑی کے بغیر بھی بیت الخلا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

''بیس سو گیارہ'' اور ''چاکی واڑہ میں وصال'' دو ایسے ناول ہیں کہ ان کے انوکھے موضوعات اور تر و تازہ اسالیب کے لحاظ سے اردو فکشن میں ان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

''بیس سو گیارہ'' محمد خالد اختر کی وہ اولین کتاب ہے جو تقریباً نصف صدی قبل مکتبہ جدید نے شائع کی تھی۔ محمد خالد اختر اسے ایسی فنتاسی قرار دیتے ہیں جسے لکھنے کا خیال جارج آرویل کے ناول 1984ء پر انگریزی

تبصرے پڑھ کر ان کے دل میں پیدا ہوا.......... ناول کے دیباچے میں آرویل کے ناول سے اس کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آرویل کا ناول حقیقت پسندانہ ہے اور اسے تنقید نگاروں نے اپنے تاثر میں دل دہلا دینے والا اور خوفناک بتایا ہے۔ میری فینٹاسی ایک ہلکی چیز ہے' ایک لمبا قہقہہ جس میں مصنف اگر ہر وقت نہیں تو زیادہ وقت ہنس رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ مستقبل کے متعلق میرا تخیل لاجیکل (منطقی) نہیں ---میرا ارادہ ایچ۔ جی۔ ویلز کی فینٹاسیوں کے تتبع میں لکھنے کا تھا مگر میں اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ مجھے ڈر ہے کہ میری یہ فینٹاسی ایک فارس (farce) بن کر رہ گئی ہے۔''

محمد خالد اختر نے اپنی اس اہم تخلیق کے بارے میں جو کچھ کہا ہے یہ محض کسر نفسی کا اظہار ہے۔ سنجیدہ موضوع اور منفرد شگفتہ اسلوب کے حامل اس ناول کو farce قرار نہیں دیا جا سکتا۔ خوف اور خواہش میں لپٹی ہماری زندگی کے تناظر میں اس ناول کو دیکھا جائے تو یہ انکشاف ہوتا ہے کہ یہ ناول ایک حساس تخلیق کار کا انسانیت اور انسانی مستقبل کے بارے میں بیم و رجا کے دھاگوں سے بنا ہوا خواب ہے' ایسا خواب جو دوسرے بہت سے لوگ بھی دیکھتے ہیں لیکن اس کے اظہار پر قادر نہیں ہوتے۔ جدید ایٹمی اسلحے' اس کی تباہ کاریوں سے نفرت' اس انسانی المیے کی ذمہ دار قوتوں کے خاتمے پر دبی دبی خوشی' اعلیٰ تہذیبوں کے مٹنے کا ملال' نئی دنیاؤں کی تشکیل اور ان میں قدیم پرویزی حیلوں کی کارفرمائی جیسے اہم موضوعات اور طنز و مزاح کی تازگی نے اس ناول کو ایک منفرد تخلیق کا مقام دے دیا ہے۔ 1992ء کی عالم گیر تباہی سے امریکہ کے خاتمے پر' جو عالمی امن اور ہزاروں سال کے عظیم انسانی ورثوں کی بربادی کے سامان کرنے کا ذمہ دار تھا' دبی دبی سی مسرت محسوس کرتے ہیں تو چند گھنٹوں میں تہذیب کے روحانی اثاثوں کی تباہی کا ماتم بھی کرتے ہیں۔ تین بڑے ملک امریکہ' فرانس اور برطانیہ صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ ان ملکوں کے مجموعی تہذیبی و ثقافتی رویوں کے فرق کو بڑے جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

''دوسری دنیا کی قوموں کو فرانسیسی سست' عیاش اور بدچلن معلوم ہوتے تھے مگر یہ صرف ایک حد تک ہی سچ تھا۔ میرے خیال میں وہ دنیا میں سب سے زیادہ مہذب قوم تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے (جیسا کہ جنگ سے بہت پہلے کے ایک انگریز مصنف نے اقرار کیا ہے) کہ فرانسیسی نثر مکمل تھی۔ امریکہ میں جاز بینڈ کے بادشاہوں اور موٹر کاروں کی بادشاہوں کی قدر و منزلت تھی۔ انگلینڈ ابھی تک اپنے مرغوب امرا' لارڈز اور ڈیوک ڈم کے پیچھے دیوانہ تھا مگر فرانس کی آنکھوں کے تارے اس کے بڑے نثر نگار

تھے--موپاساں' پروست اور فرانسوا موریاک۔''

اس پیراگراف میں تین قوموں کے تہذیبی و ثقافتی فرق کو جامع اور بلیغ اختیار سے سمویا گیا ہے وہ فن پر دسترس' مطالعہ کی وسعت اور ادب و ثقافت کی روح کو چھو لینے کی بے پناہ صلاحیت کے بغیر ممکن نہیں۔

دنیا کی کامل تباہی کے بعد سیاہ فاموں کی جمہوریۂ ریاست ہائے متحدہ افریقہ کے نام سے تشکیل پاتی ہے جس میں سفید فاموں کو اسی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو وہ کالوں کے ساتھ اپنی بادشاہتوں میں روا رکھتے تھے۔ یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

''کئی ممتاز ہوٹلوں پر یہ بورڈ آویزاں ہیں ''سفید آدمی منہ کالا کئے بغیر اندر نہیں آ سکتے۔''

مصنف نے ناول میں دنیا کی نئی صورت گری جس طرح کی ہے' اس کے مطابق اسرائیل طاقتور اسلامی ملکوں کے درمیان گھر چکا ہے۔ دنیا کی قیادت پاکستان' ایران اور افغانستان پر مشتمل ایک طاقت ور ملک ''اسلامستان'' کے پاس ہے جس کا دارالحکومت کراچی ہے۔ بھارت تیزی کے ساتھ قرون وسطیٰ کی طرف جا رہا ہے۔ اس کی بعض ریاستوں کی وزارت عظمیٰ کے عہدوں پر بندر فائز ہیں۔

اس ناول کا بیشتر حصہ ''ماضنین'' ری پبلک کے خیالی نقشے پر مشتمل ہے۔ اس ری پبلک کے پہلے حکمران رات کو چپکے سے بھاگ جاتے ہیں تو وہاں کے باشندوں نے ایک دولت مند پنساری افضل ترکا بو کو مملکت کی سربراہی قبول کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اب وہ اپنے پرچون کے کاروبار کے ساتھ کاروبار مملکت بھی چلانے لگا۔ ظاہر ہے اس نے ملک کے ساتھ وہی کچھ کیا جس کی توقع ایک اچھے اور مخلص پرچون فروش سے کی جا سکتی ہے۔

یہ ناول فینٹسی یا محض خیالیہ نہیں۔ اس میں انسانی مستقبل کی ایسی صورت گری کی گئی ہے جس کی جڑیں اقوام عالم کی اجتماعی نفسیات' ہمارے طویل ماضی اور ان دیکھے مستقبل کے خوف اور خوابوں میں پیوست ہیں۔

''چاکی واڑہ میں وصال'' ایک محبت کی کہانی ہے۔ ناول نگار قربان علی کٹار اپنے پڑوسی قصاب کی بیٹی سے محبت کرتا ہے۔ یہ یک طرفہ محبت مختلف موڑ مڑتی ہوئی پر مزاح انجام پر منتج ہوتی ہے لیکن یہ ناول اتنی سی بات کہنے کے لئے نہیں لکھا گیا۔ اس ناول کا اصل موضوع تو وہ کردار ہیں جو رنگا رنگ شخصیتوں کے مالک ہیں۔ محمد خالد اختر کرداروں کو ایک موثر آلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کی سبھی تحریروں میں وہ فکشن ہو' سفر نامہ ہو یا پیروڈی' کردار واقعات پر غالب ہوتے ہیں۔ ان کرداروں کی حرکات اور اطوار' ایک ایسی صورت حال تشکیل دیتے ہیں جو بظاہر اصل مقصد نہیں ہوتا لیکن قاری کے لئے بہجت و شادمانی کے وافر سامان فراہم کرتے ہیں۔

خالد ہر سفر میں کوئی نہ کوئی ساتھی تلاش کر لیتے ہیں۔ اگر حقیقی طور پر نہ مل سکے تو اپنے تخیل کو بروئے کار لاتے ہوئے کوئی کردار گھڑ لیتے ہیں اور انبساط و بصیرت کا سامان فراہم کر کے قاری کے سفر کو خوشگوار بنا دیتے ہیں۔ خالد کے سفر ناموں میں قونیہ کا جلال الدین' کاغان کا ہزاروی اور پلیٹ فارموں پر امامت کے فرائض ادا

کرنے والا پیر ہمارے لئے اسی طرح کی بصیرت و مسرت کا منبع ہیں جیسے میکسم گورکی کی کہانی ''میرا سفری ساتھی/میرا ہم سفر'' کا شاکرو (Shakro) اور سمرسٹ ماہم کی مشہور کہانی ''بارش'' کا ڈیوڈسن۔ میکسم گورکی نے آخر میں اس کردار کے بارے میں اس قسم کے الفاظ استعمال کئے ہیں:

''اس نے مجھے وہ کچھ سکھایا جو اہل دانش کے تحریر کردہ کاغذوں کے پلندوں میں نہیں ملتا کیونکہ زندگی سے حاصل ہونے والی بصیرت انسانوں کے ذریعے ملنے والی دانش کی نسبت زیادہ گہری اور اندر اترنے والی ہوتی ہے۔''

اس ناول کے بنیادی کردار قربان علی کتار اور اللہ توکل بیکری کے مالک محمد اقبال چنگیزی ہیں جن میں چچا عبدالباقی اور بھتیجے بختیار خلجی کا عکس دیکھا جا سکتا ہے۔ قربان علی کتار کا کردار چالاکی' سادہ لوحی' دنیا داری اور دنیاوی جھمیلوں سے بے نیازی کے آمیزے سے تشکیل پایا ہے۔ قربان علی کتار منصوبے بنانے کا ماہر ہے۔ ناول نویسی سکھانے کا ادارہ بنایا لیکن اپنے رفیق خاص اقبال چنگیزی کے یہ بتانے پر بند کر دیا کہ یہاں کوئی شخص ناول نویسی نہیں سیکھنا چاہتا کیونکہ فاقہ کشی کے اس سے زیادہ سہل اور دلچسپ طریقے موجود ہیں۔ ادھر سے فارغ ہو کر منصوبہ سازی کی تمام صلاحیتیں اپنی محبوبہ رضیہ تک رسائی کے لئے وقف کر دیں۔ قربان علی کتار روٹی اور کپڑے کے تفکرات سے بے نیاز تھا۔ اس نے اقبال چنگیزی کے ریستوران اور بیکری کو یہ اعزاز بخش رکھا تھا کہ کھانے پینے کا سبھی سامان وہاں سے آتا تھا۔ رہ گئی کپڑوں کی بات' تو اقبال چنگیزی قد کاٹھ میں ہو بہو قربان علی کتار جیسا تھا چنانچہ اس کے کپڑے استعمال کرنے میں بھی کوئی امر مانع نہیں تھا۔

اس ناول میں رزم حنائی' شداد چشتی اور ''خیال فرتوت'' کے ایڈیٹر مولانا محمد خاں ہماری ادبی صورت حال' ترقی پسند تحریک' صحافتی انداز اور تنقیدی معیارات پر ایسی طنز ہے کہ یہاں ناول نگار کے قلم کی کاٹ مزید گہری اور تیز ہو گئی ہے۔ اس ناول کا ایک کردار شاہ جنات پروفیسر شاہ سوار خاں ہے جو اپنی نیک نیتی' خلوص اور فصاحت بیان سے سامعین کو مسحور کر کے اپنی مشکل کشا طلسمی انگوٹھی خریدنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''مجمعے میں کھڑے ایک فوجی نے پہل کی۔ اس نے ایک روپے میں سلیمانی انگوٹھی خریدی اور چار آنے میں سلیمانی تیل کی چھوٹی شیشی جو نگینے کو چمکانے کے لئے ضروری تھی۔ نیلی یونیفارم میں ایک نیوی والے نے بری فوج کو نیچا دکھانے کے لئے دو انگوٹھیاں خریدیں۔''

یہ وہی انگوٹھی ہے جس کی طلسمی قوت فوجی سربراہوں کو مسند اقتدار پر براجمان ہو کر قومی عوارض دور کرنے میں مدد دیتی ہے۔ نیلی یونیفارم والا دو انگوٹھیاں خریدنے کے باوجود پیچھے رہ گیا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سلیمانی تیل کی شیشی خریدنا بھول گیا جو نگینہ چمکا کر طلسم کو دوچند کرنے کے لئے ضروری تھی۔

اس ناول کا ایک کردار ڈاکٹر غریب محمد ہے جو سائنس دان بھی ہے اور معالج بھی۔ اس کے دم قدم

سے بیماری سے موت تک کا سفر آسان ہوتا ہے اور قبرستان کی رونق دوبالا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر غریب محمد اور پروفیسر شاہسوار کی ضرورت و اہمیت چا کی واڑہ تک محدود نہیں۔ دیہات اور قصبوں حتیٰ کہ بڑے شہروں کے بھی چا کی واڑوں میں افلاس' بیماری اور اعتقادات کے جال میں پھنسے بے نوا لوگوں کی نجات کی کنجیاں ایسے معالجوں اور روحانی عاملوں کے ہاتھ میں ہیں۔

محمد خالد اختر کے ہاں انوکھے ناموں کا ایک طویل سلسلہ ہے جو واقعات اور کیفیات کے ساتھ اس طرح منسلک ہیں کہ انہیں نہ تو الگ کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی ان کی جگہ دوسرے نام فوری طور پر تجویز کئے جا سکتے ہیں۔ یہ نام کرداروں کی تہذیبی اور نفسیاتی سطحوں کی علامتیں ہیں۔ مضحک ناموں کی تشکیل آسان کام نہیں۔ اس کے لئے اس کیفیت اور صورت حال کی کامل بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے جس کو ان ناموں کے ذریعے پیش کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ قارئین کے تہذیبی پس منظر اور زبان کی مختلف سطحوں سے واقف ہونا بھی ضروری ہے۔ خالد انسانوں کے علاوہ مختلف اشیا کے لئے بھی انوکھے نام منتخب کرتے ہیں جو ان کے ظاہر و باطن کو منکشف کر کے قاری کو خوشگوار حیرت سے دوچار کرتے ہیں۔ اکثر نام تو ان کے تخلیقی ذہن کی پیداوار ہوتے ہیں تاہم جہاں ضرورت پڑے وہ غیر ملکی ناولوں کے معروف کرداروں کے نام بھی مستعار لے لیتے ہیں۔ کچھ کرداروں کے نام ملاحظہ کیجئے:

> ''اپی کیورس' حکیم ناطق گیراج پوری' نادر کرمس' چودھری نرگس بغدادی' الف ایل پٹاخا' پروفیسر ہیجانی طوفان' ڈاکٹر ہند باد مضمر' پروفیسر خیال افقی نڈھال' صفیہ پشیمانی اور قطب ابدالی۔''

چند ناولوں کے نام دیکھئے:

> ''بے مثال چمگادڑ' شریف ڈاکو' انسپکٹر شہباز کاں عرف بدمعاش حسینہ' سائنز آف دی ایپ' سرشاری نظارہ ابرد اور تیری زلف کے سر ہونے تک۔''

محمد خالد اختر کو آسانی سے یہ بات کہہ دینے میں کمال حاصل ہے جبکہ بعض مزاح نگاروں کو ویسی بات کہنے کے لئے ایسے صناعانہ کرب سے گزرنا پڑتا ہے کہ ان کی تحریر نشان عبرت بن کر قاری کو کرب و اضطراب سے دوچار کر دیتی ہے۔ بعض اوقات وہ سنجیدہ بات کہتے کہتے اچانک اور بے ساختہ انداز میں کوئی جملہ لے آتے ہیں جو قاری کے دل کو یوں چھوتا ہے جیسے دھیرے دھیرے چلتی ہوا پھول کھلاتی ہے۔ کچھ جملے ملاحظہ کیجئے:

> جہاں اردو کے اس دور کے بہترین شاعروں کا ذکر آتا' اس کا نام فہرست کے پہلے تین میں لیا جاتا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔''

''چا کی واڑہ میں وصال'' کا قصاب اپنی مرحومہ بیوی کی خوبیوں کا اعتراف ان الفاظ میں کرتا ہے:

> ''بڑی اچھی عورت تھی' بھلی مانس عورت تھی۔ میں اس کو بے تحاشا پیار کرتا

تھا اف تک نہ کرتی تھی۔"

ترکی کے سفر نامہ میں مولانا روم کے روحانی تجربات کا ذکر کرتے ہوئے اچانک یہ جملہ لے آتے ہیں:

"یہ عجیب اتفاق ہے کہ کئی عارفوں کی معرفت کے زینے طے کرنے میں اور
عشق حقیقی تک رسائی پانے میں ستاروں کے لڑکوں نے دست گیری کی۔"

اب رہ گئی محمد خالد اختر کے اسٹائل اور زبان کی بات--ان کے ہاں جملوں کی ساخت پر غیر ملکی ادب سے ان کی گہری وابستگی کا اثر ہے لیکن انہوں نے یہ سب کچھ شعوری طور پر نہیں کیا۔ غیر ملکی ادب سے جو تعلق پیدا ہوا وہ وقت گزرنے کے ساتھ اتنا بڑھا کہ پڑھتے رہنا اہم ترین فریضہ حیات بن گیا۔ اس مطالعہ میں چوں کہ غالب حصہ یورپی ادب کا ہے اس لئے جملے کی ساخت کا یہ سٹائل خود بخود ان کی تحریر کا حصہ بن گیا۔ ان کے پھیلے ہوئے تخلیقی کام سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے لئے اپنے خیالات کو معرض تحریر میں لانا جملے کی بناوٹ اور الفاظ کے انتخاب سے زیادہ اہم تھا۔ "گدھوں کی برآمد کا قصہ" سے اس طرز کے چند جملے دیکھئے:

"ایک چوڑی سی پیٹھ ہیبے واچ کمپنی کے دروازے میں دکھائی دی اور پھر میں
نے اسے کھو دیا۔"

"چاکی واڑہ کی آدھی میمن آبادی امریکا کو گدھے ایکسپورٹ کرنے کی
سکیمیں بنا رہی ہوگی۔ ہم کو اس میدان میں پہلا ہونا چاہئے۔"

"اس سے وقتاً فوقتاً مس میی کی ہدایات کے تحت ٹائپ سیکھنے کا شوق کیا
تھا۔"

"چاکی واڑہ میں وصال" کے چند جملے ملاحظہ کیجئے:

"ہم خلجی ان لوگوں میں سے نہیں جو آدھی رات کا تیل جلانے میں یقین
رکھتے ہیں۔"

"دوستی کے ایک اچھے کھانے سے زیادہ اور کیا چیز مفید ہو سکتی ہے۔"

محمد خالد اختر کی ایک دوست فہمیدہ ریاض نے 1976ء میں فنون میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں ان الفاظ میں کچھ مشورے دیئے تھے:

"حقیقت یہ ہے کہ عام قاری کی رسائی ان تحریروں کے مواد تک نہیں ہوئی
ہے اور اس کی واحد وجہ یہ جناتی ادبی اسٹائل ہے جو محمد خالد اختر نے اپنا لیا۔
محمد خالد اختر کو اپنی منتخب زبان پر نظر ثانی کرنے کی اشد ضرورت ہے۔
جملوں کو انگریزی ساخت آخر کس لئے؟"

میں اس رائے سے جزوی طور پر متفق ہونے کے باوصف یہ کہوں گا کہ فہمیدہ ریاض نے مشورہ دینے میں خاصی تاخیر کر دی تھی کیونکہ خالد اپنے وضع کردہ اسٹائل میں بہت پختہ ہو چکے تھے۔ اس وقت تک ان کی دو تین کتابیں، کئی پیروڈیاں، درجنوں مضامین اور افسانے چھپ چکے تھے۔ پھر بھی یہ سوال اٹھانے میں کوئی ہرج نہیں کیا خالد کو قارئین تک متوقع رسائی کے لئے اپنا اسٹائل بدل لینا چاہئے؟ میرے لئے یہ کہنا آسان ہے کہ خالد کو ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ اگر ایسا کریں گے تو اپنی شناخت کھو دیں گے۔ مشتاق احمد یوسفی اپنا انداز تبدیل کر کے بھی کچھ ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے دلوں میں بسنے والے مشتاق احمد یوسفی نہیں رہیں گے۔ محمد خالد اختر ان چند ادیبوں میں سے ایک ہیں جن کی تحریریں ان کے مصنف کا باآواز بلند اعلان کرتی ہیں۔ اگر خالد کو اپنے موجودہ اسلوب کو ترک کرنے اور آراستہ زبان لکھنے پر آمادہ کر بھی لیا جائے تو وہ ادیبوں کی اس بھیڑ میں گم ہو جائیں گے جن کی تحریریں مصنف کی شناخت نہیں بن سکیں۔ خالد اختر اپنی پہلی تصنیف کی طباعت کے وقت بھی ان متوقع اعتراضات سے آگاہ تھے چنانچہ ناشر کی طرف سے زبان کی اصلاح کے مشورہ پر انہوں نے کہا تھا:

> ''میں تمہاری اس قابل قدر نصیحت پر عمل نہیں کر رہا کیوں کہ ایک مصنف خود اپنا آپ ہی رہنا چاہتا ہے--میرے نزدیک یہی زبان میری دنیا کے عجیب اِسٹماسفیر atmosphere سے عہدہ برآ ہو سکتی ہے۔''

یہی جناتی سٹائل خالد کی پہچان اور شناخت ہے اور کسی کو بھی اپنی شناخت کھونے کا رسک نہیں لینا چاہئے۔

میں اپنے مضمون کا اختتام جابر علی سید کے ان خوب صورت جملوں سے کرتا ہوں:

> ''بیس سال کا ادب خواں کسی لکھنے والے کی تحریر پڑھ کر استفسار کرتا ہے کہ اس نے کیا لکھا ہے؟ بیس سال کے بعد وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس نے کس طرح لکھا ہے اور کیوں لکھا ہے؟ لیکن یہ تینوں سوال خالد اختر کی تحریروں کی بے پناہ تازگی کی دمبدم ابھرتی ہوئی موجوں میں مدغم ہو جاتے ہیں۔''

سید ضمیر جعفری

برصغیر کی شگفتہ و شاداب شخصیت پر جناب رسول احمد کلیمی کا شگفتہ و شاداب مضمون!

یوں تو بیسویں صدی کا ہر سال ہی اپنے اندر کوئی نہ کوئی کمال رکھتا ہے' لیکن 1916ء میں کمال و ملال کا ملا جلا رجحان پایا جاتا ہے۔ اسی سال قائداعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ ٹی ای لارنس نے ترکوں کے خلاف عربوں کی بغاوت کا بیج بویا اور اتحادیوں نے عثمانی سلطنت کے بٹوارے کا نقشہ ترتیب دیا۔ گریگوری راسپوتین کو قتل کر دیا گیا اور ہیرالڈ ولسن' موسیقار مینوہن اور فرانسواں متراں کی پیدائش عمل میں آئی۔ برطانیہ میں خوبصورت عورتوں کی کثیر تعداد نے مردوں کے لئے مخصوص شعبوں میں پہلی بار ملازمت اختیار کی' مگر اس سے پہلے موضع چک عبدالخالق تحصیل و ضلع جہلم میں عین یکم جنوری کو سید ضمیر جعفری محکمہ محصولات کے ایک محترم افسر سید حیدر شاہ صاحب کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کی زندگی پر اس دلچسپ سال کا اثر ایک محتاط اندازے کے مطابق عمر بھر رہا ہے' اور اس کی ابتدا واقعۂ پیدائش سے ہی ہو گئی۔ یعنی سرکاری ریکارڈ کے مطابق وہ اپنے بڑے بھائی سے صرف دو سال پہلے پیدا ہوئے۔

انہوں نے فوج میں ملازمت کا امتحان دیا تو گروپ ٹاسک میں جو علاقہ رسہ پکڑ کر پھاندنا تھا اسے یوں بے یار و مددگار اتنی بلندی سے پنڈولم کی طرح جھولتی ہوئی حالت میں دیکھا تو ہاتھوں کے توتے حواس کے ساتھ اڑ گئے اور رسہ انہوں نے خود چھوڑ دیا۔ وجہ غالباً یہ تھی کہ ان کا دل شاعر کا' دماغ مزاح نگار کا اور جسم اپنا ذاتی تھا اور ان تینوں میں تناسب کا فقدان تھا۔ بہرحال وہ فوج کی ملازمت میں دو بار شامل ہوئے' ایک بار واپسی کپتانی کے بعد ہوئی اور دوسری بار میجری کے بعد۔ یہ فوج کی ملازمت کا ہی شاخسانہ تھا کہ وہ مشکل کام کرنے اور آسان زبان لکھنے کے عادی ہو گئے تھے۔ 1949ء میں بصد مسرت راولپنڈی سے ایک روزنامہ "بادشمال" نکالا اور بصد ملال اسے اسی سال بند کر دیا۔ پہلی رفیقہ حیات کا انتقال عالم جوانی میں ہوا۔ 1951ء میں پنجاب اسمبلی کا الیکشن لڑا لیکن سیاست اور ضمیر میں جو بعد قدیم ہے اس کے سبب سے ناکام رہے اور بقیہ عمر بھی عزت اور وقار سے گزار دی۔

مجھے سید ضمیر جعفری صاحب سے بے حد عقیدت تھی۔ وہ بھی شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ 1983ء سے

1993ء تک میں سعودی عرب میں مقیم تھا۔ وہ جب بھی آتے جدہ میں گویا بہار آ جاتی۔ شعر گوئی کا تو گویا ان کا اپنا انداز تھا ہی' شعر خوانی اور اس کے دوران میں چھیڑ خانی کا بھی ان کا اپنا انداز تھا۔ وہ واحد شاعر تھے جن کے برجستہ جملوں اور رننگ کمنٹری کے سامعین ہمیشہ منتظر رہتے تھے اور اس کا بھر پور لطف بھی اٹھاتے تھے۔ وہ مائیک پر آتے تو انتہائی صلح پسند اور پاکیزہ ماحول کے پنڈال میں بھی بھونچال آ جاتا۔ سامعین کے جذبات پر قابو پانے کے لئے ضروری ہو جاتا کہ یا تو ایک دو شاعروں کی قربانی دی جائے یا پھر ایسے شاعر یا شاعرہ کو دعوت دی جائے جو اپنے حسن' انداز اور آواز سے کچھ اور ہی قسم کے جذبات کو برانگیختہ کر دے۔ آخری دنوں میں وہ کراچی میں رہے تو اکثر ملاقاتیں رہیں۔ وہ امریکہ گئے تو ان کی خیریت اور ناسازی طبع کا احوال احباب کے ذریعہ پہونچتا رہا۔

جب ان کی برسی کے حوالے سے ان پر چند سطریں لکھنے کا مرحلہ درپیش ہوا تو میں نے ریجنل چیف ایگزیکٹو' نیشنل بینک آف پاکستان اسلام آباد سے فرمائش کی کچھ ضمیر جعفری کے حوالے سے اس تاریخی جگہ کے بارے میں اردو میں احوال لکھ بھیجیں جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ جواب میں چیف منیجر سول لائنز برانچ جہلم کی رپورٹ کی ایک کاپی بذریعہ فیکس' دوسری براہ راست بذریعہ ڈاک اور تیسری بتوسط ریجنل چیف اسلام آباد بذریعہ کوریئر سروس موصول ہوئی۔ ذیل میں اس کا تھوڑا سا حصہ نقل کیا جاتا ہے۔

''جناب کا حکم بذریعہ ریجنل چیف صاحب بسلسلہ جناب ضمیر جعفری صاحب موصول ہوا۔ ساتھ یہ تاکید بھی موصول ہوئی کہ یہ بات یاد رکھی جائی کہ رپورٹ متعلقہ بزبان اردو ہو اور انگریزی سے حتی الامکان پرہیز کیا جائے۔ اور یہ کہ رپورٹ بینک کی دیگر رپورٹوں کی طرح نہ مرتب کی جائے یعنی رپورٹ بالکل صحیح اور غیر جانب دارانہ ہونی چاہئے اور جائے وقوعہ کا بقدم خود معائنہ کر کے تیار کی جانی چاہئے۔ چنانچہ اس کی تیاری میں دو اشخاص سے مدد لی گئی۔ ایک جناب کے دوست کرنل عاشق حسین آسی ہیں جو کافی عرصہ کراچی میں رہنے کے باوجود علاقے میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور ابھی تک معززین میں شمار ہوتے ہیں۔ اور دوسرے راجہ محمد جاوید صاحب ہیں جو شہر ہٰذا کے گورنمنٹ ہائی سکول کے ٹیچر ہیں اور کم عمری سے ہی بینک میں ملازمت اور جناب سے ملاقات کے مشتاق ہیں۔ یہ اردو اور پنجابی میں ایم اے ہیں۔ کرنل مذکور نے میرے ساتھ علاقہ کا سفر اور معائنہ فرمایا اور راجہ مذکور نے رپورٹ ہٰذا بزبان اردو سلیس مرتب کی۔

آپ کے ممدوح محترم کا نام سید ضمیر جعفری ہے وہ چک عبدالخالق میں پیدا ہوئے۔ اس نام کے اور کتنے افراد چک مذکورہ میں پیدا ہوئے اس کا علم نہیں ہو سکا۔ چک عبدالخالق دینہ سے تقریباً چار کلومیٹر اور جہلم سے چوبیس کلومیٹر دور ہے۔ یہ منگلا جانے والی سڑک سے بذریعہ سید ضمیر جعفری روڈ منسلک ہے۔ یہ سڑک پختہ اور ہموار ہے جس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ میری گاڑی جو بینک نے سات سال پہلے دی تھی اتنی خستہ حالی اور طویل العمری کے باوجود اس سڑک پر بخوبی چلتی رہی۔ سڑک کو مرمت کی ضرورت نہیں لیکن اس کار کی تبدیلی کی طرف توجہ فرمائی جائے۔ چک مذکور خود ضمیر جعفری صاحب کے بقول اس وقت سے موجود ہے جب دریائے جہلم

تو تھا مگر ضلع جہلم نہیں تھا۔ ایک روایت کے مطابق اس کی بنیاد شیر شاہ سوری صاحب کے زمانے میں پڑی تھی۔ جو کہ پولو کے مشہور کھلاڑی تھے اور ان کی موت بھی اسی کھیل کے سبب سے ہوئی تھی۔ ضمیر جعفری صاحب کے جد امجد محترم عبدالخالق شاہ صاحب تھے جن کے اسم گرامی سے یہ چک موسوم ہے۔ چک مذکور علاقے کے تمام چکوں اور تحصیلوں میں معزز ترین ہے۔ اس میں پڑھے لکھے لوگوں کی کثیر تعداد ہے۔ بے شمار ڈاکٹرز، انجینئرز، اعلیٰ سرکاری افسران اور لیکچران اور پروفیسران کی آبادی اس چک میں اب بھی موجود ہے۔ کل آبادی ایک ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ اس علاقے نے نامور شخصیات پیدا کی ہیں جن میں سید ضمیر جعفری صاحب کے دو بیٹے میجر جنرل احتشام ضمیر اور امتنان ضمیر بھی شامل ہیں جو بالترتیب کراچی اور نیویارک میں مقیم ہیں۔ چک مذکور میں زرعی قرضہ جات اور چھوٹے قرضہ جات کی قطعی کوئی گنجائش نہیں۔ اس چک میں کسی فرد کے ذمے بینک کا کوئی قرض واجب الادا نہیں اور یہاں بینک کے نادہندگان یا NAB کو مطلوب افراد میں سے کوئی نہیں رہتا۔ دراصل ضلع جہلم میں زیادہ خاندان فوجیوں کے ہیں اور عجب بات ہے اس ضلع کے فوجی قرض لے کر ادا کر دیتے ہیں حالانکہ جیسا کہ جناب کے علم میں ہوگا عرصہ ڈیڑھ سال سے ملک پر ان کی حکومت ہے۔ رپورٹ ہٰذا کے لئے تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ جناب کی جگہ پر بھی کوئی فوجی افسر تعینات کیا جا رہا ہے۔ اس رپورٹ کو پڑھنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ اگر تاکید کی جائے تو بینک افسران بالکل درست رپورٹیں بھی تیار کر سکتے ہیں۔

جو لوگ سید ضمیر جعفری صاحب سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ ایک ہمہ صفت اور ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ وہ بیک وقت شاعر، ادیب، صحافی، فوجی، سرکاری افسر، انجمن ساز، سیاست دان، سیاح اور تذکرہ نویس تھے۔ اور ان سب کے باوجود وہ ایک بہترین اور بے مثال انسان تھے۔ انہیں زبان و بیان و خیال کو قابو میں رکھنے کا فن آتا تھا۔ انہوں نے مزاحیہ نثر و نظم اس سادگی، بے تکلفی اور سہولت سے تحریر کئے ہیں کہ مبتدی کو مزاح نگاری سہل نظر آنے لگتی ہے۔ یہی ان کا کمال تھا۔ اور اس کمال میں نہ کوئی ان کا ثانی ہے اور نہ مدمقابل۔

انہیں علامہ اقبال کی طرح حصول علم کے ابتدائی برسوں میں ہی مولوی میر حسن جیسی کوئی صاحب علم شخصیت نہیں ملی، لیکن اسلامیہ کالج لاہور میں 1936ء اور 1938ء کے دوران میں خواجہ دل محمد ایم اے جیسے ریاضی دان اور علامہ عبداللہ یوسف علی جیسے مترجم قرآن شخصیات کی شاگردی نصیب ہوئی۔ اسی عرصے میں وہ اختر شیرانی کی خدمت میں بھی حاضر ہوتے رہے۔ مقام تعجب ہے کہ وہ ہر تین شخصیات کی معروف وجوہات شہرت سے ممکنہ حد تک محفوظ ہے (سوائے شاعری کے) اور ماشاءاللہ طویل عمر بھی پائی۔

سید ضمیر جعفری صاحب ایک بے انتہا اور بے تکان سچے انسان تھے۔ 1943ء میں انہوں نے لکھا کہ

بلغ الدین در دلِ اندرونِ جان می رقصد
محمد خان جب رقصد علی الاعلان می رقصد

دوسرے مصرعے کی سچائی کا اندازہ 1967ء میں بجنگ آمد پڑھ کر ہوا اور پہلے مصرعے کی صداقت کا علم اس وقت ہوا جب میں اور شاہ بلیغ الدین صاحب 71-1970ء کے دوران وزارت صنعت' حکومت پاکستان کے ایک ہی محکمے میں ملازم تھے۔

انہوں نے اپنی ڈائری میں 16 دسمبر 1950ء کی شب چٹاگانگ کے ایک مشاعرہ کا حال لکھتے ہوئے بیان کیا ہے کہ سول سروس کے ایک نوجوان افسر الطاف گوہر نے ایک دھیمے لہجے کی نظم سنائی اور داد دینے والوں میں بالکل پیچھے بیٹھے ہوئے ان کے گورے چٹے ساتھی آفتاب احمد خان کی آواز سب آوازوں سے الگ اور سب سے اونچی تھی-- میرے محترم بزرگ آفتاب احمد خان صاحب کے لئے یہ بات آج بھی اسی طرح درست ہے چاہے وہ متحمل شور وشغب پچھلی نشستوں پر ہوں یا متانت طلب اگلی نشستوں پر ان کے برجستہ اور پرشور جملے اور قہقہے محفل کا لطف دوبالا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح 30 اپریل 1945ء کی شب راولپنڈی کے ایک مشاعرے کا احوال لکھتے ہوئے انہوں نے مولانا فضل الحسن حسرت موہانی کا تذکرہ جس والہانہ انداز میں کیا ہے وہ خود محبت وعقیدت کا ایک شاہ کار ہے۔ لکھتے ہیں '' مولانا کو مسٹر اسسٹنٹ ڈپٹی کمشنر راولپنڈی خود اسکارٹ escort کر کے اسٹیج پر لائے۔ ہم نے اپنی زندگی میں پہلی بار کسی انگریز ڈپٹی کمشنر کو کسی دیسی شخص کی پیشی میں اردلیوں کی طرح چلتے دیکھا'' -- قائداعظم اور قائد ملت کے بارے میں ان کی چند سطریں طویل تاریخی دستاویزات پر بھاری ہیں۔ سقوط حیدر آباد پر ان کی نوحہ خوانی دل سوزی وجادو بیانی کی تصویر ہے۔

میری نظر میں وہ اس عہد کے واحد مزاح نگار ہیں جنہوں نے مستند سچائی کو قلم بند کرنے کے معروف فن کو تاریخ اور تذکرہ نویسی کی حدود سے نکال کر ادب اور شاعری کی قلمرو میں شامل کر لیا ہے۔

آج ان کی دوسری برسی کے موقع پر میں وہی الفاظ دہراؤں گا جو انہوں نے 4 دسمبر 1950ء کو ڈاکٹر تاثیر کے لئے لکھے تھے'' ان کی موت ادب وفن کے لئے ایک عظیم حادثہ ہے۔ یہ خلا مشکل سے پورا ہوگا۔ یہ شخص ایک تحریک تھا' ایک انجمن تھا اپنی ذات میں۔ عہد ساز' کتنی جلدی اٹھ گیا۔ اردو ادب کی رونق جاتی رہی۔ ایک بڑا روشن ستارہ ٹوٹ گیا۔''

ساتھ ہی میں یہ جملہ بھی دہراؤں گا کہ

''Let us not overmourn the death of Mr. Zamir Jafary, we should rather be happy that such a man was alive during our life time.''

راہرو دانش و طریقت
حفیظ جالندھری (۱)

حیدر طباطبائی

حفیظ جالندھری کی شاعری سے جو انسانی کردار ابھرتا ہے اس میں بے پناہ طاقت اور حوصلہ ہے۔ ان کی نظموں، غزلوں اور گیتوں میں جو ترنگ اور سرمستی ہے وہ لافانی ہے۔ حفیظ کی شاعری میں انسانی سماج کو عشق کا سلیقہ سکھانے اور درس عاشقی دیئے جانے کا ایسا عنصر ملتا ہے جو ہمیں موجودہ دور میں رہتے ہوئے انجانے زمانوں کی سیر کراتا ہے۔ ان کی شاعری میں کھری کھری باتوں کے انداز اور استدلال ہیں۔ ایک جانب زمانہ حال کی دانشمندانہ حقیقت پسندی جھلکتی ہے تو دوسری جانب فلسفہ وطریقت کا وہ انتفاع نظر آتا ہے جو ہماری خانقاہوں کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ حفیظ کی شاعری نے اپنے دور کے اجتماعی آہنگ کو اپنانے کے ساتھ نئے رجحانات کو بھی جنم دیا ہے۔ تازہ اور نئے اسالیب بیاں کو فروغ دیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں الفاظ کی نشست اور ترتیب و انتخاب نے زیادہ عشقیہ آہنگ پیدا کر دیا ہے۔

ان کے عام کلام میں بھی کوئی لفظ فی نفسہ ثقیل یا غیر فصیح نہیں ملے گا۔ ان کے یہاں عجمی تلمیحات و استعارات بڑے دلکش انداز میں موجود ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ عام طور پر ادب دوست حضرات حفیظ جالندھری کے غائر مطالعے کی زحمت گوارا نہیں کرتے ہیں۔ اور محض ان کے گنے چنے اشعار کی بنا پر جو زباں زد خاص و عام ہیں، یہ رائے قائم کر لیتے ہیں کہ حفیظ کی شاعری میں سادگی، سلاست درد و خستگی اور اسلامی اقدار کا احترام ہے اور بس!

بعض ادب دوست حضرات کا خیال ہے کہ حفیظ جالندھری کی شاعری میں وہ تسلسل اور برجستگی نہیں ہے، جو جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے کلام میں ہے۔ اس خیال کی بنیاد غالباً اس حسن ظن پر ہے کہ جوش اور فیض کے مزاج میں عاشقانہ دارفتگی اور عشقیہ وارداتوں کے ساتھ ساتھ ایک راہ گم کردہ نعرۂ انقلاب بھی گونجتا نظر آتا ہے۔ فیض صاحب کا انقلابی آہنگ تو ماسکو سے وارد ہوا تھا۔ مگر جوش ملیح آبادی اپنے نعرۂ انقلاب میں خود گم ہو

جاتے ہیں اور کبھی بھی واضح نہ کر پائے کہ مدعا کیا ہے؟ بعد از انقلاب کے سلسلے میں عام ترقی پسندوں کے یہاں ابہام ملتا ہے۔ جوش صاحب بھی اس سے مبرا نہیں ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ انقلاب مقصود بالذات کے علاوہ آنے والے دور کی دھندلی سی ایک تصویر بھی نہیں دکھاتا ہے۔ حفیظ کے یہاں انقلاب کی گرما گرمی کے بعد کے معاشرے کا بھی تصور ملتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے ایرانی دانشوروں' فارسی شعرا کے علاوہ بیشتر علمی ضیا علامہ اقبال سے حاصل کی ہے۔ اسلامی تعلیمات ان کی رگ و پے میں اس طرح سمائیں کہ وہ اپنے خون میں دوڑنے والے راجپوتی غرور سے ہی دستبردار ہو گئے۔

''میرا خاندان تقریباً دو سو برس پیشتر چوہان راجپوت کہلاتا تھا۔ میرے بزرگ ہندو سے مسلمان ہو گئے اور پاداش میں اپنی املاک وغیرہ کھو بیٹھے۔ البتہ سورج بنسی ہونے کا غرور مسلمان ہونے کے باوجود رہا۔ میری ذات تک پہنچ کر یہ غرور ختم ہو گیا۔''

نگار' لکھنؤ' غزل نمبر 1942ء

اس مختصر تحریر سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حفیظ جالندھری کی ذات میں جو فرہنگ ہنر' علم و دانش' ادبی حرفت' تعلیم و تربیت اور طرز فکر ہے وہ سب ان کے آثار علمی و ادبی کا منبع اور دین مبین اسلام کا عطیہ ہے۔ علاوہ برایں ان کا معرکتہ الآرا نازش کمال فن پاکستان کا قومی ترانہ ہے جس کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ کسی ایرانی شاعر نے اردو کا مزاج اور آہنگ سیکھ کر یہ ترانہ لکھا ہے۔ آپ قومی ترانے کو غور سے بار بار پڑھئے' نتیجہ یہ ضرور نکلے گا کہ اردو زبان کا مروجہ استعمال نہیں ہوا ہے۔ اصل میں اردو کا صرف ایک لفظ ضرور ملتا ہے' ورنہ پورا ترانہ صرف فارسی الفاظ کی نشست و برخاست سے ترتیب دیا گیا ہے۔ مگر پھر بھی یہ عام فہم اور مقبول ہے۔ اردو شاعری میں فارسی زبان کا یہ ادبا نادر استعمال ہے' جو بڑے بڑوں کو نصیب نہ ہو سکا۔

پورا ترانہ پاکستان کل ستاون الفاظ پر مبنی ہے۔ جس میں صرف ایک لفظ اردو زبان کا ہے۔ لیکن شاعر کا معراج کمال یہ ہے کہ فارسی کا ہر ہر لفظ آشنائے زبان اردو ہے۔ کسی لفظ کے معنی دریافت کرنے کی ضرورت نہیں اور اس ترانے سے معلوم ہوا کہ ایک باعظمت قوم کا ملی ترانہ لکھنا جو شوکت اور جلالت سے بھرپور ہو' ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ حفیظ نے اردو شاعروں و ادیبوں کو فارسی کی آمیزش کا سلیقہ ہی نہیں عطا کیا بلکہ درس دیا ہے۔ ان کے کلام میں جس لطیف چاشنی کے ساتھ فارسی الفاظ ملتے ہیں وہ ہمارے بعض نمایاں اساتذہ کو بھی میسر نہیں ہیں۔ اسلامی آداب کو نبھانا ہی ان کا نصب العین تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ شاعرانہ شوخیوں میں حافظ اور خاقانی کے انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ حفیظ نے نصف صدی سے زیادہ مدت تک شاعری کی' وہ نظم غزل اور گیت کے یکتائے روزگار اساتذہ کی صف میں شامل ہیں۔ ان کے کلام میں فارسی تراکیب نہایت دلکش اور نئی سج دھج کے ساتھ ملتی ہیں۔ یہ انداز کبھی غالب اور مومن نے اختیار کیا تھا۔ ان کی غزلوں میں وہ ساری رستاخیزی ہے جو کلاسیکی غزلوں میں ہونا چاہئے۔ زبان کا خاص لحاظ ملتا ہے شوخی ضرور ہے لیکن پھکڑ پن نہیں ہے۔ رنگینی ہے لیکن

بازاریت' نہیں ہے۔ سرمستی بھی شائستگی کے ساتھ ہے۔ دبستان لکھنو جو شعر و ادب کا ہمیشہ مرکز رہا ہے جہاں سے اقلیم سخن کی راہوں کا تعین ہوتا ہے اس حوالے سے حفیظ کی زبانی ایک واقعہ سن لیں:

''میں دسمبر 1921ء میں پہلی بار لکھنو گیا تھا اور مولانا شرر لکھنوی کے یہاں ٹھہرا تھا۔ انہیں دنوں ہمدم کے ایڈیٹر جالب دہلوی کے دفتر میں ایک مشاعرہ ہوا۔ عزیز لکھنوی مجھے باصرار لے گئے اور مشاعرے میں تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ اب ایک پنجابی کی اردو غزل سنئے۔ یہ غزل مشاعرے کی یادگار ہے۔'' (حفیظ)

ہے قفس میں جو ازل ہی سے نشیمن میرا
منہ تکا کرتی ہے برف شرر افگن میرا
دیکھ اے رحمت حق میرے گلے سے نہ لپٹ
میں گنہگار ہوں آلودہ ہے دامن میرا
کب سے پابند قفس ہوں مجھے معلوم نہیں
شاخ سدرہ پہ کسی دن تھا نشیمن میرا
روح کو خاک کے دامن میں لئے پھرتا ہوں
میرا قالب ہی حقیقت میں ہے مدفن میرا
گردن غیر میں ہیں ہاتھ حمائل ان کے
ہاں گلا گھونٹ کمندِ رگِ گردن میرا
جانب کعبہ تو چلتا ہوں مگر یا اللہ
بت کدہ میرا! صنم میرے! برہمن میرا!!!
نہ لگاؤ ہے کسی سے نہ مجھے لاگ حفیظ
دوست میرا کوئی دنیا میں نہ دشمن میرا

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب لکھنو کی مسند ادب پر صفی' عزیز' ثاقب' آرزو' یاس یگانہ چنگیزی' فانی' چکبست' اثر لکھنوی' ملا' جوش ملیح آبادی' جگت موہن لال رواں وغیرہ متمکن تھے۔ اور حفیظ نے ادبی' علمی' لسانی لحاظ سے معرکتہ الآرا غزل پڑھ کر بساط ادب پر اپنا نام ثبت کروالیا۔

اردو میں غزل کا تحفہ بھی فارسی والوں سے آیا' اسی وجہ سے ہماری غزلوں میں بہت سے رمز یہ کنایہ اور اشارات فارسی ہی سے ماخوذ ہیں۔ ایک طولانی عرصے تک ان اشارات کا استعمال محض تقلیدی رہا ہے۔ اس میں تخلیقی شان عنقا رہی۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اردو شعرا کے تجربے کی محدودیت ہے۔ حفیظ کی غزل بھی ہیئت کے اعتبار سے روایتی غزل ہے لیکن اس روایتی سانچے میں خیال و احساس کی ندرت نے ان کو ایک الگ مقام عطا

کرتی ہے۔ یہاں بھی یعنی صنف غزل میں جو انسانی کردار ابھرتا ہے وہ شعور ذات میں یکتا' موت کے مقابلے میں زندگی سے سرشار اور خواب کے مقابلے میں زندگی کا ساتھ دینے پر مجبور کرتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حفیظ کی غزل میں انفرادی احساس کے بجائے اجتماعی احساس نہایت ہی محرک جذبات کے ساتھ نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ وہ زندگی میں نہایت جرت مند اور برہنہ گفتن شخص تھے اور اپنے فن میں بھی۔

دیکھا جو کھا کے تیر کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

کچھ محتسب کا خوف ہے کچھ شیخ کا لحاظ
پیتا ہوں چھپ کے دامنِ ابر بہار میں
وہ سامنے دھری ہے صراحی بھری ہوئی
دونوں جہاں ہیں آج مرے اختیار میں

اردو میں فارسی تراکیب کا سہرا تو حفیظ کیا کسی کے سر نہیں باندھا جا سکتا تاہم حفیظ نے جس حسن خوبی سے فارسی اور اردو کی پیوند کاری کی ہے اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کو ہر دو زبانوں پر قیامت کا ملکہ حاصل تھا اور اب یہ انداز پھر مدھم ہو رہا ہے۔ یہاں حفیظ کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں۔

فارسی تراکیب:

وہ عندلیب گلشنِ معنی ہوں میں حفیظؔ
سوزِ سخن سے آگ لگا دوں بہار میں

یہ خوب کیا ہے یہ زشت کیا ہے' جہاں کی اصلی سرشت کیا ہے
بڑا مزہ ہو تمام چہرے اگر کوئی بے نقاب کر دے

بصد اندازِ یکتائی بغایتِ شانِ زیبائی
امیں بن کر امانت آمنہؓ کی گود میں آئی

موت نے کس امید پر سونپ دیئے ہیں بحر و بر
مشتِ غبار ہے بشر' مشتِ غبار کیا کرے

ہاں میرے مجروح تبسم خشک لبوں پر آتا جا
پھول کی ہست و بود یہی ہے' کھلتا جا مرجھاتا جا

حفیظ کی گیت نگاری:

وہ اردو ادب میں گیتوں کے امام نہیں بلکہ مجدد ہیں۔ حفیظ نے ہندی' بھوجپوری' پوربی' کھڑی بولی وغیرہ کے چنگل سے اردو گیت نگاری کو آزاد کر کے گیت جیسی نازک صنف سخن کو فارسی تراکیب میں پیش کیا۔ گیت نگاری میں دو نام بہت مشہور ہیں عظمت اللہ خاں اور میرا جی۔ لیکن حفیظ نے سبک ہندی سے غزلوں ونظموں کی طرح گیتوں کا بھی رخ موڑ کر فارسی کی طرف کر دیا۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اب تک اردو گیتوں میں جب تک یہ الفاظ نہ ہوں چپے' یاتری' پونم' سوریہ' چندراما' برکھا' شیام' کومل' موہن' جوبن' دھرتی' شیتل' آنگن' رُت' برہا' ملاپ' سکھی' سندر' اندھیاری' گھٹا' باس' رین وغیرہ وغیرہ۔ ان متروک وغیر متروک الفاظ کو نکال کر یایوں کہئے کہ اس جھاڑ جھنکاڑ سے چمن کو صاف کر کے حفیظ نے گیتوں کا جو نیا گلستاں تعمیر کیا ہے وہ ایک نئی راہ اور آبرو مندانہ طرز ہے۔ حفیظ کے کلام میں فارسی کی لطیف آمیزش جگہ جگہ ملتی ہے۔ اس حوالے سے ان کی انفرادیت کا احاطہ ابھی تک نہیں کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

آموں کے نیچے
ڈالے ہیں جھولے
دو پیکروں نے سیمیں تنوں نے
برف افگنوں نے
گیت ان کے پیارے میٹھے رسیلے
ہلکی صدائیں سادہ ادائیں
گل پیرہن ہیں غنچہ دہن ہیں
خود مسکرانا خود منھ چڑانا
پھر جھینپ جانا
الھڑ پنے سے
آموں کے نیچے ڈالے ہیں جھولے

ایک دوسرا گیت جس کا عنوان ہے ''تیری منزل دور'' اس کے چند اقتباس پیش ہیں:

مناظر آب وگل سے
تیری منزل دور
مسافر

تیری منزل دور
نظارے اس آب گل کے
رہزن ہیں تیری منزل کے
نغمہ ہو یا رنگ گل ہو
سب پردے ہیں نگاہ و دل کے
تو ہے طالب نور
مسافر
تیری منزل دور
لیلیٰ کی محفل سے نکل جا
شیریں کی محفل سے نکل جا
حسن و ادا دونوں کے در پہ
دل روکے تو دل سے نکل جا
دل سے نہ ہو مجبور
مسافر
تیری منزل دور
جس میں نہ ہو چلنے کا یارا
وہ کر لے جنت کو گوارا
شیخ کو لینے دے یہ سہارا
یہ بے چارہ ضعف کا مارا
حور سے ہے مسحور
مسافر
تیری منزل دور
راہ میں حائل کوہ سینا
جس کی چوٹی پہلا زینہ
دل آئینہ ہے تو تجھ پر
جھلکیں گے انوار مدینہ
تجلیوں میں مستور

مسافر

تیری منزل دور

حفیظ کے پاس ہندی کے مقابلے میں جس حسن سلیقہ سے فارسی یا اردو کے متوازن الفاظ ہیں' وہ ان کو ان کے عہد کے دوسرے شعرا سے جداگانہ انفرادیت اور شعور کی پختگی کے نشان گر ہیں۔ یہ سلیقہ ہی ان کا اسلوب بن گیا۔ جس کی وجہ سے ان کے گیتوں کی مترنم نغمگی میں بھی ان کا لب ولہجہ کہیں دب نہیں پایا۔ ان کے تجربات اور ادراک نے ان کو وہ جلا بخشی ہے کہ ان کے گیتوں کے مینا بازار میں ابدیت کے عناصر ملتے ہیں۔ جب آدمی نے چاند پر قدم رکھا تو بہت سے شعرا نے بہت کچھ لکھا۔ لیکن حفیظ نے انسانی دل سے چاند پر آباد ہونے والی خواہش سے عجب سوال کیا ہے:

عطر بیز لالہ زار

نغمہ ریز جوئے بار

حشر خیز آبشار

کیف موج بے قرار

چاندنی میں کہسار

تھا بہار در بہار

میں یہ شانِ کردگار

دیکھتا چلا گیا

(چاند کی سیر)

گیتوں میں سیاست وطنزیہ اشارے بہت مشکل کام ہے۔ جب حفیظ پہلی بار انگلستان آئے تو یہاں آباد ہم وطنوں سے مل کر ایک حساس دل شاعر کو بہت صدمہ ہوا' کہ یہ لوگ "فرنگی" فریب کے دام میں اس طرح سے پھنس چکے ہیں کہ اپنی زبان' ادب وثقافت سے بہت دور جا چکے ہیں۔ شاعر اپنے محسوسات کو حقیقت بنا کر شعری قالب میں ڈھالنے میں اگر کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا کلام دل پر اثر کرتا ہے۔ حفیظ نے ہم وطنوں کو مخاطب کر کے وطن واپس آنے کی درخواست کی ہے۔ جو نہایت اثر انگیز اور برمحل ہے۔ اصلی شاعری بھی وہی ہے جس سے جذبات کے اظہار میں انسانی فطرت کا اتباع لازمی ہے۔ حفیظ کے گیت ونظمیں مقتضائے مقام کے موافق ہیں۔ ان کے اجزا میں تضاد نہیں ہے۔

اپنے وطن میں

سب کچھ ہے پیارے

رشکِ عدن ہے باغ وطن بھی

گل بھی ہیں موجود گل پیرہن بھی
نازک بدن بھی غنچہ دہن بھی
لیلیٰ روش بھی شیریں سخن بھی
کچھ کم نہیں وہ
اجڑا چمن بھی
اس کے بھی اک بار کر لے نظارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے
حسن و نظر کی خاموش گھاتیں
عشق و ہوس کی دھومیں براتیں
سب ہیں وہاں بھی یہ وارداتیں
دولہا دلہن جب
کرتے ہیں باتیں!
ہنستی ہیں کلیاں کھلتے ہیں تارے
اپنے وطن میں
سب کچھ ہے پیارے

ہیئت واسلوب کے ضمن میں حفیظ اردو گیتوں کو نیا انداز عطا کرنے والے شاعر ہیں۔ ویسے تو ان کی تمام شاعری کی ایک جرات مندانہ اقدام کہا جا سکتا ہے۔ ان کا لہجہ گیتوں میں نمایاں ہے۔ پیچیدہ' گہرے اور علامتی انداز کے لئے ان کے گیت اردو شاعری پر بہت زیادہ اثر ڈالتے ہیں۔ ان کے گیتوں کے مزاج کی عاشقانہ وارفتگی اور جرات گفتار سے میرا جی اور راشد نے بھی اپنی نظموں میں بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ اس طرح سے حفیظ کو ہیئت واسلوب کے ضمن میں ایک اہم کڑی سمجھنا غلط نہ ہوگا۔ پرانی بات کو نیا بنا کر استادانہ زیرکی سے پیش کرنا' کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ کام غزل گوشعرا کے یہاں ہوتا چلا آیا ہے۔ لیکن حفیظ نے گیتوں میں جس موضوع کو چھوا ہے اس میں نئی بات ملتی ہے۔ کہیں بھی دل شکستگی کا انداز نہیں' معصوم سی شرارتوں میں ہلکا ہلکا درد اور حوصلہ بھی ہے جو تعمیری ہے:

جاگ سوز عشق جاگ
پھر اسی اٹھان سے تیر اٹھے کمان اٹھے
صبر کی زبان سے شور الامان اٹھے

جاگ اٹھیں دلوں کے بھاگ
جاگ سوز عشق جاگ

....

لو پھر بسنت آئی پھولوں پہ رنگ لائی
چلو بے درنگ
لب آب گنگ
بجے جل ترنگ
من پر امنگ چھائی پھولوں پہ رنگ لائی
کوئی گرم خیز
کوئی نغمہ ریز
سبک اور تیز
پھر ہو گیا ہے زندہ باغوں کا ہر پرندہ
کھیتوں کا ہر چرندہ

....

گیتوں سے عام طور پر مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ ہجر اور وصال کی حکایات یا تہواروں اور موسموں کا پر ترنم ذکر۔ حفیظ نے بتایا کہ فن کار پر کبھی پیری نہیں آتی اس کا محبوب' اس کا تخیل اور تفکر ہمیشہ جوان رہتا ہے۔ حفیظ نے اس موضوع پر قلم توڑ دیا ہے۔ ان کا یہ گیت' اندوختہ ادب میں اضافہ ہے:

سبو اٹھا پیالہ بھر پیالہ بھر کے دے ادھر
چمن کی سمت کر نظر سماں تو دیکھ بے خبر
افق پہ ہو گئیں عیاں
وہ اک ہجوم میکشاں
ہے سوئے میکدہ رواں
یہ کیا گماں ہے بدگماں سمجھ نہ مجھ کو ناتواں
خیال زہد ابھی کہاں
ابھی تو میں جوان ہوں
حسین جلوہ ریز ہوں ادائیں فتنہ خیز ہوں
ہوائیں عطر بیز ہوں تو شوق کیوں نہ تیز ہوں

نگار ہائے فتنہ گر
کوئی ادھر کوئی اُدھر
ابھارتے ہوں عیش پر
تو کیا کرے کوئی بشر
چلو جی قصہ مختصر تمہارا نقطۂ نظر
درست ہو تو ہو مگر
ابھی تو میں جوان ہوں

(جاری ہے)

ظفر اقبال

خواب پر زور کی بارش ہوئی، اور پھول جھڑے چاروں طرف
رنگ ہی رنگ دھڑکتے تھے ان آنکھوں میں پڑے چاروں طرف

دھوپ لاچار ہوئی، اور سمٹنے لگی رفتہ رفتہ
دوپہر موج میں آئی ہے تو بادل سے چڑھے چاروں طرف

آ کے دیکھا تو کوئی چھاؤں کی خوشبو سی رواں تھی ہر سو
پیڑ موجود رہے تھے یہاں چھوٹے نہ بڑے چاروں طرف

تیز رفتار ہوا بھی تھی اندھیرے کی فصیلوں سے الگ
شام نے آ کے چمکدار ستارے بھی جڑے چاروں طرف

وسط میں کس لئے محفوظ رہا ہوں ہر اک خطرے سے
دشمنوں سے مرے کون آ کے دھواں دھار لڑے چاروں طرف

میں ہی چپ، اور اکیلا تھا بدستور وہاں پر، ورنہ
لفظ، اور لوگ تھے ہر وقت اسی طرح کھڑے چاروں طرف

تُو بھی موجود تھا، اور سب تری رعنائیاں بھی شام و سحر
پھر بھی مجھ پر کوئی آئے ہوئے تھے وقت کڑے چاروں طرف

خُود ہی گر جاؤں گا اللہ نے چاہا تو کسی کے اندر
میں نے اوروں کے لئے کھود رکھے ہیں جو گڑھے چاروں طرف

ہُوں وہ روکا ہوا پانی کسی سفاک وڈیرے کا، ظفر
مجھ سے آگے ہیں سبھی کھیت یونہی سوکھے پڑے چاروں طرف

*

ظفر اقبال

خواب کی کوئی خامشی ہے مری صدا سے جڑی ہوئی
وہیں ایک لہر ہوا کی ہے کسی بے ہوا سے جڑی ہوئی

اگر ابر و باد ہیں مختلف تو یہ دھوپ چھاؤں بھی اور ہے
کسی اور طرح کی یہ فضا ہے مری فضا سے جڑی ہوئی

یہ جو دل میں پھول سے کھل رہے ہیں، نظر میں رنگ ہی رنگ ہیں
کوئی، ہو نہ ہو، مری تار ہے کسی خوشنما سے جڑی ہوئی

اسی پل پلٹ گئی خوشگوار بنا کے موسمِ ہجر کو
جو بدن کی ایک بہار سی تھی کہیں قبا سے جڑی ہوئی

مرے عرصۂ شب و روز میں تھی ہر ایک شام اسی طرح
کوئی سُو بہ سُو سے ہٹی ہوئی، کوئی جا بجا سے جڑی ہوئی

مری طبعِ خام کی ایک سمت کہ میری بے خبری میں ہے
کہیں ماسوا سے کٹی ہوئی، کہیں ماورا سے جڑی ہوئی

میں خود آپ دونوں کے درمیاں ہوں برائے نام سا رابطہ
کہ یہ ابتدا ہے بجائے خود کسی انتہا سے جڑی ہوئی

وہ زمانہ ہے کہ یہاں کسی سے کسی کا پردہ نہیں رہا
کہ ہر ایک چیز چھپی ہوئی بھی ہے برملا سے جڑی ہوئی

ظفرؔ ایک آدمی کا تو کام یہ ہے نہیں کسی طرح سے
کسی اور کی بھی فغاں ہے جیسے مری نوا سے جڑی ہوئی

ظفر اقبال

غمِ زلفِ سیہ میں اس دلِ رنجور کا گھلنا
ہو جیسے صبحِ کاذب میں شبِ دیجور کا گھلنا
نظر آتا نہیں اور خلق پر ظاہر بھی ہے اب تو
خود اپنی ہی چمک سے اس مہِ مستور کا گھلنا
جھجکتے اور شرماتے وہ اس کا بوسۂ اول
لرزنا، اور پھر، منہ میں بڑے انگور کا گھلنا
سیاہی اور سفیدی کی ہم آغوشی سے اس لمحے
وہ گاڑھی تیرگی میں اک ضیائے نور کا گھلنا
گھلاوٹ تھی کسی بیتی ہوئی بے نام خواہش کی
عجب تھا ذائقے میں آج موتی چور کا گھلنا
اس آمیزے سے کوئی اور ہی صورت نکل آئی
کسی گمنام کے اندر کسی مشہور کا گھلنا
اب آنکھوں کی بجائے دل سے رونے لگ گیا ہوں میں
مری نظروں میں ہے دن رات اِس ناسور کا گھلنا
اندھیرے اور اجالے کی ہے آویزش وہی اب بھی
ازل سے جاری و ساری ہی شمعِ طور کا گھلنا
فراق و وصل دونوں میں، ظفرؔ، میرا زیاں ہے اب
مجھے معدوم کر دے گا قریب و دور کا گھلنا

*

ظفر اقبال

کچھ ایسا ہے کہ اس کو بے سبب چاہوں جہاں چاہوں
ترسنے کے لئے وہ گنجِ لب چاہوں جہاں چاہوں

جو خواہش مجھ میں بجھتی اور روشن ہوتی رہتی ہے
ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا ہوں کب چاہوں جہاں چاہوں

کوئی موقع محل ایسا بھی آئے خوابِ ہستی میں
وہ خود بھی چاہتا ہو میں بھی تب چاہوں جہاں چاہوں

اب ایسی رائگانی میں کوئی امکان بھی کیا ہو
جو پھر سے زندہ یہ خاکِ طلب چاہوں جہاں چاہوں

طریقہ چاہیے کوئی، سلیقہ چاہیے کچھ تو
یہ کیا انداز ہے آخر کہ جب چاہوں جہاں چاہوں

کسی کو بھی نہ چاہوں یہ جو ہر سُو لوگ ہیں اتنے
کبھی چاہوں اگر تو سب کے سب چاہوں جہاں چاہوں

حقیقت میں تو میرے چاہنے سے ہی ملے گا کچھ
سو، بہتر ہے کہ چاہوں اور اب چاہوں جہاں چاہوں

کچھ اپنے نالۂ ناپختہ پر ہوں شرمسار اتنا
کہ میں دن بھی کوئی شورِ شب چاہوں جہاں چاہوں

ظفرؔ کیا کیا پرندے پھڑپھڑاتے ہیں مرے اندر
میں ان کو چھوڑتا رہتا ہوں جب چاہوں جہاں چاہوں

ظفر اقبال

موجود بھی رہنا ہے، دکھائی نہیں دینا
میں شور ہوں ایسا کہ سنائی نہیں دینا

ملنا ہی تو ممکن نہیں، مل جائے اگر وہ
پھر اس نے کبھی داغ جدائی نہیں دینا

یہ اس کی ضرورت ہے کہ اس نے ابھی مجھ کو
اس خوابِ تماشا سے رہائی نہیں دینا

دن ہوتے ہی چھا جائیں گے آنکھوں کے اندھیرے
اور، ہاتھ کو بھی ہاتھ سجھائی نہیں دینا

اک یاد کا رکھنا ہے کوئی بوجھ سا دل پر
اس قرض کی فی الحال ادائی نہیں دینا

تحریر کوئی دل سے مٹائی نہیں ممکن
دیوار پہ تصویر لگائی نہیں دینا

بھٹکیں گے ابھی خود بھی بیابانِ ہوا میں
اوروں کو بھی کچھ سمت نمائی نہیں دینا

ڈھونڈا بہت اُس شکلِ جہاں تاب کا ثانی
آخر پڑا اُن ہاتھوں میں آئینہ ہی دینا

ہوں ایک پرِ کاہ، ظفرؔ اس لئے اس نے
مجھ کو ہنرِ شعلہ نوائی نہیں دینا

٭

ظفر اقبال

مرے نواح میں دنیا زیادہ ہو گئی ہے
کہ میری تابِ تماشا زیادہ ہو گئی ہے

جبھی تو میرا توازن نہیں رہا ہے درست
کہ میرے دل میں تمنا زیادہ ہو گئی ہے

سہولیات بھی مجھ کو یہاں پہ ہیں حاصل
مگر، مرے لئے بپتا زیادہ ہو گئی ہے

حسد کی آگ جلا کر ہی مجھ کو چھوڑے گی
کہ بجھتے بجھتے یہ الٹا زیادہ ہو گئی ہے

مجھے سفر کی تھکاوٹ نے آ لیا ہے کہیں
کہ آج وسعتِ صحرا زیادہ ہو گئی ہے

کبھی سفینہ الجھنے لگا ہے لہروں سے
کبھی روانیٔ دریا زیادہ ہو گئی ہے

زمیں کی شکل ہی گم ہو چکی ہے چاروں طرف
یہ گھاس اصل میں پیدا زیادہ ہو گئی ہے

سنبھالنے سے سنبھلتی نہیں ہے نعمتِ خواب
یہ جیسے مجھ کو مہیا زیادہ ہو گئی ہے

کمی بھی کرتا رہا ہوں، ظفرؔ، محبت میں
کئی دنوں سے دوبارہ زیادہ ہو گئی ہے

٭

ظفر اقبال

بہت کچھ کہہ چکے تھے ہمزباں ہونے سے پہلے ہی
کبھی احوال ظاہر تھا بیاں ہونے سے پہلے ہی

فلک لگنے لگا تھا ایک دم نیلا نیلا
زمیں چمکی ہوئی تھی آسماں ہونے سے پہلے ہی

تماشا بجھ گیا تھا درمیاں میں کس لئے آخر
طبیعت رک گئی تھی کیوں رواں ہونے سے پہلے ہی

مرا بچپن مری یادوں میں زندہ اس لئے بھی ہے
کہ بوڑھا ہو چکا تھا میں جواں ہونے سے پہلے ہی

ہوائیں چل رہی تھیں اور کی کچھ اور ہی اب کے
وہ مجھ سے خوش نہیں تھا بدگماں ہونے سے پہلے ہی

گزر کر دیکھ بھی آیا ہوں بازارِ تماشا سے
مری قیمت نہیں تھی رائگاں ہونے سے پہلے ہی

پھبن ہی مختلف تھی، اور، چلن ہی اور تھا اس کا
بہت اچھا لگا تھا جانِ جاں ہونے سے پہلے ہی

سمٹ سکتے اگر اتنا بکھر جاتے ہوئے بھی ہم
سنبھل جاتے اگر اتنا زیاں ہونے سے پہلے ہی

ظفرؔ حیرت زدہ ہوں آج تک اس پر کہ میں آخر
وہاں کس طرح جا پہنچا یہاں ہونے سے پہلے ہی

ظفر اقبال

چمکے گا ابھی میرے خیالات سے آگے
وہ نقش کہ تھا داغ ملاقات سے آگے

لگتا ہے کہ مشکل ہے ابھی دن کا نکلنا
ہے رات کوئی اور بھی اس رات سے آگے

اس وہم سے واپس نہیں پلٹا ہوں کہ ہو گا
کچھ اور بھی اس خوابِ طلسمات سے آگے

آرام سے پیچھے وہ ہٹا دیتا ہے مجھ کو
بڑھتا ہوں اگر اس کی ہدایات سے آگے

دورانِ سفر کرتا ہوں آرام بھی، لیکن
ہوتا ہوں ٹھہرنے کے مقامات سے آگے

عقدہ یہی خاطر کوئی ہوتا ہی نہیں حل
ہیں سارے سوالات جوابات سے آگے

آگاہ کیا ہے تو ہوئے اور بھی غافل
واقف جو نہیں تھے مرے حالات سے آگے

ہو سکتا ہے کیا کوئی بھلا اُن کے برابر
رہتے ہیں جو خود اپنے بیانات سے آگے

اتنا بھی بہت ہے جو، ظفر، قحط نوا میں
نکلی ہے کوئی بات مری بات سے آگے

*

ظفر اقبال

بامِ ہوا سے کوئی اشارہ ہے یا چراغ
جھلمل اسی طرح کی دوبارہ ہے یا چراغ

کرنے کو ہے مرے خس و خاشاک میں نمود
پل بھر کو ہی سہی، وہ شرارہ ہے یا چراغ

دل کی منڈیر پر جو کوئی روشنی سی ہے
لگتا ہے یہ بھی خواب ہمارا ہے یا چراغ

چمکی تھی ایک چیز اندھیرے میں جو ابھی
یاقوتِ لب کا کوئی کنارہ ہے یا چراغ

پروانے سے یہ گھومتے، گرتے ہیں چار سو
اور وسط میں خیال تمہارا ہے یا چراغ

پھرتا ہے آسماں کی طرف رات رات بھر
دیکھو ہمارے غم کا غبارہ ہے یا چراغ

اندر کی آندھیوں سے الجھتا ہے جو ابھی
میں سوچتا ہوں، کوئی ستارہ ہے یا چراغ

میں آپ بے خبر ہوں کہ میں نے یہاں کہیں
اک پھول تیرگی میں اتارا ہے یا چراغ

گرمی ہے، اور ایک چکاچوند سی، ظفرؔ
یہ آتشِ سخن کا نظارا ہے یا چراغ

*

ظفر اقبال

پڑا ہوا تھا کسی خوش نما کے ایک طرف
کہ لوگ لے گئے مجھ کو بلا کے ایک طرف

میں درمیاں سے کوئی راستہ نکالتا ہوں
ہوس کی دوسری جانب، ہوا کے ایک طرف

جب ایک دوسرے کے ہم قریب تر پہنچے
تو ہٹ گیا وہ ذرا مسکرا کے ایک طرف

وہ آپ میری پذیرائی کو اٹھا تو سہی
خبر ہی لی نہ پھر اس نے بٹھا کے ایک طرف

ابھی میں اس گل و گلزار کو ترستا ہوں
مری رسائی ابھی ہے قبا کے ایک طرف

وہ ایک بوسہ جو اطراف کو محیط رہا
ملا تو رکھ دیا اس نے اٹھا کے ایک طرف

ہماری اس کی ملاقات ہونے والی ہے
خدائی سے کہیں باہر، خدا کے ایک طرف

اب اس سے آگے مجھے راستہ نہیں ملتا
پہنچ گیا ہوں کہیں ماورا کے ایک طرف

ابھی رہے گی یہ بیگانگی، ظفرؔ کہ سبھی
بھٹکتے پھرتے ہیں میری صدا کے ایک طرف

*

ظفر اقبال

آوارۂ سفر ہوں، ٹھکانہ کہیں نہیں
میں اس کے باوجود روانہ کہیں نہیں

اچھا ہے، بیٹھ جاؤں بالآخر کسی طرف
اب یہ غبار میں نے اڑانا کہیں نہیں

وہ شام ہو کہ شیر، مرے سامنے جو آئے
اس بار میں نے خود کو بچانا کہیں نہیں

آگے نکل چکا ہے کہ پیچھے ہی رہ گیا
اب صرف میں ہوں، میرا زمانہ کہیں نہیں

اس کی تلاش رکھنی ہے جاری یہاں وہاں
وہ مل بھی جائے تو اسے پانا کہیں نہیں

خود سے چھپا کے رکھنا ہے یوں بھی ابھی اسے
پردہ یہ درمیاں سے ہٹانا کہیں نہیں

انکار دوسروں کی حقیقت سے ہو جسے
دنیا میں اس کا اپنا فسانہ کہیں نہیں

دنیا ہے جس طرح کی بھی، منظور ہے مجھے
ڈھانا نہیں ہے کچھ بھی، بنانا کہیں نہیں

کرتا ہوں سیر اپنے ہی آثار کی، ظفرؔ
آنا کہیں نہیں، مرا جانا کہیں نہیں

ظفر اقبال

تھک ہار کے رکنا کہ لگاتار میں چلنا
آسان مجھے لگتا ہے زنہار میں چلنا

درپیش ہے کب سے ہلۂ سفرِ ہستی
اک عمر سے ہے اپنے ہی آثار میں چلنا

خود ہی قدم اٹھیں گے، ذرا دیکھتے جاؤ
اس طرح کا چلنا ہے طلبگار میں چلنا

پھولوں کی رکاوٹ ہے کبھی دھند کی دیوار
مشکل ہے وہی خوابِ گرانبار میں چلنا

کھلنا وہ امڈتے ہوئے بادل کا برس کر
اور، ایک نمی کا در و دیوار میں چلنا

ایسی یہ محبت کی مسافت ہے کہ جس میں
اکثر ہی پڑا ہے مجھے ناچار میں چلنا

یہ ہمقدمی خوب ہے جیسی بھی ہے اب تک
اقرار میں چلنا کبھی انکار میں چلنا

گنجان ہوا ہے، کہیں سرسبز معانی
الفاظ میں رہنا ہے کہ اشجار میں چلنا

اسرار بہت ہیں، ظفرؔ اس نفع و ضرر کے
سیکھو ابھی اس گرمیٔ بازار میں چلنا

٭

ظفر اقبال

زمیں ششدر تھی اور برباد ہونا ہو چکا تھا
کہ اب تک جو بھی کچھ پایا تھا، کھونا ہو چکا تھا

کوئی تھا اور بھی موجود ہم دونوں سے ہٹ کر
جو میرے سامنے منظر تکونا ہو چکا تھا

مصیبت اب مرے اوپر سے آئی ہے کہ آخر
وہ میرا اوڑھنا تھا جو بچھونا ہو چکا تھا

ہوا ٹھہری ہوئی تھی، لوگ اکتائے ہوئے سے
مرے جانے سے پہلے رونا دھونا ہو چکا تھا

کوئی بھی چارۂ کار اب نہ تھا باقی کہ اب تو
کسی شے میں کسی شے کا سمونا ہو چکا تھا

طبیعت میں کئی رنگ اور ظاہر ہو رہے تھے
کہ ہنسنا ہو چکا تھا، اور، رونا ہو چکا تھا

مری آنکھیں نہیں کھلتی تھیں، کیسی نیند تھی وہ
کہ سورج سر پہ آ پہنچا تھا، سونا ہو چکا تھا

معانی کے گل و گلزار ہو جانے سے پہلے
لہو کے ساتھ لفظوں کا بھگونا ہو چکا تھا

ظفرؔ کیا کیمیا گر ہو کہ جاتے ہی تمہارے
کبھی تبدیل خاکستر میں سونا ہو چکا تھا

٭

ظفر اقبال

سب کو معلوم ہے تو نے ہمیں کتنا چاہا
اور، آخر میں وہی کر دیا جیسا چاہا

پیاس جب چاٹ گئی کھیتیاں ساری میری
پھر گھٹا نے مرے اندر بھی برسنا چاہا

تو جو کہہ دے تو یہ سب جھوٹ ہے، ورنہ ہم نے
تجھے ایسا کبھی چاہا کبھی ویسا چاہا

تجھے کہنے کی بھی زحمت نہ اٹھانا پڑتی
ہم نے تو خود ہی ترے شہر سے جانا چاہا

ساتھ رکھا جسے، اس سے تو رہے فارغ ہی
اور، جسے چھوڑ دیا اس کو دوبارہ چاہا

وہیں بے سمت ہوا اپنا سفینہ آخر
ہم نے جس رات سمندر میں ستارہ چاہا

اپنے اندر بھی کوئی ریت سی جب اڑنے لگی
ہم نے بہتے دریا کو بھی صحرا چاہا

رہی افتاد ہی ایسی کہ ہمیشہ ہم نے
لبِ دریا کی بجائے پسِ دریا چاہا

اس نے آنا تھا کسی اور کے ہی کام، ظفر
اور، بیکار ہی جانا تھا ہمارا چاہا

*

ظفر اقبال

جو بھی ہے شبِ وصل کا ہنگام بہت ہے
میں سو نہیں سکتا کہ ابھی کام بہت ہے

اب تک تو محبت میں کمی کچھ نہیں آئی
آغاز بہت ہے کبھی انجام بہت ہے

کافی ہے ابھی دل پہ کوئی بجھتا ہوا نقش
دیوار سے مٹتا ہوا اک نام بہت ہے

نکلے گا یہیں سے کوئی اندر کا بھی رستہ
فی الحال تو یہ ربطِ سرِ عام بہت ہے

ہوں خود ہی اگر شوقِ اسیری میں گرفتار
یہ دانہ ہی کافی ہے، یہی دام بہت ہے

تو ہے تو یہاں اک ترے ہونے کے سبب سے
تکلیف بہت ہے کہیں آرام بہت ہے

یہ اصل ہے، تصویر ہے، یا عکس ہے اس کا
جھلسے ہوئے لوگوں کے لئے شام بہت ہے

منسوب اگر طرز نہیں مجھ سے کوئی خاص
ظاہر ہے ابھی طبع مری خام بہت ہے

ہے گھاس کی پتی بھی، ظفرؔ، غیرتِ گلزار
میرے ہی لئے ہے تو یہ انعام بہت ہے

*

ہوم لس

افضل توصیف

ہیں! وہ اپنے ہی لگائے ہوئے عنوان کو دیکھ کر چونک پڑی۔ کس قدر خودسری! یہ اس کا قلم تھا جو بہت کچھ لکھتے لکھتے وہ سب بھی لکھنے لگا تھا' جس کی مخالفت وہ خود کر رہی ہو۔ بڑا فرق پڑ چکا ہے دونوں کے مزاج میں۔ وہ خود جو بچپن سے بڑھاپے تک کا طویل سفر طے کر چکی' مگر وہ جو شرمیلی سی لڑکی تھی' وہ جسے انگریزی میں ''شائی گرل'' کہتے ہیں' اندر ہی اندر سکڑ کر رہنے والی۔ جس نے کبھی ماں سے گڑیا تو کیا' روٹی تک نہ مانگی تھی' وہ اس بوڑھی عورت کے اندر اس طرح چھپی بیٹھی تھی' جیسے بچپن میں وہ کسی کونے کھدرے میں یا آنگن کے درخت کے نیچے اس کے موٹے تنے کے پیچھے چھپ کر بیٹھا کرتی تھی۔ آج بھی وہ اپنی ہر بات چھپا کر رکھنا چاہتی ہے۔ اپنی کہانی' اپنے آنسو' اپنی خوشی' ویسے یہ آخری شے تو اس کے پاس ہے بھی نہیں۔

مگر اس کا یہ قلم۔ یہ کالم نگار قلم جوان اور بے باک ہو چکا' دوسروں کے دکھ لکھتے لکھتے' کبھی تو خود اسے بھی دوسروں میں شامل کر لیتا ہے۔ کبھی تو طنز بھی جھاڑ دیتا ہے۔ ویسے تو فرق نہیں پڑتا۔ وہ بھی تو انسان ہے۔ اسکے بھی دکھ درد ہیں۔ حق حقوق' ضرورتیں اور غلطیاں۔ تھوڑا تھوڑا لکھتے' وہ کچھ زیادہ ہی لکھ گیا۔ وہ زمانہ بھی جب اس کے پرس میں صرف دو روپے تھے مگر اس نے سہیلی کو ایک روپے کا کوکا کولا پلا دیا۔ طالب علمی کا زمانہ' کوکا کولا کی بوتل ایک روپے کی ملتی تھی' مگر اب بہت مہنگی تھی۔ پھر وہ ساری کہانی -- جب اس کا پہلا گھر کھو گیا اور پھر گھر ڈھونڈنے کی لمبی کہانی۔ ننگے پاؤں' ٹوٹی جوتی -- اور وہ درجنوں گھر جو اس نے جوڑے تو مگر سب غلط جگہوں پر۔ سرکاری مکان' ہوسٹلوں کے کمرے' کرائے کی جگہیں۔ اگلوں نے سب اکھاڑ کر پھینک دیئے۔ مگر خیر اس کا کچھ فائدہ بھی ہوا۔

اس طرح اکھاڑ پچھاڑ کے ساتھ کچھ اندر کی تعمیر ہو گئی۔ کچھ اس کے گلے شکوے ایک ایک کر کے دور ہوتے رہے۔ بچپن میں اسے رب سے بہت شکایت تھی' وہ دن جب اس کی کاکی ماں' جس نے پالا تھا' مر گئی۔ اس کا پہلا گھر چھٹ گیا۔ تب اسے بتایا گیا کہ بچے کا اصلی گھر باپ دادے کا گھر ہوتا ہے۔ پھر دو سال بعد ہی سکھوں نے وہ گھر ڈھا دیا تو اسے سکھوں سے نفرت ہو گئی اور پھر جب کوئٹہ والا گھر بھی چھوٹ گیا' اس کی نوکری پنجاب

میں لگ گئی، تو بھی گھر کہاں، بار بار گھر کو سمیٹ کر بوریوں گٹھڑیوں میں باندھنا پڑا تو اسے تبادلوں سے نفرت ہو گئی، مالک مکانوں کے نوٹس کہ وہ مکان خالی کر دے۔ اس کے اندر ملکیت سے نفرت پیدا کر دیتے۔ گندا سسٹم! سسٹم کا گند!

مگر وہ نفرت زائل ہونے لگتی۔ جب وہ کوئی نئی جگہ ڈھونڈ لیتی اور ایک بار پھر سے اپنا ٹوٹا پھوٹا سامان ٹھیک سے جوڑ لیتی، میز پر لیمپ لگا کر اپنا قلم دوات سنبھالتی اور باورچی خانے میں کیتلی پتیلی اور چائے سیٹ سجا کر پہلی چائے بناتی اور گھونٹ گھونٹ گرم چائے کے ساتھ لفظ لکھتی تو بس' ایٹ ہوم کا احساس اجگتا۔ اور لگتا کہ سب ٹھیک ہے۔ جو نہیں ہے وہ بھی ہو جائے گا --

مگر وقت اس کی سوچ اور اطمینان کی بات پر کھی کھی کر کے بدمعاش سی ہنسی ہنستا رہتا۔ اور پھر سال چھ ماہ گزرتے ہی '' جگہ خالی کر دو '' کا نوٹس اسے مل جاتا۔ نئی جگہ کی تلاش میں سرگرداں وہ سوچا کرتی: یہ جو خانہ بدوش پھرتے ہیں۔ اسی طرح بنے ہوں گے خدا جانے وہ کونسا جبر ہوگا کہ یہ لوگ قبیلے ہو کر بھی ایک جگہ جم جانے سے ڈرتے ہیں۔ خانہ بدوش، یعنی کندھوں پہ لدا ہوا گھر۔ مگر اس کا گھر تو ریڑھے پہ لد کر چلتا اور ہر بار جگہ بدلتے ہوئے گھر کا کچھ حصہ پیچھے چھوٹ جاتا۔ بات یہ تھی کہ وہ صرف ایک ہی ریڑا لادنا چاہتی تھی۔ دوسرے کے لئے کرایہ اور تردد ضرورت بھی کیا ہے۔ اس طرح پیچھے چھوٹ جانے والوں میں اس کے خاص متر پودے اور گملے ہوتے اور گلی کا کوئی ڈوگی' آنگن کی چڑیاں جو اسکے ناشتے میں حصہ لگاتی تھیں۔

مگر وہ جہاں جاتی ایسا ہی سامان اور جمع کر لیتی۔ پھول پودے گملے' چلو اتنی عیاشی تو افورڈ کر ہی لینی چاہئے۔ نرسری سے نئے خرید لاتی' لیکن اگر ذرا سی کیاری ہوتی تو وہ گلاب چمبیلی کی جڑ ضرور لگاتی۔ اور پھر اگلی رخصتی کے وقت ان پودوں کو بھی ڈال کر ملتی' کیسی کیسی یاد آتیں۔ یہ وقتِ رخصت کی ملاقاتیں' -- جب گلبرگ کالج کا چھوٹا سا گھر چھوڑا تو رات کو موتیئے اور گلاب کے ساتھ ہی اپنی منجی ڈال لی۔ اوپر آسمان پہ آدھا چاند تھا جو نیچے اس کی زمین کو چپ چاپ دیکھے جا رہا تھا۔ مگر موتیئے کے بوٹے اور گلاب کی شاخیں بولتی رہیں -- وہ دن جب اس نے وہ قلمیں لگائیں۔ پھر چڑھتے چیتر ان میں ننھی ننھی سرخ کونپلیں پھوٹیں۔ اور وہ دن جب پہلے پھول کھلے۔ موتیا خوشبو کی آنکھ جیسا کھلا' گلاب کے بچے کے ہونٹوں کی طرح مسکرایا۔ خوشی ایسی کہ جیسی گھر میں بچے پیدا ہوئے ہوں۔ صبح کا وقت تو پھولوں کے پاس ہی گزرتا۔ توڑنے کی ہمت اس میں کہاں۔ اور جدائی کی رات وہ دونوں ہی جاگتے رہے' انسان اور پودے۔ چاند کو حیرت ہوئی ہوگی' بغیر کسی رجسٹری کے بھی مہر ملکیت کے وہ کس طرح ایک دوسرے کے اپنے تھے؟ پاگل پن کی بات لگتی ہے نا۔ اگلی صبح وہ پاگل عورت آنکھوں میں آنسو لئے وہاں سے چلی گئی' کسی اور جگہ نئے رشتے بنانے کو۔

آج تو بہت دیر ہو چکی ہے۔ اس کے سر پہ بال جلی گھاس جیسے ہو چکے۔ اور آنکھوں پہ موٹے شیشوں کی عینک چڑھ چکی' مگر یادوں کے جہان جوان ہیں۔ عجب سی بات ہے کہ ان یادوں میں زیادہ درد بھری یادیں

درختوں آنگنوں اور جانوروں کی ہیں۔ پہلا درخت تو پہلے آنگن میں ماں کا کی کے ہاتھ کا لگایا ہوا انار تھا۔ قندھاری انار کے سرخ پھول سنہری سبز کونپلیں اور اسی طرح تازہ ہیں۔ ابھی دوسرا جامن جو اسے دادا کی حویلی میں ملا تھا۔ تیسرا درخت بادام کا قلعہ سیف اللہ کے سرکاری بنگلے میں اس کا پسندیدہ ہو گیا تھا۔ یادوں کا چوتھا درخت گلابی خوبانیوں سے لدا چمن والے گھر کے چمن میں ملا تھا۔ پانچویں تو بیری تھی۔ سبی (Sibi) کی کوٹھی میں ایک طرف کو پھیلی ہوئی تھی' کیسے سرخ بیر لگتے تھے اور چھٹی تو بڑے انگوروں کی بیل تھی کوئٹہ والے گھر میں۔ آٹھواں درخت اخروٹ کا تھا' اس کے سکول میں۔ اس کے پیچھے بیٹھ کر وہ اپنا لنچ کا ڈبہ کھولا کرتی۔ پھر جب کالج میں داخل ہوئی تو اسے سیب کا درخت ملا۔ کلاس روم کی کھڑکی کے عین سامنے ہی کھڑا تھا۔ ہر سال برفانی سردیوں کی چھٹیوں کے بعد مارچ میں کالج کھلتا تو وہ سفید شگوفوں سے لدا ہوا ملتا۔ امرود کا درخت اس نے لاہور آ کر دیکھا۔ سرکاری مکان میں اس کا پہلا درخت۔ مگر بڑی میکلیگن ٹریننگ کالج کے اندر مولسری کا درخت اسے دو بار ملا' ٹریننگ کے وقت اور بعد میں ملازمت کے سال جب اس کی پوسٹنگ ہوئی۔ وہ وہیں کھڑا تھا۔ مگر اس کا بارہواں درخت اس کی آنکھوں کے سامنے کاٹا گیا۔ تب اسے صدمہ ہوا تھا۔ اور نفرت اس پھلبھری جیسی رنگت والی پرنسپل کو اپنے دفتر کی توسیع کرنا تھی نا۔

مگر یہ تیرہواں درخت تو اس کی زندگی میں زیادہ ہی گہری جڑیں اتار چکا ہے۔ اسی کی چھاؤں میں بیٹھ کر تو ہزاروں ورق کتابوں کے لکھے گئے' اسی کے سائے میں بیٹھی بیٹھی وہ سفید بالوں والی ہو گئی۔ یہ زیادہ وقت اسے خراب کر گیا۔ خانہ بدوشی کی پراکٹس کمزور ہو گئی۔ اور آج جب نوٹس آیا تو وہ یہیں بیٹھی تھی۔ کیا سڑی عبارت لکھی ہے۔۔ قبضہ' ناجائز قبضہ؟ میں نے تو کوئی قبضہ نہیں کر رکھا۔ یہاں کئی چیزیں ہیں اور ''قبضہ'' بھی دروازے میں کہیں لگا ہو گا۔ اس نے درخت کی طرف دیکھا' بوڑھی دھریک کی جڑ سے ایک بچہ درخت نکل رہا تھا۔ زندگی کا تسلسل۔۔ اور وہ اوپر کتنی ساری چڑیاں' بلبلیں' کوے لالیاں جو رہتی ہیں وہ بانکی سی کالی چٹی مولا۔ یہ ڈوگی پیارا' چٹی سفید مانو۔ کیا ان سب پہ میرا قبضہ ہے؟ آنسو اس کی گالوں پہ بہہ نکلے تو وہ اٹھ کر منہ دھونے اندر چلی گئی۔

اندر جا کر اس کی نظر کتابوں کی الماریوں پہ پڑی تو اپنے آپ سے پوچھنے لگی۔ یہ ایک شیلف سے بارہ الماریاں کس طرح بن گئیں۔ کب؟ کتنے دنوں میں۔ اور یہ درجن بھر ایوارڈز۔ یہ تیس کتابیں کب لکھیں۔ کب چھپ کر یہاں سج گئیں۔ کتنے عرصے میں ایک ریہڑا سامان دو ٹرک لوڈ بن گیا۔ کس طرح؟ شاید یہی قبضے کی بات ہے۔ پچیس سال تم کس طرح بیٹھی رہی' ایک ہی درخت کے نیچے۔ تمہارا درخت تو بدل جاتا تھا۔ ذرا گنو تو کتنی صبحیں کتنی شامیں۔ جرم تو ہوا ہے۔ اپنا پروانہ راہداری نکال کر تو دیکھو' قیام نہیں کوچ ہی کوچ لکھا ہے۔ مگر یہاں اتنے دن کہ ایک درخت بوڑھا ہو گیا دوسرا جو خود بویا تھا وہ جامن کے پھل سے لدا کھڑا ہے۔ اور یہ لائبریری۔ یہ پینٹنگز ان لڑکیوں کی جو چھٹی بستے کی عمر میں یہاں پڑھنے آئیں اور اونچی ڈگریاں لے کر چلی بھی گئیں۔ اور یہ لڑکا دو بچوں کا باپ خود اسی عمر میں اس کی انگلی تھامے یہاں آیا تھا۔ اتنے دن اس جگہ ٹکی رہی۔ تو جو 53 سال پہلے خانہ

بدوش لکھی گئی تھی۔ وہ رات حساب کتاب کی رات تھی اور اس کی بہت ساری سلیپ لیس جاگتی آنکھوں والی راتوں میں سے ایک۔ رات بھر کی خود کلامی --وہ رات پوہ پھٹے ختم ہوگئی۔ اذان کی آواز۔ چڑیوں کی پہلی چہکار اور پھر جب اس کی بلبلیا نے دنیا کی سب سے سریلی آواز میں نئے دن کے استقبال کا نغمہ گایا تو اس نے پرندے کو وہی دعا دی۔ تو سلامت رہے میری فنکارہ۔ اور پھر گھنٹے بھر کی سیر کے بعد جب بہت ساری آکسیجن اس کے پھیپھڑوں سے گزر کر خون میں جا ملی تو اس کی ڈپریشن کم ہوگئی۔ اور وہ تازہ چائے کی پیالی کے ساتھ اپنا لکھنے کا بستہ اور پن لے کر آنگن کے اسی درخت کے نیچے آ بیٹھی۔ ویسے آج کسی کالم کا عنوان اس کے سامنے نہیں تھا۔ شہر میں قتل ہوئے تھے۔ لڑکی کی عزت بھی لٹی تھی۔ پولیس کی چیرہ دستی کی خبر بھی لگی تھی۔ اور کشمیر میں تازہ خون بھی بہا تھا۔ مگر نہیں آج اس کا قلم کسی اور کے لئے کچھ بھی لکھنا نہیں چاہتا تھا۔ آج تو وہ اپنے لئے ہی سوچ رہی تھی۔ ''میں اس بڑی سی دنیا میں کیا کر رہی ہوں؟ آخر کیوں بضد ہوں زندگی میں اپنے حصے کے لئے۔ اپنے حصے کی مٹی کے لئے۔ اور پھر پتہ نہیں کس وقت قلم ہاتھ میں لے کر وہ وہی بات کاغذ کے ساتھ کرنے لگ گئی۔ ایک لمبی نظم کے آخر میں اس نے لکھا:

اوس وچ نہاتے دھوتے درخت ہن
نویاں کرناں دا ٹانک چین گے
اوکسیجن' جگ جیون دا ساہ
ساہ ادھار لے کے میں سوچیا
ایہہ سارے بوٹے میں ہتھیں لائے
درخت...... جوان جہان ہوئے
درختاں نال میں ٹھیکہ کیتا
تسیں مینوں چھاں دینا' تازی وا دینا
میں تہانوں پانی دیاں گی
بل دی گل وچ کار نہ آوے
ایہہ ویہڑا میرا اے
ایتھے میرا بڑ وسدا
میرے بڑ دے جی قسمیرے
بلبل چڑیاں کاں' مولہ کھگھی
اک ڈوگی' دوجی مانو بلی' جیوے میرا پتر
ساوے سلیٹی ڈوڈواک دی جوڑی

دنے چپ رہندے راتیں بولدے
نیلے پیلے رنگ بدلاوندا گرگٹ
گملے تھلے سوندا
اک نکی جہی چڑی کالی لیلیٰ ورگی
دو ساوے طوطے رتی گانی والے
اساں سارے اکو بٹر دی جی ہوندے
اتھاں راہندے
پر اور کم ذات جو کہندی
میتوں کہندی--
توں ایس ویہڑے وچ الیگل رہندی
ایہہ ویہڑا سرکاری اے من دی ہاں
میرا جواب تاں اکوای اے
میں تے میرا ابڑ اساں دھرتی دے جی
اُکا غیر سرکاری
اُکا ذاتی

وہی دن تھا جب تپتی دوپہر کو پولیس آئی۔ پولیس کیا آئی پورا لشکر آیا۔ دو تھانے بندوقیں تانے تین کالی گاڑیوں میں بھر کے آئے اور انہوں نے اوپر کے فلیٹ میں مورچہ لگایا۔ کیا کسی ٹیررسٹ کو پکڑنے آئے تھے وہ۔ ریاض بسرا یا اسامہ لادن؟ پنجاب پولیس کے لئے بزدلی کی انتہا' ایک عورت 65 سال' اکیلی۔ اسلحہ صرف قلم کا ہے۔ مال صرف کتابوں کا۔ اسے پکڑنے کو دو تھانے۔ اسے دھکے مارنے کو 22 جوان اور 6 جوانیاں۔ بندوقوں ڈنڈوں سے لیس۔ اور پھر کس طاقت اور تشدد کے ساتھ اسے اٹھا کر لے گئے۔ تھانے میں ساڑھے سات گھنٹے۔ گرم تندور کمرے میں بندوقوں کے سائے میں آخر کیوں؟ اسے لگا اس سوال کا جواب پائے بغیر وہ مر جائے گی۔ اور پھر کون اٹھانے آئے گا اس کی لاش۔ نہ' ایسا انجام پنجاب کی مایہ ناز ادیبہ کا ہونا نہیں چاہئے۔ وارث کی روح شرمندہ ہوگی۔ بابا فرید کو صدمہ ہوگا۔ بلھے شاہ کو برا لگے گا۔ ان سب کے نام کے ایوارڈ اس کی الماری میں رکھے ہیں اور...... ہاں' اسے ایک دم جھٹکا لگا۔ اس وقت یہاں بند کر کے وہ ضرور کچھ کر رہے ہوں گے۔ اس کی لائبریری اجاڑی جا رہی ہوگی۔ خدایا! وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں جا رہی ہوں تم چاہو تو مجھے گولی مار سکتے ہو۔ لیکن وہیں میری کتابوں کے پاس جا کر۔ وہیں مارنا۔ تم جو آج کے ہلاکو ماننے گئے ہو!

''جانے دو'' خدا جانے وہ بڑا افسر کہاں سے نمودار ہوا۔ مگر اس کے پیچھے بڑے اخبار کا کرائم رپورٹر

بھی کھڑا تھا۔ ''تم جانتے ہو یہ خاتون کون ہے؟ اور تم نے کیا کیا ہے؟''............ وہ گرجا۔

بہت منحوس شام تھی وہ۔ اس لئے نہیں کہ اسے پولیس نے دھکے مارے تھے۔ اسے تھانے میں بند کر دیا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ اس کی بہت ساری کتابیں اور مسودے اس شام برباد کر دیئے گئے تھے۔ اب وہ ملبے پہ کھڑی تھی۔ ڈکشنری' انسائیکلوپیڈیا' دیوان غالب' گڈ ارتھ' بلھے شاہ...... پرزے ٹکڑے...... جلد اکھڑی مگر زیادہ ٹکڑے اس کے دل کے تھے کہاں کہاں بکھر گئے۔ گھر سے تھانے تک اور اب یہاں پامال لائبریری میں دو آنسو سرخ رنگ کے اس کی دکھتی آنکھوں سے ٹپکے اور وہ دروازہ بند کر کے باہر نکل گئی۔ اخبار کے ایڈیٹر نے اسے احترام سے بٹھایا۔ پانی پوچھا......

نہیں کچھ نہیں چاہئے۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی ہاں میرا ایک کام کر دو۔ بڑا احسان ہوگا۔ اپنی کیمرہ ٹیم اور رپورٹر میرے ساتھ کر دو۔ میں مرنا چاہتی ہوں۔ لیکن ذرا اہتمام سے۔ میرے گلے میں میڈل ہوں گے۔ میرے ساتھ میرے ایوارڈز اور ڈگریاں اور کتابیں۔ میں گورنر ہاؤس کے سامنے اپنی موت سے ملوں گی' گواہ رہنا۔ ''ہیں' کیوں؟ آپا!'' اخبار کا ایڈیٹر پریشان ہو گیا۔

اور اگلے دن اخبار میں اس کا یہ بیان چھپ گیا تو کئی ٹیلی فون آ گئے۔ افسوس کرنے والے دوستوں اور واقفوں کو اس نے کڑوی کسیلی سنا دیں۔ جیسے وہی تو ذمہ دار تھے۔ ساری بات کے۔ اس کی ذہنی حالت ایسی ہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ساری دنیا میں سب سے بڑی بے بس اور اکیلی ہے۔ ویسے یہ احساس تو کب سے اس کے اندر موجود تھا۔ جب سے جدوجہد کرنے والے ساتھی آرام طلب اور سمجھوتہ باز ہو گئے تھے۔ جب سے سارا لفٹ اور پروگریسو کہلانے والا انٹلیکچوئل این جی اوز بنا کر ڈالروں کے مول بک گیا تھا اور اب اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ کس نے کروایا؟ ہیومن رائٹس والوں نے ایک بدمعاش اور جوان عورت کے ''ہیومن رائیٹس'' محفوظ کرنے کے لئے۔ تلخی اس کے اندر انفیکشن کی طرح پھیل کر اسے نڈھال کر رہی تھی۔ اور وہ کسی زخمی جانور کی طرح اپنے زخم چاٹ کر کراہ رہی تھی۔

پولیس کے خلاف پولیس چیف کو درخواست لکھنا۔ گورنر کے لئے عرضی لکھنا چیف سیکرٹری سے بات کرنا۔ یہ سب کیا تھا۔ زخم چاٹنے والی بات تھی نا اخبار نے اس کا ساتھ دیا تھا۔ کسی کالم نگار نے کالم لکھا بھی تھا۔ مگر یہ سب کچھ اس کے دل کی تکلیف کو ذرا سا بھی کم نہ کر سکا تھا۔ اب یہ بات بھی نہ تھی کہ اسے اس طرح غیر محفوظ ہو جانے یا سٹیٹ فورس کی چیرہ دستی کا صدمہ سہنے کا تجربہ پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ بڑے مارشل لاء کے دور میں کچھ ایسی کارروائیاں بہت سارے لوگوں کے ساتھ ہوئی تھیں۔ وہ بھی لپیٹ میں آئی تھی۔ اس نے بھی وقت کے مہیب درد میں سے اپنا حصہ پایا تھا۔ مگر اس وقت وہ اس طرح اکیلی نہ تھی۔ ایک کارواں' ایک قافلہ چل رہا تھا۔ کوئی جیل کی طرف' کوئی جلاوطنی کی طرف' کسی کے پاؤں میں زنجیر تھی۔ کسی کی پیٹھ پہ کوڑیالے سانپ لہرا رہے تھے۔ اور وہ سب اس کے ساتھی ہی تھے۔ رائٹر' ٹیچرز' جرنلسٹ' سیاسی ورکرز' جمہوریت کی بحالی کے لئے جدوجہد کرنے والے۔

اس وقت تکلیف سہنے میں کمزوری کا نہیں طاقت کا احساس تھا۔ آخر ایک کاز کے لئے لڑ رہے تھے سب۔

اور اب ''اب تو میں ایک کیڑا ہوں۔ جسے پولیس نے بوٹوں تلے مسل دینا چاہا۔''

یہ بات اس نے اپنے آپ سے کہی اور کہتی چلی گئی۔ اور پھر جب اپنے لکھے ہزاروں کالموں میں ''ایک کالم اپنے لئے'' کا اضافہ کرنے بیٹھی تو عنوان لگایا ''کیا میں انسان ہوں کیا میرے کوئی حقوق ہیں؟''

عجب اور غلط کیفیت ہے دل کی' یہ بات بھی اس نے اپنے لئے لکھی۔ self pity اس کے لئے ہمیشہ حرف غلط تھا۔ ایک کمزوری جو کسی پروگریسو سوچ رکھنے والے لوگوں کی طرف دار ادیب میں نہیں آنی چاہئے۔ منفی رویہ اپنے ہی بارے میں؟ ٹھیک ہے اس کی وجوہات پیدا ہوتی ہیں۔ مگر مقابلے کی سپرٹ کہاں گئی؟ ''مقابلہ کرو' ذرتے ڈرتے اس نے اپنے آپ سے کہا تو۔

مگر جواب وہی تھا۔ غصے کے ری ایکشن اور مایوسی کے کوئیں سے ابھری بات۔ اپنے ہی آپ سے مقابلہ؟ اپنی ہی سوچوں کی مخالفت۔ اپنے ہی تھیسس کی کاٹ؟ کیا کرتی رہی ہو زندگی بھر۔ غلط! غلط! غلط! آج اپنے آپ کو بچانے کی طاقت بھی نہیں۔ یہ کتابیں' یہ پودے' یہ پرندے انہیں بچانے کے لئے کیا کیا؟ لوگوں کے لئے لکھا؟ رائیگاں ہوا نا۔ اگر درباروں کے لئے لکھتی تو آج کتنے لوگوں کو مکان دینے کے قابل ہوتی اور کسی بڑی این جی او کی چیئرپرسن بنی ہوتی۔ تھو!

اس نے اپنے گندے خیال کو تھوکا۔

اور تب ہی ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ہو۔ اقبال قیصر۔ اچھا تم بھی افسوس کرنے والے ہو نا۔ ہاں تمہیں افسوس ہونا ہی چاہئے' ایک پنجابی رائیٹر' کی وفات بھی تو ہوئی ہے نا۔

''تسیں کیہ کہہ رہے ہو دیدی'' سدھا سادا بیچارا اقبال قیصر پریشان ہو گیا۔

ہاں۔ یہ سچ ہے ویرا۔ میرے اندر کتنا کچھ مر گیا ہے۔ کہانی کار' کالم نگار' انقلابی۔ مارکسسٹ سوچ اور نظریے۔ ایک ٹیچر اور پنجابی ادب و زبان کے لئے کام کرنے کا جوش و جذبہ۔ سب مار دیئے پنجاب پولیس نے کسی کو نہیں چھوڑا۔ اور ہاں وہ پنجابی عورتوں کے لئے ہمدردی اور ان کی اپ لفٹ کا مشن' اسے توڑ دیا۔ عاصمی خان ایس ایچ او کی بندوق نے عاصمہ جہانگیر کے ہیومن رائیٹس نے اور زیب النسا۔ ٹی ہاکی نے میری اونچی سوچوں کی ہڈیاں توڑ دی ہیں......

دیدی' میری گل سنو۔ میں تہاڈے ول آ رہیا واں۔ میرے نال کج امریکی بندے وی آ رہے نیں۔ تہاڈا انٹرویو......

''انٹرویو! کاہدا انٹرویو؟'' وہ زخمی ناگن کی طرح پھنکاری' مگر ٹیلی فون کے دوسری طرف اقبال قیصر کی آواز اسی طرح نرم اور دھیمی رہی۔

''دیدی اوہ پارٹیشن دے حوالے نال تہاڈیاں یاداں ریکارڈ کرنا چاہوندے نیں۔''

''آہو۔ اک نماں تماشہ۔ اک نسل نے پارٹیشن کرا کے ساڈا تماشا دیکھیا۔ ہن دوجی ساڈیاں گلاں دا کاروبار کردی پھردی اے۔ بڑے پروجیکٹ' بڑے ڈالر چل رہے نیں۔ ایہنا گلاں واسطے۔ ایس تھیں پہلاں وی کئی آ چکے نیں' ہن تیرے نال آ رہے نیں تاں وی ٹھیک اے۔ دے دیاں گی انٹرویو۔''

''چنگا دیدی اسیں آ رہے ہاں''...... اقبال قیصر نے ذرا بھی برا نہ مانا۔

یہ بھی ایک طاقت ہے۔ اس قدر صبرو تحمل! اسے کون شکست دے سکتا ہے۔ اور پھر وہ جا کر فریج میں بوتلیں گننے لگی۔ گورے آ رہے ہیں تو کالا پانی دینا ہی پڑے گا۔ آنے والے تین تھے۔ دو گورے ایک گوری مگر ذرا کم گوری۔ پہناوا آدھا تیتر آدھا بٹیر۔ گرمی کی وجہ سے تینوں نے کرتے پہنے ہوئے تھے۔ پاؤں میں چپل۔ لڑکی مشکل سے بیس اکیس کی ہوگی' چوڑیاں انگوٹھیاں موٹی موٹی۔ سر پہ سکارف باندھے' وہ صرف کیمرہ ہی استعمال کر رہی تھی۔ رائیٹر اور اس کے گھر کے ماحول کی تصویریں بناتی وہ ڈوگی تک جا پہنچی۔ وہ بھی جرمن شیفرڈ۔ اپنے لوگوں سے اچھل اچھل کر ملنے لگا۔ اتنے میں اس کی نظر لڑکی کے کرتے پر پڑی دامن تار تار۔ شاید ڈوگی نے پنجہ مار کے پھاڑ دیا بیچاری کا کرتا۔ لیکن جب پوچھا تو بولی۔ ''نواٹ از رکشاز ڈوئنگ۔'' پھر شاید اس کی آنکھوں میں فکرمندی دیکھ کر بولی۔ ''اٹ از آل رائٹ'' اور لٹکتے دامن کو جین کی بیلٹ میں اڑس لیا۔

انٹرویو تو پنجاب پارٹیشن اور اس کے ساتھ پیدا ہونے والے حالات و واقعات کی یادوں اور تجربوں کی کسک پہ تھا۔ وہ جنریشن تو مر چکی جو اس وقت جوان یا نوجوان تھی۔ اب جو باقی ہے وہ اس وقت کے بچے ہیں' یا کوئی ٹین ایج کے لوگ ہوں گے جو آج کے بوڑھے ہیں' یا زیادہ بوڑھے۔

گوروں کے سوالوں سے اس کی یادوں کا قافلہ سا چل پڑا تو کیمپوں تک جا پہنچا۔ اس وقت پنجاب کے عوام کو مولی گاجر کی طرح کاٹا گیا۔ ان کے گھر' مکان' بستیاں گراں اجاڑے۔ ان کی عزت آبرو برباد کر دی گی۔ وہ غصے اور غم کی آواز میں بولتی بولتی رک گئی۔ اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ اس وقت تینوں گوروں میں سے صرف لڑکی کا چہرہ شریک غم ہونے کا تاثر دے رہا تھا اور اسی وقت اس نے غور سے اس چہرے کو دیکھا بھی۔ وہ اپنے آپ کو میکسیکن بتا چکی تھی۔ اسے یقین بھی ہوا تھا کہ میکسیکن امریکن نہیں ہوتے اس لئے فرق صاف تھا۔ لیکن اب جو اس چہرے پہ غمگین ہونے کا تاثر آیا تو لگا لڑکی پاکستان یا کسی عرب ملک کی ہے۔ شاید فلسطین کی ہو۔ مگر انٹرویو تو اس کا اپنا ہو رہا تھا۔ پوچھتی تو کیسے۔

سوال۔ پنجاب پارٹیشن کے وقت جو بھاری آبادیاں ایک طرف سے دوسری طرف منتقل ہوئیں اس کے اثرات پنجابی قوم کے لوگوں پر کس طرح کے پڑے......؟

لوگ۔ وہ پھر تلخ ہو گئی۔ لوگ کہاں چھوڑے انہوں نے۔ جو بچ گئے وہ لوگ نہیں رہے تھے۔ پنجابی قوم کے بھی نہ رہے۔ وہ تو پناہ گیر ہو گئے۔ مہاجر' شرنارتھی' رفیوجی۔ بے پہچان' بے شناخت' بے مقام...... ہجوم در ہجوم۔ گورے مردوں کے پلے کچھ پڑا کچھ نہ پڑا۔ ٹیپ ریکارڈر چل رہا تھا۔ وہ اسے پڑھوا کر کام چلا لیں گے۔ مگر

لڑکی جو کیمرے میں اس کے چہرے کے تاثر اتار رہی تھی۔ خود کس قدر متاثر ہو رہی تھی۔ اور جب وہ سوال آیا وہ کونسی چیز یا کیفیت ہے جو اس وقت اسے آپ کا پیچھا کر رہی ہے یا آج تک ساتھ چل رہی ہے؟ میرا مطلب ہے پارٹیشن کے وقت سے......

اس وقت سے آج کے وقت تک میں ہوم لیس ہوں۔ میرا ہوم لیس ہونا ابھی ختم نہیں ہوا۔ یہی میری قوم ہے۔ یہی دیس۔ میری ذات' میری پہچان اور میرا حوالہ بھی یہی ہے کہ میں بے گھر ہوں۔ جب بے گھر ہوں تو بے وطن بھی ہوں جو بے وطن ہوتا ہے وہ میرے جیسا ہوتا ہے......

''اور میرے جیسا بھی۔'' غیر ملکی لڑکی نے زیرلب کچھ کہا۔ شاید یہی کہا تھا۔ مردوں نے کچھ نہیں سنا' وہ ٹیپ چلا کر سن رہے تھے۔ اور پھر انہوں نے جیسے کہ ہوتا ہے۔ جواب میں سے ایک سوال نکالا:

بے گھر اور بے وطن ہو کر آپ اپنے آپ کو دنیا میں کہاں پلیس کرتی ہیں؟

میں پوری دنیا کو اپنی ہتھیلی پہ رکھتی ہوں اور اس زمین پر اگے ایک درخت کے نیچے اپنے آپ کو بیٹھے دیکھتی ہوں۔ میرے ہاتھ میں قلم ہے اور میری کتابوں کا ڈھیر جو ابھی ابھی اندر سے نکال کر پھینکی گئی ہیں' میں دنیا کی' بے پناہ' شہری ہوں۔ پناہ گیر' مہاجر' رفیوجی' شرنارتھی۔ بیسویں صدی نے ایسی کئی قوموں کو جنم دیا۔ انہیں کے اندر سے ابھری ہے'' بے پناہوں کی قوم'' جواب تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے۔ مجھ سے تو ایک سادھو ہونے کا حق بھی چھن گیا ہے۔

انٹرویو ختم ہوگیا۔ گوروں نے گرم کوکا کولا کے گلاس اٹھا کر منہ سے لگائے مگر ☆☆ چہرے والی لڑکی کہیں کھوئی رہی۔ اس نے غور سے اس کے چہرے کو دیکھا اور سوچا پہلے کہاں دیکھے تھے ایسے نقش اور یہ تاثر؟ سوچنے لگی تو اس کے ہوم لیس ہونے کی کہانی کوئٹہ کی طرف چل پڑی۔ وہیں کہیں یہ چہرہ دیکھا تھا۔ قلعہ عبداللہ میں' چمن میں' کہاں دیکھا تھا یہ چہرہ؟ اپنے چہرے پہ ٹکی دو آنکھوں کے اثر سے لڑکی چونک گئی۔ اور شربت کا گلاس اٹھانے لگی تو اس نے کہہ ہی دیا۔

''تم کہتی ہو تم کس امریکی ہو' مگر تمہارے نقش کہتے ہیں تم صرف ایشیا کی ہو۔''

گوروں میں سے ایک چونک گیا اور بولا ''یو ہیو اے گریٹ آئی۔ شی از اے رفیوجی--افغان رفیوجی۔'' اور پھر کہانی چل پڑی' صدف کی کہانی کے سنگ۔ اس کا نام صدف ہی تھا۔ امیر امان اللہ کے خاندان سے تعلق رکھنے والی اس کی نانی بے وطن ہوئی تھی۔ پھر افغان خانہ جنگی میں اس کی ماں بچے اٹھا کر میکسیکو جا پہنچی۔ اس حساب سے صدف میکسیکن ہے۔

چلنے کا وقت آیا تو اس نے صدف کا پھٹا کرتا پھر دیکھا اور ہاتھ پکڑ اسے اندر لے گئی۔ کرتا بدل لو صدف' اس نے اپنا سب سے اچھا کرتا نکال کر غیر ملکی لڑکی کے سامنے رکھا۔

کس قدر فٹ آیا اور کس قدر پھب گیا نیلے رنگ کا کڑھائی والا کرتا۔ جیسے اس کے لئے بنا تھا۔ ہاں

اسی کے لئے تھا۔ تین سال کے لئے اس نے یہ دیکھ کر ٹرنک میں رکھ دیا تھا کہ وہ کرتا بہت بالی عمر کے لئے بنا ہوا تھا۔ پتہ نہیں اس نے خریدا کیوں تھا؟ اس لمحے صدف کرتا پہن کر اپنے آپ کو شیشے میں دیکھ رہی تھی۔ خوشی اس کے چہرے پہ پھیکی اور پھر وہ غیر ملکی لڑکی پلٹ کر اس کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ کتنے آنسو ایک دم نکل پڑے اس کا کندھا بھیگ گیا۔ یور آر لائق مائی مدر یور آر مدر! یس آئی ایم یور مدر۔ وی آر اے ہوم لیس فیملی۔

دروازے پہ آ کر صدف نے آخری تصویر بنالی اور کیمرہ جھولے میں ڈال کر بولی میں کل واپس جا رہی ہوں۔ مگر لوٹ کر آؤں گی۔ پھر ہم دونوں میں اور آپ مل کر کابل جائیں گے۔ میری ماں کا مدر لینڈ۔ ضرور اس نے لڑکی کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ہم ضرور جائیں گے۔ صرف کوئٹہ کے راستے جائیں گے۔ وہ میری ماں کا دیس ہے۔ لڑکی ہنس پڑی یا شاید رو پڑی۔ اور بولی۔ ہم دونوں ہوم لیس عورتیں اپنی اپنی ماں کا دیس دیکھنے ضرور جائیں گی۔ پرامس۔ Promise

مگر اگلی بار تم آؤ گی تو مجھے ملو گی کہاں؟ اس جگہ سے تو مجھے کوچ کا حکم ہے۔ یہ بات اس نے اپنے دل میں کہی تھی۔ مگر صدف کو پہنچ گئی۔

آپ فکر نہ کریں ماما میں آپ کو ڈھونڈھ لوں گی۔ ہوم لیس لوگ ایک دوسرے کو ڈھونڈھ لیا کرتے ہیں۔ اور اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔ شاید آنسو چھپانے کے لئے۔

o.....o.....o

منظوم قہقہے

ڈاکٹر انعام الحق جاوید کا مرتب کردہ مزاحیہ شاعری کا انتخاب

جو تین صدیوں پر محیط ہے اور جس میں اڑھائی سو سے زائد شعراء

کا منتخب مزاحیہ کلام پہلی مرتبہ یکجا کر کے مع احوال زندگی شائع کیا گیا ہے۔

صفحات: 452 قیمت: 290

ملنے کا پتہ: سارنگ پبلی کیشنز

الاکو میشن پٹیالہ گراؤنڈ 14۔ لنک میکلوڈ روڈ لاہور

جوگن

پروین عاطف

اچھا سنو! سنو سب لوگ پارو نے ہلکی سی تالی سب کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے بجائی اور رسان سے کھنکار کر بولی۔ ایک سردار صاحب کو ان کے وفادار نوکر نے رازدارانہ لہجے میں بتایا جب کسی شام وہ گھر سے باہر جاتے ہیں ان کی بیگم کلجیت کور صاحبہ کے لاؤنج میں پڑے بڑے صوفے پہ ان کے ساتھ کوئی دوسرا مرد موجود ہوتا ہے۔ سردار نے بات سنی۔ کچھ لمحے چہرے پر بے چینی اور سوچ کے تاثرات ابھرے پھر اپنے ملازم لابھ سنگھ کی ہتھیلی پر زور سے ہاتھ مار کر بولے۔

"لابھ سنگھا مسئلہ حل ہو گیا۔"

"سردار جی کویں؟"

"آپاں آج لاؤنج سے صوفہ ہی اٹھوا دیتے ہیں۔ نہ ہوگا صوفہ تو ---" پارو نے ہمت کر کے ان سب میں شامل ہونے ان کے شوخ چلبلے سروں میں سُر ملانے کی خاطر اپنے بھانویں انتہائی واہیات لطیفے سے محفل گرمانے کی کوشش کی تھی لیکن قاسم --- لطیف انیس ڈی آئی جی حفیظ کے چہروں پر لطیفہ سنتے ہی جیسے برف سی جم گئی تھی۔

کہرے کی سورج مکھی سی کھلی کھلی فضا میں چھان بورا سا اڑنے لگا تھا۔ بیس گریڈ کا وزارت ثقافت کا افسر کلیم اور ڈی آئی جی حفیظ! نے آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے کو پارو کے متعلق کوئی ناخوشگوار سا سگنل بھیجا تھا۔ اور پارو کے پورے بدن میں شرمندگی کی ایک لہر سی دوڑنے لگی تھی۔ اور کھسیانی بلی کھمبا نوچے جیسے تاثر کے ساتھ وہ اپنے لطیفے پر از خود ہنس پڑی تھی۔ سکھوں کے لطیفے اعلیٰ درجے کی سوفسٹی کیٹڈ محفلوں میں اب یقیناً کلیشے سمجھے جاتے ہوں گے۔ زمن کے ساتھ گزرے زندگی کے مردہ لمحوں نے مجھے وقت میں بہت پیچھے پھینک دیا ہے۔ میرا تو لباس چال ڈھال بھی جیسے دنیا سے کٹے "رپ وین ونکل" کی طرح ان سب سے مختلف نظر آتا ہے۔ اسی لئے شاید اسی لئے --- اس شام پارو جوگن کی محفل سے خجل چہرہ لے کر جلد اٹھنے کا سوچنے لگی۔

اسے جوگن کے ان جدید دور کے اعلیٰ افسران کی محفل میں اٹھنے بیٹھنے کے آداب اور مینرز سے مزید واقفیت حاصل کرنی چاہئے۔ جوگن کے اس اعلیٰ پائے کے افسران کی ان باقاعدہ محفلوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کا سلقیہ آنا چاہئے۔ آج کے مقبول ان ''--'' موضوعات پر گہری نگاہ ہونی چاہئے۔

پارو نے اپنی خجالت مٹانے کی خاطر' غسلخانے میں جاکر۔ تہہ خانوں میں بند سیلن ماری پرانی کتابوں کی رنگت کی اپنی صورت دیکھتے ہوئے سوچا۔

دراصل پارو کی اپنی سائیں سائیں تنہائی اور بوریت مٹانے کی خاطر اپنے بچپن کی دوست ''نرجس'' عرف جوگن کی ان اپر کلاس تعلیم یافتہ اعلیٰ سٹیٹس کے ان افسران کی محفلوں میں آمد قدرے نئی نئی تھی۔

نرجس نے اپنے ان تمام ایڈ مائرز یا دوستوں کو اپنی اور پارو کی برسوں پہ پھیلی دوستی اور گہرے تعلق کے بارے میں لمبا لیکچر دیا تھا۔ پھر بھی کئی ہفتے گزرنے کے باوجود ان کی ہاں میں ہاں ملانے کی ہر ممکنہ کوشش کے باوجود کوئی ان دیکھی بار بڈ وائر (barbed wire) کہیں تھی جو پارو کے ساتھ ایک خصوصی حد کے بعد انہیں مذاق کرنے یا ٹھٹھا اڑانے سے روکتی تھی۔

جوگن کی طرح وہ سب پارو کے ہاتھوں پر ہاتھ مار کر یا سگریٹ کے مرغولے رخساروں یا ہونٹوں کے بالکل قریب لے جاکر پھینکنے سے خواہ مخواہ گریز کرتے تھے۔

حالانکہ آہستہ آہستہ پارو تو خود جوگن کے اس فلسفے پر کچھ کچھ یقین کرنے لگی تھی کہ بالغ مرد وزن کے درمیان' فرداً فرداً دوستی کی بنیاد پر ٹھٹھا مخول قربت' کھلا میل جول' اخلاقی یا سماجی طور پر کہیں بھی ممنوعہ قرار نہیں دیا گیا۔ یہ محض پینڈو مولویوں کے از خود وضع کردہ ٹیبوز taboos تھے۔

نرجس یا جوگن نے جو دراصل پارو ہی کی طرح مڈل کلاس اقدار مارے ماحول کی پیدائش تھی اپنے آپ کو ان سب ننھی ننھی فول دی کڑیوں سے آزاد کر کے زندگی آسودہ اور سپھل کرلی ہے۔ ''سچ تو یہی ہے'' پارو سوچتی ننگا بچہ فرد جب ماں کی کوکھ سے باہر قدم دھرتا ہے تو اس کے گرد کسی قسم کے جبر کی کوئی زنجیر نہیں ہوتی۔ خود مختاری سے جینے اور اپنے راستے خود وضع کرنے کے تمام اختیارات وہ جبلی طور پر اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔

سماج یا خاندان کو پتا نہیں حقوق کی یہ دستاویز کس نے تھما دی کہ وہ اپنی سینہ بہ سینہ چلتی' بار بار استعمال شدہ ''سٹیٹس کو' اقدار آنے والے انسان کے سر پہ لاد دیں۔ کبھی کبھی پارو جھنجھلا کر سوچتی۔

نرجس بھی تو اس کی طرح ایک تنہا درمیانی عمر میں قدم دھرتی تنہا عورت تھی۔ اعلیٰ عہدوں پہ فائز پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ دوستی' بے تکلفی کا رشتہ جوڑ کر ان کے سہارے ہلکی پھلکی زندگی گزارنے کا راستہ اس نے کیسی ذہانت سے وضع کیا ہے۔ ان بے چارے اپنے اپنی اپنی ایمبیشن کے یدھ سے تھکے ہاروں کو خود بھی اپنے کتھارسس اور آسودگی کے لئے کوئی کندھا درکار تھا۔ گھروں میں تو بیوی بچوں کے مستقل مطالبات کے علاوہ ہر شام کچھ بھی نہیں رکھا تھا۔

جوگن واقعی پارو کو ندی کنارے گیروا لباس پہنے وہ جوگن دکھائی دینے لگی جو آتے جاتے مسافروں کو آشیرواد دیتی ہے۔ ندی میں بہتے ٹھنڈے میٹھے پانی کے ڈول مہیا کرتی ہے۔

جوگن کی یہ بات بھی پارو کے دل کو بہت لگی تھی کہ ہم جیسی دھتکاری مطلقہ بیوی یا تنہا عورتوں کے لئے کسی بھی کامیاب اچھے عہدے پہ فائز یا کھاتے پیتے طاقتور مرد کی مدد کے بغیر زندگی گزارنا بے حد مشکل ہے۔ ''یا اللہ'' یہ نلکوں کا بے وجہ لیک کرنا۔۔ بجلی کے مبالغہ آمیز بل۔۔ بگڑے ہوئے ٹیلیفون کا مہینوں درست نہ ہونا۔ نوکر شاہی کی گستاخی۔ اس مکان سے اس مکان تنہا شفٹ کرنا۔ ہمسایوں کی مشکوک نگاہیں۔ مردوں کی مدد اور چستی کے بغیر واقعی کیسا مشکل تھا سب کچھ۔ ''زمن'' جیسے نیم مردہ جیلی فش مرد کی موجودگی میں بھی پارو کو ان چھوٹی چھوٹی روزمرہ رکاوٹوں کا کبھی احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ ''جوگن'' کے تمام دوست تو ایسی نجی مددگار طبیعتوں کے مالک تھے۔ جوگن کے گھر کی تمام چھوٹی موٹی الجھنیں جوگن تک پہنچنے سے پہلے حل ہو جاتی تھیں۔ گرمی کا موسم چڑھتے ہی پیل (PEL) اے سی کمپنی کے پروپرائٹر نے جوگن کے دونوں اے سی' فیکٹری منگوا کر سروس' گیس کی کمی بیشی' سب چیک کروا کے از خود اس کے بیڈ روموں میں نصب کروا دیئے تھے۔ لیکن جوگن ہی کے مشورے پر جب پارو نے اپنا پسینجر ٹرین کی طرح گڑ گڑ گڑ کرتا اکلوتا اے سی حفیظ اللہ صاحب کی فیکٹری بھیجا۔ تو لاہور کی بدن پہ آبلے ڈالنے والی جون کی لو برسات کی رم جھم میں تبدیل ہونا شروع ہو گئی اور اے سی کی واپسی کی خبر کہیں سے نہ آنی تھی نہ آئی۔

پچھلے چھ ہفتوں میں جب سے پارو نے جوگن کے اصرار پہ اس کے ایڈ مائرزز admirers کی شبینہ محفلوں میں باقاعدہ آنا شروع کیا تھا۔ کوئی خاص اکھڑ کھری بات یا رویہ تو نہیں دکھایا تھا۔ بلکہ نرجس کے کہنے پر اس نے اپنے کٹے ہوئے بالوں میں نسواری رنگ کی سٹریکنگ (streaking) کروا کر نیچے کٹے گلے کا کرتہ بھی پہن لیا تھا۔ پھر بھی ان سب کے ہاتھوں پہ ہاتھ مارنے ڈنر ڈانس میں اوٹ پٹانگ حرکات کرنے کے باوجود ان سب کی نگاہوں میں پھیلے بیگانگی کے سائے اور تحیر اسے اپنا آپ دال میں کوکڑو سے زیادہ کچھ نہ لگتا۔ جب کہ گاؤ تکیے پہ نیم دراز جوگن کی مسکراتی ہوئی چپ بھی' ان سب کے بدنوں میں پارہ گھول دیتی۔

شاید پارو کے پیٹ کے پرانے السر کی وجہ تھی ''زمن'' کے ساتھ گزارے ہوئے دنوں کی مردنی' روپے کی کمی' یا بچپن میں قرآن پڑھانے والی بی بی جی کہ یہ ممنوعہ وہ ناپسندیدہ ہے۔ شرم و حیا وغیرہ کی اوٹ آف ڈیٹ' رکاوٹیں۔ جو کسی طرح اس ذہین و فطین دوستوں کے گروہ کے ذہنوں تک اتر جاتی تھیں۔

یہ شراب نہیں پارو۔ روسی زاروں (Czars) کا ہیلتھ ڈرنک ہے۔ کلیم لایا تھا ازبکستان سے۔ کمشنر اسد اللہ نے نیلی میناکاری والی جام پارو کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کم آن پارو۔''

جوگن بولی۔

''بھئی ہم سب سے اعلیٰ جانتی ہے یہ اپنے آپ کو۔ ''جوگنیا'' آپ کی دوست ہم سب میں شامل ہونے سے ہچکچاتی ہے۔'' ہڈی کے سپیشلسٹ ڈاکٹر ''انیس'' نے کلیم سے ایرانی مینا کاری والا جام ٹکراتے ہوئے کہا۔

''آپ بالکل غلط سمجھ رہے ہیں۔ مجھے اپنے بارے میں ایسا کوئی زعم نہیں۔ میں ایک بالکل معمولی' آلودہ عورت ہوں۔ ویسے ہی الرجک ہوں شراب سے اس کی مہک اچھی نہیں لگتی۔ حلق میں عجیب سے کانٹے چبھنے لگتے ہیں۔ شادی کے فوراً بعد میرے شوہر نے بھی مجھے ایک بار بیئر پلا دی تھی زبردستی تب سے الرجی سی ہو گئی ہے اس سے۔ لیکن اگر یہ ہیلتھ ڈرنک ہے تو شاید مختلف ہو۔'' پارو نے ووڈکا کا پہلا گھونٹ زبردستی گلے کے اندر انڈیلتے ہوئے کہا۔

ان سب' اس اعلیٰ درجے کے دوستوں کے گروہ کی اجتماعی تالیاں۔ اس کے بدن مین زوں زوں' آندھی کی طرح بھاگتے سناٹوں کا علاج تو تھا۔ اور ان کے قریب بیٹھ کر پاروں کی شفیق مسکراہٹوں اور مدارات میں' اس کی بے سمت زندگی میں ہلچل تو ضرور مچتی تھی۔ لیکن اتنی ان گنت شامیں اور دن ان سب کے ساتھ گزارنے اپنے آپ کو اس خوش باش جتھے کا انوٹ انگ بنانے کی ہر کوشش کے باوجود اسے لگتا تھا ٹوٹے پیانو کے کسی اکھڑ کھرے سر کی طرح ایسا کہیں کچھ ضرور ہے جو اسے ان میں سے کبھی نہیں ہونے دے گا۔

مزاج مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی دوست یا ساتھی تو پارو اور نرجس اوائل عمری سے ہی تھیں۔ شاید اس لئے بھی کہ حالات کے کسی نہ کسی تقاضے کسی نہ کسی رخ کی بنا پر بچپن سے ان کی تعلیم سکول کالج جانے کے راستے ایک تھے۔ دوستوں کی ٹولیوں اور کلاسوں میں مضامین کی سانجھ تھی۔ کالج پہنچتے' پہنچتے تو وہ ایک دوسرے کی سنگت کی خاطر جان بوجھ کر ایک سے مضامین اور ایک سے اساتذہ چنا کرتی تھیں۔

کالج میں بھی دونوں کے درمیان نرجس عرف جوگن کا مردلبھا رویہ' اکثر اوقات باعث اختلاف بنتا۔ جنس مخالف کی سٹوڈنٹ ٹولی دیکھ کر اس عمر میں بھی نرجس کے بدن میں ڈاکٹر جیکال کی طرح ہیئت بدل تورکنڈے کھڑے ہو جاتے۔ پارو پیچھے سے دوپٹہ کھینچتی رہ جاتی اور وہ اپنے انتڑیوں تک لمبے بال جھٹکاتی۔ نیند میں چلنے کے عادی انسان کی طرح' از خود لڑکوں کے رخ چل پڑتی۔ تب اس کے بے ساختہ قہقہوں کی وجہ سے کالج کے تمام گل نستر کے درختوں کی شاخیں ترنگ میں جھولنے لگتیں۔

کالج میں لڑکوں نے ''نرجس'' کا نام ''جوگن'' بھی اس کے ہر دم کھلے ایڑیوں تک لمبے بال' جھل دللے' بغیر فٹنگ کپڑے اور بھکشوؤں جیسی ایڑیاں گھسیٹ چلنے والی فلیٹ چپل دیکھ کر ڈالا تھا۔

تب بھی چاندنی میں گندھے سڈول بدن اور ستواں ناک والی پارو جوگن کی لڑکوں میں اتھاہ مقبولیت دیکھ کر اک گونا رشک سے سوچا کرتی۔ رنگت میدہ شہاب نہ ہوتا۔ تو جوگن کی بے طرح پھیلی ناک کے دونوں طرف دہکتے کوئلے' دیکھ کر گردنیں اسے مڑ مڑ دیکھنے کی بجائے' اس کے ٹھٹھے اڑایا کرتیں.........

لیکن پھر عجیب ہوا۔ سوں سوں لوستے کالج کے ان گنت ایڈ مائرز کہیں ہوا میں معدوم ہو گئے اور ''نرجس'' کی شادی پارو سے چند ماہ بعد ایک انا نیت مارے کلی کلی رس چوسنے والے امیر کبیر بھنورے سے ہوگئی۔ جو اسے تقریباً جوتی کی نوک پہ رکھتا تھا۔ اور وہ جس کی محبت میں بری طرح گرفتار ہوگئی تھی.........

''پانسہ الٹا پڑ گیا۔ دعا کرنا۔'' اس نے پارو کو لکھا تھا۔

پانسے تو شادی کے بعد دونوں کے ہی الٹے پڑے تھے۔ پارو کا صراط مستقیمی تھا کہ کبھی کبھار اسے لگتا وہ کوے میں پڑے دو مریض ہیں۔ جن کا روزمرہ کے گرم و سرد سے کوئی واسطہ نہیں۔ انہیں اسپتال کے ایک ہی کمرے میں ساتھ ساتھ ڈال کر کہہ دیا گیا ہے کہ موت کا انتظار کرو۔

پھر دونوں سہیلیاں ایک لامتناہی چپ کے بعد آپس میں بولیں تو دونوں اپنے اپنے شوہروں سے فارختیاں لے چکی تھیں۔ ''نرجس'' اپنے شوہر جمال سے شدید محبت کے باوجود یکے از ان گنت خواتین بننے سے تنگ آ چکی تھی اور پارو کا خاوند کوالا لمپور کے ایک دورے کے دوران اچانک کوے سے اٹھ گیا تھا۔ اور ایک ننھی سی ناک اور سوئی سوئی آنکھوں والی چینی لڑکی اپنے ساتھ لا کر اس نے پارو سے کہا تھا۔ شادی کرتے وقت ''میاک'' نے مجھ سے تحریری عہد نامہ لے لیا تھا کہ میرے گھر میں اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں ہوگا۔ میں معذرت کے ساتھ یہ کچھ رقم اور طلاق نامہ پیش کرتا ہوں۔

یہ احساس تو ''می یاک'' کے اچانک میری زندگی میں آ جانے کے بعد مجھے ہوا کہ میرے بدن کے تمام مسام بند تھے۔ اور میرے دونوں پھیپھڑوں میں تازہ ہوا کا جھونکا کبھی نہیں گیا تھا۔

اور پھر مہینوں بے ٹھکانہ ادھر سے ادھر تنہا بھٹکتی پارو اکثر سوچتی کہ شہ مات دینے کے لئے اوپر والے زور آور کو کیا مجھ جیسی نہ ہونے کے برابر بے وجود کے علاوہ کوئی نہیں ملا تھا۔

''نرجس'' کے بارے میں بھی درمیان میں ان دونوں کی کامن دوست نبیلہ نے اسے بتایا تھا کہ اس کے شوہر کی طرف سے اس کی محبت کو مکمل طور پر رد کئے جانے نے اس میں انوکھے ردعمل پیدا کئے ہیں۔

پھر ایک بار اچانک فلیٹوں کی اسی مڈل کلاس کالونی میں جہاں پارو رہتی تھی۔ کیمسٹ کی دکان پہ پارو کا ٹاکرہ ''نرجس'' سے ہوگیا۔ تب تک اکیلے رہتے رہتے وہ روزمرہ کی زندگی' قصاب' دھوبی' بجلی والے' پلمبر' فون بل وغیرہ کی سیلف ہیلپ کے کافی گر بھی جان چکی تھی۔ اور تھکی تھکی شکستہ بھی تھی۔

نرجس کی ٹویوٹا کار کا دروازہ کسی تھری پیس سوٹ والے (executive) ایگزیکٹو نے کھولا تھا۔ وہ ویسی ہی مسکراتی' لشکتی' جھلکتی پر اعتماد تھی۔ اور اس کے چہرے پہ ریجیکٹ (reject) کئے جانے والی عورت کی شکستگی بالکل موجود نہیں تھی۔

یہ میرے قریبی دوست ''کلیم'' ہیں نرجس نے پر اعتماد لہجے میں تھری پیس سوٹ والے سے پارو کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ اور ''کلیم'' یہ بی بی میری مکمل زندگی کے تاریخ جغرافیئے کی مالک ہے۔ یعنی شاید تم سب

سے زیادہ قریب---

''تو پھر میں ان بی بی سے خوفزدہ ہو کر تم دونوں کو اس وقت اکیلا چھوڑتا ہوں'' کلیم نے اپنی بڑی سی پجیرو میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میرا دو بچھڑی دوستوں کے درمیان موجود رہنا غیر مناسب ہوگا۔''

تمہارے بارے میں سب جانتی ہوں۔ لیکن حسن اتفاق کہ ہم دونوں ایک ہی شہر اور ایک ہی کالونی میں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ اور اب میں تمہیں ایک پل بھی اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ اس نے پارو کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت سے نچوڑتے ہوئے کہا۔

''فیصل جیسی پہاڑ انانیت اور خود پرستی کے ساتھ زندگی گزارنا کسی کے لئے بھی ناممکن تھا۔ خواتین کے معاملے میں ایک ماہر سکی (skii) کرنے والے کھلاڑی کی طرح پہاڑ در پہاڑ پھسلتے رہنا اس کی زندگی کا ماحصل تھا۔ میری شدید محبت اس کے راستے کی رکاوٹ تھی۔ بہرکیف وہ سب ایک مردہ داستان ہے۔ اور آج شام جب تم میرے فلیٹ میں ڈنر پر آؤ گی تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا محبت کا ایک در بند ہوتا ہے تو سو در خود بخو کھلنے لگتے ہیں۔ اور ہم لوگ تو ایک نام کا دیا جلا کر خوانخواہ اپنا آپ راکھ کرتے ہیں۔ محبت تو چاروں طرف قدرتی طور پر بہتا ایک مہان ساگر ہے۔ ذرا سا ہاتھ آگے بڑھاؤ آنکھ کھول کر دیکھو۔ محبت تمہارے اردگرد گل بوٹے کاڑھنے لگتی ہے۔ لمحہ موجود ہمیں از خود دونوں ہاتھوں سے تھامتا ہے۔'' وہ کسی بڑی فلسفہ دان کی طرح بولی۔

وہ سب جن سے تم آج شام میرے فلیٹ پہ ملو گی۔ اعلیٰ عہدوں پہ فائز حد درجہ تعلیم یافتہ لوگ ہیں۔ ''رشتوں اور محبتوں میں وہ سب بھی کسی چیز یا پابندی یا ملکیت کے قائل نہیں۔ تم دیکھو گی وہ سب تمہیں تھوڑی ہی دیر میں چہچہاتے معصوم سے لو برڈز دکھائی دینے لگیں گے۔ سریلی بولیاں بولنے والے۔ مشکل گھڑی میں ایک دوسرے پر جان ہارنے والے۔ بس تم لباس جاذب نگاہ اچھا سا پہن کر آنا۔''

مجھ پر بھی ایک پر اعتماد عورت ہونے کے باوجود وہ وقت آیا تھا جب میرے شوہر کی ایک ''چھو'' مجھے بہت سے نیلے آسمانوں کی سیر کراتی تھی۔ لیکن اتنی ڈھیر ساری اندر باہر کی ٹوٹ پھوٹ کے بعد مجھ پر یہ کھلا کہ وہ محض میرے اپنے ہی اندر کی از منوں پرانی روایتی عورت کے خواب اور خواہش تھیں۔ اس اڑنگ بڑنگ بے سمتی میں بھاگتی زندگی میں جو کچھ بھی ہے بس لمحہ موجود ہے۔'' اس نے فلیٹ پہ جاتے ہوئے میرا کندھا تھپتھپا کر کہا۔

جوگن سے ملنے کے بعد میں کسی انگریز ٹین ایجر (teen ager) کی محبوب سے پہلی ملاقات پر جانے کی طرح پیاں بھار کھڑی تھی۔

وہ سارے ڈی آئی جی حفیظ' ریلوے وزیر شجاعت علی سیکریٹری خوراک' ہڈی سپشلٹ' دومن ڈویژن کی آمنہ۔ سب لوگ واقعی اونچے درجے کے تعلیم یافتہ لوگ تھے۔

جوگن کا اینٹیق مصوری اور ایرانی قالینوں بھرا شاہانہ فلیٹ اونچی پسند اور نفاست کا نمونہ تھا۔

زندگی کا الڑ بلو سے بھاگا ایسا آسودگی بھرا سریلا ماحول میں نے پہلے شاید ہی کبھی دیکھا ہو۔

سرخ وائن کا گلاس سامنے رکھے اپنے جوگن بال پھیلائے گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ان سب سے توں تڑاک کرتی بڑی پر اعتماد تھی۔ وہ سارے بھی اپنی اپنی کسی ہوئی افسرانہ جیکٹیں اور کوٹ اتارے بے تکلفی سے ادھر ادھر پھیلے پارو کو بڑے دلچسپ لگ رہے تھے۔

''دیکھو یہ میری برسوں پرانی دل جانی دوست ہے۔ اگر تم سب لوگوں نے اسے ہتھیلی کا چھالہ بنا کر نہ رکھا تو دوستی کلب بند۔''

''آپ کو سفارش کرنے کی ضرورت نہیں محترمہ۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔'' ہڈی کے ڈاکٹر نے پارو کو سرتاپا ایک گہری مدعو کرنے والی نگاہ مارتے ہوئے کہا۔

پارو نے بھی پوری شام ان سب میں گھل مل جانے' ہاتھوں پہ ہاتھ مار کر بات کرنے ڈنر ڈانس میں شمولیت۔ کچھ کچھ جنسی لطیفوں پر قہقہے لگانے کی بھرپور کوشش کی۔ اپنے بھانویں اس نے اسی شام کے جگنوؤں سے دمکتے لمحوں کو جھولیاں بھر بھر لوٹا۔ لیکن ایک تو اسے لگا پارو صد کوشش کے باوجود ان سب اعلیٰ جدید افسران کے چہروں پہ چھائے اس کی موجودگی کی ایک موہوم سی دھند اور اجنبیت دور نہ کر سکی۔ دوسرے گھر واپس آنے پر پتا نہیں کیوں اس کے چاروں طرف پھیلی زوں زوں کرتی تنہائی اسے بری نہ لگی۔

کیا ہڈی کے سپیشلسٹ' ڈاکٹر ''انیس'' نے رقص کے دوران اس کی کمر پہ بہت نیچے تک ہاتھ جان بوجھ کر پھیرا تھا۔ یا جیسے اس نے فی الفور اس ''چھو'' کی معذرت کر لی تھی۔ ہلکے سے وہ دیر تک تکیے پر لیٹی سوچتی رہی تھی۔

اگلے روز باتوں باتوں میں جب پارو نے جوگن سے ان سب کے گھر بار خاندان کے بارے میں پوچھا۔ وہ پارو کی بات پر اس ٹیچر کی طرح ہنسی بچہ جس سے ضد کر کے پوچھے میں ابو کے پیٹ سے کیوں نہیں آیا؟

''ان کی بیویاں ہماری طرح مڈل کلاس کی شوہروں پہ دھرنا مار کر بیٹھنے والی پینڈو پیسٹریاں نہیں ہیں۔ کاریں کوٹھیاں سیاحت' لگژری ...... اب انہی کے لئے تو کما کر لاتے ہیں یہ لوگ۔ تھکے ٹوٹے' شام کو اکٹھے بیٹھ کر کہیں ہنس بول لیا تو ان سے کیا؟؟ مسز حفیظ تو اس کے شوہر کی ان خوش کن شاموں کے لئے میرا شکریہ بھی ادا کر چکی ہے .... یہ لوگ اب زندگی کے اس مقام پہ ہیں پارو جہاں ان کے تمام اپنوں پہ معاشی اور سماجی تحفظ کی گھنی چھاؤں ہے۔ اسٹابلش (establish) ہونے چوہا دوڑ دوڑنے کے دن اب ان سب سے بہت پیچھے رہ گئے۔''

''اور ہم کون سے کنویں کی ٹنڈیں ہانکتے ہیں ان کے لئے۔ وہ ہماری سائیں سائیں کرتی تنہائی اور اکلاپے کا علاج ہیں۔ ہم ان کی تھکی شاموں کا سہارا۔''

پھر ایک شام حفیظ زیادہ پی جانے کی وجہ سے الٹیوں کا بہانہ لگا کر جب جوگن کے فلیٹ پر ہی سو گیا تو

پارو نے اپنی چارپائی کے گرد خوانخواہ ہی آیۃ الکرسی کا حصار کھینچ لیا......

پھر یہ تو پارو ان شبینہ محفلوں میں جانے سے جان گئی تھی کہ دومن ڈویژن کی آمنہ اور چپل فیکٹری کا پروپرائٹر آپس میں بندھے تھے۔

اسپتال میں کمر کی ہڈی کے ایکسرے کے لئے ڈاکٹر انیس نے جب اسے وی آئی پی ونگ میں لے جانے کے لئے لفٹ کے اندر اپنی دونوں بانہیں اس کے گلے میں ڈالی تھیں تو اسے زیادہ برا نہیں لگا تھا۔ پھر نیو ایئر تقریبات کے لئے پارو جوگن کے ساتھ جب بالوں میں سٹریکنگ (streaking) کرانے گئی تو پیچھے سے اطلاع آئی کہ اسے فی الفور راولپنڈی پہنچنا ہے۔ اس کے والد کی دائیں طرف فالج کا شدید حملہ ہوا ہے۔

بس پارو کی زندگی میں وہ کچھ ایسا ہی وقت تھا جب جوگن کی محفلوں میں اسے ڈاکٹر انیس کے جلدی آنے کا انتظار رہنے لگا تھا۔ آمنہ اور قاسم یا کلیم تو بھری محفل میں ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر جوگن کے گھر کے کسی کونے کھدرے میں جاتے دیکھ کر اس کی زبان پہ چاروں قل آتا بند ہو گئے تھے۔ اور جوگن کے اس فلسفے پر اسے پکا یقین ہو چلا تھا کہ اس فراٹے بھرتی روندکر گزرتی ہنستے بستے مکان کے مکان نچوڑ کر اپنے کندھوں پہ دھر کر بھاگتی' بوکھلا دینے والی زندگی میں جو کچھ ہے لحہ موجود ہے۔ اور اسی لئے اس نے جلدی جلدی میں کچھ سی تھرو see (through کپڑے سلائے تھے۔ اور اپنی پیاری سہیلی کے ساتھ بالوں میں سٹریکنگ ڈلوانے جارہی تھی۔ اور ابا جی کے اچانک مفلوج ہو جانے کی خبر پر وہ دکھ سے پوری چیپا چیپا ہو گئی تھی۔ لیکن دور اندر کہیں اسے لگتا تھا یہ ساری ان لوگوں کی اسے لاہور سے پنڈی شفٹ کرنے کی سازش تھی۔

راولپنڈی کی راول وادی نے آہستہ خرام روایتی سماج میں بچوں کو پڑھاتے شاید پارو کو صدیاں بیت چکی تھیں۔ نہ زندگی سے لڑنے والی کہیں کوئی جنگ تھی نہ چیلنج' بس یکسانیت پارو ایک ہی طرح کے بھوسلے شب و روز گزارتے گزارتے اسے لگتا پیٹ کے ہر گھڑی بھوکتے کتے کی زنجیر بدن سے باندھی ہی اس مقصد کے لئے گئی تھی۔ کہ اسے چپ کرانے کی خاطر بھاگتے رہنا ابد تک انسان کا مقصد بنا رہے۔

''زمن'' کی بھر جوانی کی دھتکار سے لے کر منہ میں اوپر نیچے جھوٹے دانت لگوانے کی سٹیج تک۔ جوگن کے فلیٹ پہ گزری چند شبینہ محفلوں کی یاد ہی ایک لشکارا تھا جو پارو کی ایک جگہ کھڑی زندگی میں کچھ ہلچل پیدا کرتا۔

اب کی بار چھٹیوں میں ان سب سے ملنے لاہور ضرور جاؤں گی۔ ایک دوسرے کی محبتوں کے خوشے چن چن کر اب تک تو ان کی جھولیاں بھی لیر لیر ہو چکی ہوں گی۔ پتا نہیں وہ لوگ کچھ اور بڑے افسران بن گئے ہوں یا پھر ریٹائر ہو کر اپنے اپنے عالی شان بنگلوں کے باغوں کے کنجوں میں کہیں......

اور جوگن؟ اس کی وہ روشنیوں کی ننھی ننھی کرنیں بکھیرتی مسکراہٹ؟ سارا میرا اپنا قصور ہے۔ وہ اب بھی ضرور ویسی ہی ہو گی۔ وہ اکثر اپنی سکول کی کولیگ زرینہ سے کہتی۔ ''چل آج میں تمہیں بھی نور بابا کے ڈیرے پہ لے جاؤں۔ عجیب عالم برزخ سا ہے بابا نور کا ڈیرہ۔ چور ہو یا قطب دونوں کو ہی محبتوں اور شفقتوں کے

بخورے بھر بھر ملتے ہیں بابا جی سے۔ گناہ ثواب ناپنے تولنے کا وہاں رواج ہی نہیں ہے۔ چرسی بھی ڈیرے کے چھتنارے درختوں تلے منجیاں ڈالے سوتے ہیں اور عابد بھی......

بس کرنا وہاں کچھ بھی نہیں۔ بابا جی یا بی بی جی کے ہاتھ سے دال روٹی لے کر کھانی ہے۔ کچھ دیر آرام کرنا ہے اور وہ جو ایک حرف بتائیں قرآن میں سے اسے پڑھتے ہوئے واپس آنا ہے۔'' وہ بولی۔

''بی بی جی کیا بابا جی کی بیوی ہیں؟''

''پاگل بابا جی کی شادی کی عمر نہیں ہے اب۔ تمہارے دادا جتنے ہوں گے اب۔ اور بی بی'' خالی بھانڈا'' تو ابھی بمشکل تمہاری عمر کی ہیں۔ خود ہی آ کر بیٹھ گئیں ایک دن ڈیرے پر۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد خالی بھانڈا کہتی ہیں اور لوگوں کے برتنوں میں کھانا ڈالتی جاتی ہیں دیگوں میں سے نکال نکال کر...... میں تو کشمیری چائے پینے جاتی ہوں۔ بی بی جی کے ہاتھ کی بنی ہوئی۔''

''خوشبو ہی خوشبو۔'' زرینہ نے پارو کو نور بابا کے ڈیرے پہ لے جاتے ہوئے کہا۔

بی بی جی کے کچھ کچھ پھیلے نتھنوں کے گرد ہیرے کے کوکے بدستور نہ دمک رہے ہوتے تو پارو اس چٹی چادر میں لپٹی فربہ بدن عورت کو جو آنے جانے والوں کے بخورے کھانے سے بھر رہی تھی کبھی پہچان نہ پاتی۔

جوگن کے چہرے پہ اک گونا اداسی اور گھمبیرتا تو تھی لیکن وادیوں میں مزے مزے بسنے والا ایک ٹھہراؤ بھی تھا۔ ایک انوکھا بھروسہ اور اعتماد...... ہونٹوں پہ پھیلی مخصوص دیالو مسکراہٹ اور آنکھوں میں ہاری ساری کو خوش آمدید کہنے والی چمک بدستور قائم تھی۔

وہ رک رک کر اونچے آواز میں خالی بھانڈا کہتی۔ پھر دیگ میں سے چمچہ بھر کر سائل کے پیالے میں ڈال دیتی............

''بی بی جی۔ بٹی بیمار ہے۔ اس کے لئے دعا کرانی ہے جی آپ سے۔''

''فصل کو کیڑا پڑ گیا' غریب آدمی ہوں' چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ کوئی اپاؤ بتا دیں بی بی جی۔ آپ کی بات رد نہیں کرتا مالک۔'' سائل پیالہ بی بی کے سامنے کرتے کرتے کہتے۔

پھر وہ جگت ماں کی طرح ان کے سروں پر ہاتھ دھر کر منہ میں کچھ پڑھتی اور وہ شادمانی سے آگے بڑھ جاتے۔

پارو نے پیالہ آگے بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑا۔

''زندگی بتانے کا ڈھنگ ابھی تک نہیں آیا بی بی جی۔ جلے پاؤں کی بلی کی طرح ابھی تک ''تڑفنی'' نہیں جاتی۔'' پارو بولی۔

ایک پل رک کر اس نے بغور پارو کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت سے نچوڑے۔

''میرا بھی پورا بھانڈا خالی ہے پارو۔ چاروں طرف گھمر گھمر خالی شور کے سوا کچھ بھی نہیں۔ گھنڈی تو کوئی بھی نہیں کھول سکا۔ مجھے تو تم جانتی ہو۔ خلقت بنا جینا نہیں آتا۔ اب شاید یہیں سے بھر جائے۔ ان سب کی محتاج ہوں۔ سب کچھ خالی۔ بس گھمر گھمر شور۔''

اس نے زور سے پکڑے میرے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اور دوسرے کے بخورے میں سالن بھرنے لگی۔

اور پارو اس دن بھی گھر آ کر تنہائی میں مار کھائے بچے کی طرح دیر تک بھائیں بھائیں روتی رہی تھی۔
پہلے بھی روشنیوں سے اس کا دامن بھرا رہا۔ اب بھی راہیں اسی کے لئے استوار ہیں۔
انصاف کی تو کہیں کوئی زنجیر ہی نہیں۔ جو چاہے سو آپ کرے ہے۔
''جوگن'' کا تو شاید اسے نام ہی بھا گیا تھا۔
پارو نے تکیہ منہ پر رکھ کر بے وجہ روتے روتے سوچا۔

سائیں جیوا

رفیق ڈوگر

پھٹے ہوئے کپڑے' ننگے پاؤں' سر میں دھول اور آنکھوں میں بھرے شعلے وہ اچانک ہی کہیں سے نمودار ہو گیا تھا جیسے ہاڑھ کی کسی گرم دوپہر میں واورولا آئے اور اس میں سے کوئی خوفناک آنکھوں والی چیز برآمد ہو جائے'' آج کا سورج غروب ہونے تک تم یہاں سے دفان نہ ہوئے تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا'' اس نے لاٹھی لہراتے ہوئے مال افسر کو دھمکی دی۔

میں اسے کئی سال سے جانتا تھا میں ہی کیا بھسین کے بچے بوڑھے عورتیں مرد سب ہی سائیں جیوا کو جانتے تھے وہ بہت ہی مسکین قسم کا سائیں ہوتا تھا اور کبھی کسی نے اسے اونچی آواز کرتے نہیں سنا تھا اور اس روز وہ بہت غصے میں تھا اس کی آنکھیں شعلے اگل رہی تھیں وہ لاٹھی لہرا رہا تھا اور جلال اس کے وجود پر غالب آ گیا تھا ''زندہ رہنا چاہتے ہو تو اپنا بدبودار وجود یہاں سے دور دراز لے جاؤ آج کا سورج غروب ہونے سے پہلے سکول سے چلے جاؤ۔''

مال افسر کی حالت تو ایسے ہو گئی جیسے موت کے فرشتہ نے پاؤں سے شروع کر کے کمر تک اس کی جان نکال لی ہو وہ ہلنا چاہتا تھا مگر ہل نہیں سکتا تھا' بولنا چاہتا تھا اور بول نہیں سکتا تھا اور تحصیلدار' گرداور' پٹواری' گاؤں کا نمبردار اور حاضر سائل سب خوفزدہ ہو گئے تھے۔ ابھی تو وہ سب ہنس رہے تھے جنگ زدگان کی آبادکاری کے خاکوں میں خوبصورت رنگ بھر رہے تھے اور اب سارے ہی دم بخود تھے خوفزدہ تھے اور سائیں جیوا نے اچانک کہیں سے نمودار ہو کر ان کے رنگ میں بھنگ ڈال دیا تھا سائیں اکیلا ہی سب پر لاٹھی تانے کھڑا تھا اور وہ سارے ہی اس کے جلال کی ہیبت کی زد میں آ گئے تھے۔

گاؤں کے جنوب مشرق میں ہسپتال سے ملے سکول سے آگے ایک ویران۔ بے آباد میدان ہوتا تھا جب کبھی ہندوستان کی طرف آسمانوں سے پانی وافر برس جاتا تھا تو وہ میدان جل تھل ہو جاتا تھا اور پانی سوکھ جانے پر پھر سے پانی کے لئے دعائیں شروع کر دیتا تھا اس میدان کے کنارے کے ساتھ ایک ویران ٹیلہ تھا جس کی ڈھلوان پر گئے گزرے زمانوں میں بنائی ایک قبر تھی وہ قبر کس کی تھی کوئی نہیں جانتا تھا قبر کس نے بنائی تھی کب

بنائی تھی کسی کو کچھ علم نہیں تھا۔ اس قبر کے قریب اور کوئی قبر نہیں تھی قبر کے گرد تین چار فٹ اونچی چار دیواری تھی جس میں بغیر کواڑ ون کے ایک چھوٹا سا دروازہ تھا اتنا چھوٹا کہ چھوٹے سے چھوٹے قد کے بندے کو بھی اس میں سے گزرنے کے لئے دوہرا ہونا پڑتا تھا بے آباد میدان' ویران ٹیلہ اور ایک پرانی قبر اور اس کے پاؤں میں پرانے درختوں کا جھنڈ اور سائیں جیوا اور اس کا کتا ڈبو۔

اس قبر پر نہ کبھی کوئی عرس ہوتا تھا نہ میلہ لگتا تھا اور نہ ہی کوئی نذر نیاز گزارنے اور چڑھاوا چڑھانے آتا تھا۔ سائیں جیوا اس کے مجاور ہوتے تھے ہوسکتا ہے وہ مجاور نہ ہوں کچھ اور ہوں مگر جو کچھ بھی تھے سب کچھ وہی ہوا کرتے تھے اور دن اور رات کے ہر لمحہ میں آندھی اور طوفان میں ڈبو کتا ان کے ساتھ رہتا تھا سائیں جی بولتے بہت کم تھے اور ان کا کتا بھونکتا بہت تھوڑا تھا مگر اس روز سائیں اتنا زیادہ بول رہا تھا کہ اور کسی کو بولنے کی جرات نہیں ہو رہی تھی۔

اکیلی قبر کے پاؤں سے لپٹے بوڑھے درختوں کے جھنڈ سے ذرا آگے آم کا ایک باغ تھا اس باغ سے آگے ایک اور باغ تھا اور ایک سے ملے ایک آم کے باغوں کا وہ سلسلہ ہندوستان کی سرحد پر کھنکھنی کوڈا تک چلا گیا تھا سرحد سے آگے بھی پل کنجری تک باغ ہی باغ تھے جب ساون بھادوں میں برکھا رنگ دکھاتی تھی اور گنے چری اور چاول کی فصلیں سرمئی لباس پہن لیتی تھیں تو باغوں میں بچھے سبزہ کے قالینوں پر مور مستانہ وار ناچتے اور گاتے رہتے تھے میں جب کبھی صبح سویرے موروں کا ناچ دیکھنے اور گیت سننے جاتا تھا تو سائیں جیوا اپنے کتے کے ساتھ کسی درخت کے نیچے خاموش پڑے ہوتے تھے اور ان کے چاروں طرف مور ناچ رہے ہوتے تھے گا رہے ہوتے تھے اور دن رات کے ہر لمحہ میں ان کا ساتھی کتا موروں کی محفل میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہتا تھا۔

''سائیں جی ڈبو کہاں گیا وہ آپ کے ساتھ کیوں نہیں؟'' میں نے ان کی توجہ مال افسر سے کتے کی طرف موڑنا چاہی۔

میں نے اس لاٹھی کے ساتھ اسے مار دیا تھا آج کے سورج کے ساتھ اگر یہ بھی سکول سے دفان نہ ہو گیا تو میں اسے بھی کتے کی موت مار دوں گا۔''

میں سائیں جیوا کے بارے میں پریشان ہونے لگا اللہ نہ کرے سائیں کے ساتھ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی؟ اس نے اپنا جان سے پیارا کتا مار دیا ہے مال افسر کو مار دینے کی دھمکیاں دے رہا ہے چلا رہا ہے لاٹھی لہرا رہا ہے یہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ تو ایسا نہیں ہوتا تھا چھ ستمبر کی صبح تک یہ ٹھیک ٹھاک تھا ہم اسے اور اس کے کتے کو ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گئے تھے یہ گولوں اور گولیوں کے ناچ کا تو کہیں اثر نہیں ہو گیا سائیں کے دماغ پر؟

پانچ ستمبر کی صبح سے ریڈیو نے بتانا شروع کیا تھا کہ پاکستانی فوجیں کشمیر کے محاذ پر بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں دن کے بعد رات بارہ بجے تک ہم ہسپتال کے لان میں بیٹھے اس پیش قدمی پر خوش ہوتے رہے تھے میں' ہسپتال کا بنگالی ڈاکٹر' ہائی سکول کا سیکنڈ ہیڈ ماسٹر' یونین کونسل کا سیکرٹری اور سائیں جیوا ریڈیو سیٹ

کے گرد بیٹھے خوشی کی خبریں سنتے رہے تھے اور خوش ہوتے رہے تھے اور جب ہم سب اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف گئے تھے تو سائیں اور ان کا کتا خوش وخرم ٹیلے کی طرف چلے گئے تھے اس رات کے پچھلے پہر بھسین کے آسمان کو آگ لگ گئی تھی شمال میں اچوگل کی طرف اور جنوب میں واہگہ کی طرف سے توپوں' ٹینکوں اور مشین گنوں نے آگ اگلنا شروع کر دیا تھا گاؤں کے اوپر سے آگ کے گولے اڑتے ہوئے جا رہے تھے آسمانوں کے ستارے اس آگ کے پیچھے کہیں نابود ہو گئے تھے اور لوگ آگ کی اس سرنگ میں زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے گاؤں کے درختوں اور باغوں میں سونے والے پرندوں کی فوجوں نے گاؤں پر اپنے پروں کی چادر تان دی تھی پرندوں کی فوجیں فضا میں اور گاؤں کے لوگ مکانوں کی چھتوں پر نعرے لگا رہے تھے اور آگ کی سرنگ کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا اور اس گھیرے میں لوگ نعرے لگا رہے تھے' خندقیں کھود رہے تھے' دشمن کے مقابلہ کے لئے کلہاڑیوں کے پھل تیز کر رہے تھے اور اپنی اپنی ڈانگوں کو تیل لگا رہے تھے پاکستانی فوجوں کی کشمیر کے محاذ پر پیش قدمی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارتی فوجیں لاہور کے محاذ پر نمودار ہو گئی تھیں اور بی آر بی کے ہمارے والی طرف پاکستانی فوج کا کوئی پتہ نشان نہیں تھا۔

سرخ خونی وردی چمکا کر جب سورج بھارتی فوجوں اور توپوں کی کارکردگی کا جائزہ لینے کو بیدار ہوا تو میں اور یونین کونسل کا سیکرٹری بنگالی ڈاکٹر کی خیریت لینے گئے۔ نحیف و ناتواں ڈاکٹر مرہم پٹی اور تانگے توپے کی تیاریاں مکمل کر کے لڑائی میں شامل ہونے کو تیار بیٹھا تھا اور اس کی بیوی سائیں جیوا اور اس کے کتے کے لئے فکر مند ہو رہی تھی وہ دونوں ابھی تک ناشتہ کرنے نہیں آئے تھے ہم سائیں جیوا اور ان کے کتے کے لئے ناشتہ لے کر گئے تو ویرانے میں بنی اس اکیلی قبر کے پاؤں کے درختوں کے جھنڈ سے ملے آم کے باغ میں موروں کی فوجیں جمع ہو رہی تھیں ہر طرف سے اور ہر باغ سے لمبی لمبی اڑانیں بھرتے ہوئے اور تیز تیز دوڑتے ہوئے موروں کے قافلے اس باغ میں جمع ہو رہے تھے اور سائیں جیوا دیوانہ وار دوڑے پھر رہے تھے وہ زخمی موروں کو اٹھا اٹھا کر لا لا کر جوہڑ کے کنارے لٹا رہے تھے زخمی مور چیخ رہے تھے پھڑ پھڑا رہے تھے زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مر رہے تھے اور سائیں جیوا ان کے زخم صاف کر رہے تھے انہیں پانی پلا رہے تھے اور باغ میں دیوانہ وار دوڑے پھر رہے اور ان کا کتا ان کے ساتھ تھا۔

سائیں جیوا نے ناشتے کا دودھ مٹی کے دو پیالوں میں ڈال کر ایک پیالہ کتے کے سامنے رکھ دیا اور دوسرا ایک زخمی مور کے چونچ سے لگا دیا مور نے آنکھ جھپک کر پیالے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی اور پھر دونوں آنکھیں کبھی نہ کھولنے کے لئے بند کر لیں سائیں جیوا کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ''ڈاکٹر جی یہ تو مرتے ہی جا رہے ہیں۔''

زخمی بہت تھے اور سائیں جیوا اکیلے تھے اور ڈاکٹر کے پاس زخمی موروں کی مرہم پٹی کا سامان نہیں تھا اور جوہڑ کے کنارے کے ساتھ ساتھ بہت سے مردہ مور پڑے تھے اور باغ میں زخمی مور چیخ رہے تھے پھڑ پھڑا

رہے تھے اور سائیں جیوا انہیں مرتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور رو رہے تھے اور دوڑتے پھر رہے تھے۔
جنگ بندی کے دنوں میں بنگالی ڈاکٹر اور میں خصوصی اجازت پر بھسین کا احوال جاننے کے لئے گئے تو اس پرانی قبر کے پاس جو ہڑ کے کنارے ایک اور قبر بن گئی تھی سائیں جیوا نے سترہ روز جنگ میں مارے گئے سارے موروں کو ایک ہی گڑھے میں ڈال کر ان کی مشترکہ قبر بنا دی تھی اور وہ موروں کی اس مشترکہ قبر کے بھی مجاور بن گئے تھے ہر طرف توپوں اور ٹینکوں کے گولے بکھرے ہوئے تھے آم کے باغ کا کوئی ایک بھی درخت سلامت نہیں تھا گولوں سے چھلنی ٹنڈ منڈ درخت سوکھ گئے تھے مر رہے تھے اور سائیں جیوا قبر کی چار دیواری کے سایہ میں خاموش بیٹھے تھے۔
ہسپتال اور ہائی سکول میں پاک فوج تھی ویران کھلے میدان کے دوسری طرف ہندو اور سکھ فوجی چل پھر رہے تھے بھسین گاؤں میں بھی پاک فوج کے جوان اور افسر مقیم تھے اور گاؤں کے جوہڑ کی دوسری طرف ہندو سکھ تھے اور دونوں فوجوں کے درمیان بارودی سرنگیں بچھا دی گئی تھیں اور گاؤں کے کتے بارودی سرنگیں سونگھ سونگھ کر بھارتی فوجوں کی طرف آتے جاتے رہتے تھے اور دونوں طرف کا کھا کھا کر بہت موٹے ہو گئے تھے دھرتی کا سینہ چھلنی ہو گیا تھا برباد مکانوں کے ملبہ میں گاؤں کی گلیوں اور بازاروں میں اور کھیتوں میں ہر طرف ہر کہیں توپوں اور ٹینکوں کے گولوں کی اور ان کے خولوں کی فصل لہلہا رہی تھی اور کتے بڑی آزادی سے گھومتے پھرتے رہتے تھے اور دونوں طرف سے کھا کھا کر بہت موٹے ہو گئے تھے۔
تاشقند میں معاہدہ کے بعد بھارتی فوجیں سرحدوں کے پیچھے چلی گئیں اور جاتے ہوئے سارے باغ اور درخت کاٹ کر ساتھ لے گئیں جن دیہات' آبادیوں اور ڈیروں پر وہ قابض رہی تھیں وہاں کوئی درخت سلامت چھوڑا نہ مکان پختہ مکانوں کی دیواریں تو انہوں نے بنیادوں تک کھود ڈالی تھیں مکانوں کی چھتیں' کھڑکیاں' دروازے اور اینٹیں سب کچھ بھارت کے فوجی جاتے ہوئے ساتھ لے گئے تھے اور پاکستان کی حکومت جلد از جلد ان بستیوں کو آباد کرنا چاہتی تھی اور محکمہ مال کے حکام بڑی تیزی سے آباد کاری میں مصروف ہو گئے تھے اور اس آباد کاری کو اور بھی تیز کرنے کے لئے مال افسر اپنے سارے اختیارات اور عملہ کے ساتھ بھسین آئے ہوئے تھے اور جنگ زدگان کو ان کے نقصانات کا موقعہ پر نقد معاوضہ ادا کیا جا رہا تھا پٹواری' گرداور اور تحصیلدار بستی بستی گھوم کر نقصانات کے تخمینے تیار کرتے تھے اور متعلقہ نمبردار سے تصدیق کروا کر مال افسر فوری ادائیگی کر دیتے تھے اور جنگ زدگان ان سے بہت خوش تھے مگر سائیں جیوا ان سے بہت ناراض تھے اگر کسی کا دو کمروں کا گھر ہوتا تو مال افسر صاحب اسے چار کمروں کا معاوضہ ادا کر دیتے تھے جس کے چار مویشی ضائع ہوئے تھے اسے آٹھ مویشیوں کی رقم مل رہی تھی اگر کسی بندے کے کلیم داخل کرنے سے پہلے ہی اس کے نقصانات کی نقد ادائیگی ہو چکی ہوتی تھی تو وہ اس سے نیا کلیم داخل کروا کر نمبردار سے تصدیق کروا لیتے تھے اور اس کے نقصان کا بھی ازالہ کر دیتے تھے وہ بہت ہی نقصان دوست اور انسان دوست مال افسر تھے اور ہر کسی کو اس کے نقصان اور کام کا زر

نقد ادا کر کے بڑی خوشی محسوس کرتے تھے اور سائیں جیوا کا جلال ان کے وجود پر غالب آ گیا تھا "میں تمہیں کتے کی موت مار دوں گا" وہ دھمکیاں دے رہے تھے۔

مال افسر اپنا بوریا بستر اور عملہ سمیت کرہائی سکول سے گاؤں منتقل ہو گئے اور پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے انسانیت کے دکھ درد اور معاوضہ بانٹنے میں لگ گئے لوگ آتے تھے کلیم وصول کر کے جہاں کہیں ٹھکانہ مل گیا تھا واپس چلے جاتے تھے ادھر ان کے رہنے کو مکان نہیں تھے کھیتوں کے لئے پانی نہیں تھا بارودی سرنگوں اور گولوں کی فصل ابھی اٹھائی نہیں جا سکی تھی اور سارے علاقہ میں صرف مال افسر کا ڈیرہ ہی اس وقت تک آباد ہو سکا تھا ایک صبح سائیں جیوا سکول کے کنویں کی منڈیر پر خاموش بیٹھے تھے میں نے سلام کیا انہوں نے گردن اٹھا کر دیکھے بن جواب دیا میں ان کے پاس منڈیر پر بیٹھا رہا وہ دور افق میں کچھ تلاش کرتے رہے اس طرف دیکھتے رہے جہاں کبھی آم کے باغ ہوتے تھے اور ان باغوں میں مور ناچتے ہوتے تھے اور جہاں اب ہر طرف بربادی اور ویرانی تھی "سائیں جی کیا ڈھونڈھ رہے ہو اس ویرانی میں" میں نے بات شروع کرنا چاہی۔

وہ خاموش رہے۔

"سائیں جی لوگ تو کہتے ہیں مال افسر بہت نیک ہے آپ اس پر اتنے ناراض کیوں تھے؟"

"میرے بابا کو اس کی نیکیوں سے ظلم کی بدبو آتی تھی" انہوں نے جواب دیا اور اٹھ کر چل دیئے۔

میں کنویں کی منڈیر پر بیٹھا رہا انہیں موروں کی قبروں کی طرف جاتے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ شاید سائیں جیوا تو اب مجھے پہچانتے ہی نہیں۔

گاؤں میں یونین کونسل کے سیکرٹری کا ڈیرہ بھی آباد ہونے لگا وہ اپنے ساتھ حکومت کی طرف سے دیا ایک ٹرانسسٹر بھی لائے تھے اور عصر کے بعد اس کا بٹن دبا کر اپنے ڈیرے پر بیٹھ جاتے تھے اور بارودی سرنگیں صاف کرنے والے فوجی جوان، گاؤں کا چوکیدار اور بھولے بھٹکے جنگ زدگان دائرہ بنا کر گرد بیٹھ جاتے تھے ریڈیو پر جنگ زدگان کی آبادکاری کی حکومت کی ساری کوششوں کے بارے میں خصوصی پروگرام پیش کئے جاتے تھے اور سیکرٹری صاحب جنگ زدگان کو حکومت کی ان کوششوں سے آگاہ کرنے اور عوام کا اعتماد بحال کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک وہ پروگرام پہنچانے کا اپنا فرض منصبی ادا کرنے لگے تھے ایک سہ پہر ہم سیکرٹری صاحب کے ڈیرے پر بیٹھے اپنی بحالی کے پروگرام سن رہے تھے کہ سائیں جیوا بھی آ گئے سیکرٹری نے آہستہ سے کہا "سائیں جیوا کے ساتھ تو اب ان کی لاٹھی ہی رہ گئی ہے۔"

سائیں جی خاموش بیٹھے جنگ زدگان کی بحالی کے پروگرام سنتے رہے ریڈیو کا منہ بند کر کے سیکرٹری صاحب نے اپنے سامعین کو اپنی زبان سے حکومت کے جنگ زدگان کی بحالی کے پروگراموں سے آگاہ کرنا شروع کیا تھا سائیں جی کھڑے ہو گئے "میرے بابا کے مور اب کہاں رہیں۔ گے باغ تو سب کٹ گئے ہیں؟"

"سائیں جی کیا پتہ مور اب آئیں گے بھی یا نہیں؟" سیکرٹری نے جواب سے بچنے کے لئے سائیں

جیوا سے پوچھا۔
''مور آئیں گے ضرور آئیں گے مور، تم بتاؤ ان کے لئے تم کیا کر رہے ہو؟'' سائیں جیوا کے سوال کا بوجھ بڑھ گیا۔
''سائیں جیوا آپ نے اپنا کتا کیوں مار دیا تھا؟'' سیکرٹری نے جواب سے بچنے کے لئے سائیں جیوا سے پوچھا۔
''اس کے خون میں میرے بابا کے دشمن کا نمک شامل ہو گیا تھا'' سائیں جیوا کی آنکھوں میں جلال جمع ہونے لگا۔
''اس نے تو اتنے سال آپ کا نمک کھایا تھا پھر بھی--''
''ہاں پھر بھی کتے کا بچہ جو تھا'' سائیں نے اس کی بات کاٹ دی۔

نخلِ جاں ، کاش ، ویرانہ ، پنچھی ، نیند ، جیون ، برسات
کے بعد
اسلم کولسری کا تازہ شعری مجموعہ
عنبر
مکتبہ تعمیرِ انسانیت ، اردو بازار لاہور ، فون : 7237500

نروان-عرفان

انور خواجہ

یہ دوسری دفعہ تھی کہ وہ قراقرم کے پہاڑوں میں راستہ بھول گیا تھا۔ اسے دریائے سندھ کی آواز آ رہی تھی لیکن وہ اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ نیچے کہیں سانپ کی طرح بل کھاتی گہری کھائیوں میں بہہ رہا تھا۔

دوپہر کے بعد آفتاب کالے بادلوں سے طلوع ہوا تو تمام وادیاں' ترائیاں اور برفانی چوٹیاں چمک اٹھیں۔ ہر شے میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ذرا آگے چلنے کے بعد اسے دریائے سندھ کی ایک جھلک نظر آئی یوں لگا کہ دور بہت دور ایک پگھلی ہوئی چاندی کی لکیر ہے جو کھائیوں کے خم میں چھپ جاتی ہے۔ سامنے کے پہاڑوں کو صدیوں سے چلتی ہوئی تیز ہواؤں نے کاٹ کر ایک عظیم زینوں کے سلسلہ میں بدل دیا تھا اور ان کے اوپر تودوں پر تودے دھرے تھے اور جب پرانے ہو جاتے اور کھسک کر نیچے نہ آتے تو پہاڑوں کا ایک حصہ بن جاتے۔ نانگا پربت کی چوٹی اسی عمل سے ہر سال بلند ہوتی جاتی تھی۔

یہ فطرت کی کاریگری کا لاجواب نظارہ تھا اور وہ اسے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لینا چاہتا تھا اس نے اپنے گلے میں لٹکے ہوئے کیمرہ کے خول سے کیمرہ نکالا اور آگے بڑھا۔

''صاحب اور آگے مت جایئے...... شاید کنارا پتھر کا نہیں برف کا بنا ہو۔ برف گرمی کے اثر سے پگھل رہی ہے۔ برف کی یہ ساری پلیٹ جو کنارے تک جاتی ہے اندر سے بودی ہو چکی ہے۔ ہوشیار رہیئے۔'' گائیڈ نے کہا۔

عین اس وقت اس کے پاؤں کے نیچے سے برف کی سل ٹوٹی اور وہ گرنے لگا اور اس کا بدن برف کے ڈھیر پر آ لگا۔ چونکہ وہ پگھلی ہوئی برف تھی اس نے ایک گدے کا کام کیا لیکن اتنی بلندی سے گرنے سے اس کے دماغ میں دھماکا سا ہوا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔ چند گھنٹوں بعد اسے ہوش آیا۔ اس نے اٹھ کر اپنا جائزہ لیا اسے کوئی خاص چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس کا کیمرہ گلے میں لٹک رہا تھا اور کمر کے ساتھ بندھا ہوا تھیلا بدستور چپکا ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھی ہوئی کارنس کی طرح ایک چٹان پر کھڑا تھا۔ جو اندھی کھائی کے بالکل اوپر تھی۔ اگر وہ کھائی میں گر جاتا تو اس کا زندہ رہنا محال تھا۔ دریا اب بھی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اس کے غرانے کی آواز قریب سے آ رہی تھی اس

نے سوچا کہ اب اس موت کے کنوئیں سے کیسے نکلا جائے۔ شاید اس کے دو گائیڈ اوپر انتظار کر رہے ہوں۔ اگر ان کو کسی طریقے سے معلوم ہو جائے کہ میں زندہ ہوں تو شاید مجھے نکالنے کے لئے کوئی رسی وغیرہ پھینکیں۔

کوئی ہے...... کوئی ہے...... مجھے بچاؤ...... مجھے بچاؤ۔

یکے بعد دیگرے اسے اپنی آواز دور دراز کے پہاڑوں میں گونجتی سنائی دی اس کے بعد ایک دل دوز خاموشی چھا گئی۔

اس نے اپنے اردگرد کا جائزہ لیا تو اسے اوپر جانے کا ایک راستہ نظر آیا۔ اس نے اپنے تھیلے سے چمڑے کے دستانے اور ایک چھوٹی سی کدال نکالی اور روانہ ہوا۔ قریباً ایک گھنٹہ چلنے کے بعد ایک عمودی چٹان نے اس کا راستہ روک لیا۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب کیا کرے۔

اسے شک ہوا کہ شاید وہ لداخ کے طلسماتی علاقہ میں داخل ہو چکا ہے جو دشمن کے قبضہ میں ہے۔ یہ بنجر زمین کسی زمانے میں جھیلوں، دریاؤں اور شاداب وادیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ لیکن ہوا کے طوفانوں اور زلزلوں کے پے در پے حملوں نے اس سرزمین کو تباہ کر دیا۔ جھیلیں خشک ہو گئیں اور وادیاں ایک وسیع و عریض صحرا میں بدل گئیں۔

اس نے اپنے اردگرد کا دوبارہ جائزہ لیا ایک چٹان دوسری چٹان پر رکھی تھی جب اس نے غور سے دیکھا تو ان کے درمیان تنگ سا راستہ تھا وہ اوپر چڑھنے لگا۔ ہوا چلنی پھر شروع ہو گئی اور سردی بے حد بڑھ گئی۔ اس نے ٹوپی کھینچ کر نیچے کر لی اور آنکھوں کے سامنے سوراخوں میں سے باہر کی دنیا کا نظارہ کرنے لگا آخر بڑی جدوجہد کے بعد وہ کھائی سے نکل آیا۔ اس نے دیکھا کہ یہ وہ جگہ نہیں تھی جہاں سے وہ گرا تھا۔ یہاں قیامت کی سردی تھی یخ ہواؤں کے چلنے سے برف کے ٹکڑے جو پگھلے نہیں تھے سخت ہونے لگے۔ سورج تو کالے کالے بادلوں نے غائب کر دیا تھا اور اب روشنی بھی جا رہی تھی، اسے فوراً رات گزارنے کے لئے کوئی جگہ تلاش کرنی ہوگی ورنہ وہ سردی سے اکڑ کر مر جائے گا۔ وہ پہاڑ کی جانب مڑا بڑی تلاش کے بعد ایک سوراخ سا نظر آیا جب اس نے جھک کر دیکھا تو یہ ایک غار کا منہ تھا۔

اس نے تھیلے سے ٹارچ نکالی اس کی تیز روشنی میں اندر داخل ہوا یہ ایک کافی کشادہ اور اونچی چھت والی غار تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ کسی جانور کا ٹھکانہ نہ ہو وہ دبے پاؤں چلنے لگا اور اپنے کان کھڑے کر لئے کہ اگر کوئی آواز آئے تو فوراً باہر بھاگ جائے۔ اندر بے حد خاموشی تھی۔ اس پتھریلی فضا میں صرف اس کے جوتوں کے تلوے میں لگی میخوں کے پتھروں سے رگڑنے کی آواز آ رہی تھی جو اس ماحول میں بڑی بھیانک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے غار کی دونوں دیواروں پر روشنی ڈالی جو سنگ خارا کی بنی ہوئی تھیں۔ چھت پر سیلن کے نشان تھے۔ دائیں دیوار کے ساتھ ایک مستطیل سا پتھر پڑا تھا ایسا لگتا تھا کہ اسے کوئی جاندار یا جانور...... بستر کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ وہ کون تھا یہ بڑا خوفناک سوال تھا۔ وہ اس پتھر پر بیٹھ گیا وہاں بہت زیادہ سردی تھی لیکن وہ ہوا کی کاٹ سے بچ گیا

تھا۔ اس نے تھیلے میں سے چھوٹا سا چولہا نکالا اور اس کے نیچے ایک کاغذ سے موم کی ٹکیاں نکال کر رکھیں ۔ ماچس کی ساری تیلیاں گیلی تھیں صرف ایک تیلی جل اٹھی اور چولہے نے آگ پکڑ لی۔ جب شعلہ سرخ سے نیلا ہوا تو حرارت محسوس ہونے لگی۔ اس نے دستانے اتار کر ہاتھ چولہے کے اوپر نہیں بلکہ اس کے اندر رکھ دیئے۔ چند لمحوں بعد ہاتھ جلنے لگے۔ ہاتھ کھینچ لئے اور دستانوں میں ڈال لئے یہی عمل اس نے پیروں کے ساتھ کیا جو برف کی ڈلیوں میں بدل گئے تھے۔

اس کے بعد اچھلنے لگا۔ کافی دیر اچھلنے کے بعد اس کا بدن گرم ہوا۔ سردی کے ساتھ درد کی لہریں بھی بدن سے غائب ہونے لگیں۔

اب اسے بھوک لگی۔ اس نے تھیلے سے گوشت کے خشک ٹکڑے نکالے جو برف کے ٹکڑے لگتے تھے۔ کافی دیر آگ پر چاروں طرف سے گرم کرنے کے بعد اس نے ایک ٹکڑا جبڑوں کے نیچے رکھا اور اسے چبانے کی کوشش کی ۔ یوں لگا کہ وہ پتھر کے یخ بستہ ٹکڑے کو چبانے کی کوشش کر رہا ہے۔ آخر کافی دیر کی جدوجہد کے بعد گوشت کے ریشے الگ ہوئے اور اسے ایسا مزہ آیا جو اس نے پہلے کسی چیز کو چبانے میں محسوس نہیں کیا تھا۔ اس نے آخری بار پھر غار کا ٹارچ کی روشنی میں جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس غار میں کوئی جاندار نہیں رہتا۔

اس نے تھیلے کو سر کے نیچے رکھا اور اس مستطیل پتھر پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد سردی چیونٹیوں کی طرح بدن میں رینگنے لگی۔ خیال آیا کہ تھیلے میں ربڑ کی توشک بھی موجود ہے۔ اس نے توشک نکال کر منہ سے اس میں ہوا بھری چٹان پر بچھا کر لیٹ گیا۔ اب سردی کم ہوگئی اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ آدھی رات کو ایک پراسرار آواز سے اس کی آنکھ کھل گئی ایک اندھے خطرے سے اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک غیر مرئی خاموشی نے ہر چیز کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ کوئی اس کے بہت نزدیک لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ وہ نہ کوئی انسان تھا نہ کوئی جانور ......شاید کوئی آسمانی مخلوق...... ایک نامعلوم خوف سے اس کا خون منجمد ہونے لگا۔ اندھیرے نے خوف کے عنصر کو دوچند کر دیا۔ پھر ایک سایہ نظر آیا جو تاریکی سے کم تاریک تھا۔ وہ سامنے والی دیوار کے پاس ٹھہر گیا۔ نصیر کا سانس حلق میں رک گیا۔

جب اس نے آنکھوں پر زور دیا تو چٹان پر کوئی لیٹا نظر آیا۔ یہ کوئی بھوت پریت نہیں تھا۔ سانس لیتا زندہ درندہ...... یہ وہ فریبی درندہ تھا جس کے بارے میں اس نے بے شمار داستانیں سنی تھیں۔ اب اس کے سامنے ایک لرزہ خیز موت تھی۔

کئی گھنٹوں کے انتظار کے بعد روشنی کی ایک کرن غار کے منہ سے اندر داخل ہوئی۔ وہ اس عرصہ میں اکڑوں ہو کر بیٹھا رہا۔ اس کا بدن جم گیا تھا۔ روشنی کی دوسری کرن چھت میں ایک چھید سے اندر آئی۔ اب وہ صاف دیکھ سکتا تھا۔ برفانی چیتا اپنے لمبے ناخنوں والے پنجوں پر خون آلود تھوتھنی رکھے آرام اور بے فکر سو رہا تھا۔ سفید سفید چاندی کی طرح گنجان بالوں میں کالے کالے دھبے بڑے خوبصورت لگ رہے تھے۔ اس کے دماغ میں

طرح طرح کے منصوبے پیدا ہونے لگے۔ چیتے کو بیدار ہونے سے پہلے چاقو سے گردن کاٹ کر ہلاک کردے اور اگر اس کا چاقو گردن کے گھنے بالوں میں پھنس گیا تو وہ بیدار ہو کر فوراً اس کی گردن اپنے جبڑوں میں پکڑ کر توڑ دے گا وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا۔ اس نے اپنے پاس پستول کیوں نہیں رکھا۔ ایک گولی سے چیتے کا دماغ اڑا دیتا۔ اس کا دل اتنے زور زور سے دھڑک رہا تھا کہ اسے ڈر لگا کہ چیتا سن کر جاگ نہ اٹھے اور اس پر حملہ کردے وہ عجیب تذبذب میں مبتلا تھا کہ کس طرح اپنے آپ کو اس دردناک موت سے بچائے۔

اس نے اپنے باپ اور دادا سے برفانی چیتے کی تنہائی' خاموشی اور خونخواری کے بہت قصے سنے تھے جو دنیا کی چھت پر ایک بھوت کی مانند رہتا تھا۔ اس کی سفید بالوں اور کالے دھبوں والی چمڑی اسے برفانی پہاڑوں میں چھپنے میں مدد دیتی تھی۔ اس خوبصورت نرم کھال کی وجہ سے وہ شکاریوں کی بندوق کا نشانہ بنتا رہا۔ شکاریوں نے اتنے زیادہ چیتے ہلاک کئے کہ ان کی نسل ختم ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔

لداخ جموں اور کشمیر کی ریاست کا ایک حصہ تھا جو انگریزوں نے ایک ہندو ڈوگرہ کو بیچ دی۔ جب بھارت پاکستان وجود میں آیا تو ڈوگرہ راجہ نے نوے فی صد مسلمانوں کی آبادی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کشمیر کو بھارت میں شامل کرنے کا اعلان کر دیا۔ پاکستان نے بھی اپنی فوجیں کشمیر میں داخل کر دیں۔ 49ء اقوام متحدہ کی کوششوں سے جنگ بندی ہوئی فیصلہ ہوا کہ کشمیری عوام کو استصواب رائے کے ذریعے حق دیا جائے گا کہ وہ کس ملک میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن بھارت نے صلح کے اس معاہدے پر عمل نہ ہونے دیا۔ اس کے بعد کشمیر کی وجہ سے بھارت اور پاکستان میں دو دفعہ جنگ ہوئی۔ لداخ کے علاوہ باقی سارا شمالی علاقہ پاکستان کے قبضہ میں رہا۔

کچھ سال پہلے پاکستان نے چین کے تعاون سے شاہراہ قراقرم تعمیر کی۔ جو دنیا کی سب سے بلند ترین اور مشکل شاہراہ ہے یہ جدید انجینئرنگ کا عجوبہ ہے اس شاہراہ کے مکمل ہونے پر پاکستان اور چین میں مزید رابطہ بڑھ گیا۔

قراقرم کا سلسلہ کوہ دنیا میں ایک عجیب و غریب جغرافیائی تبدیلیوں کا نمونہ ہے۔ یہ اونچی چوٹیوں کا سمندر کہلاتا ہے۔ ابھی انسانوں نے صرف چند چوٹیاں فتح کی ہیں۔ ایورسٹ کے علاوہ دنیا کی باقی تین بلند چوٹیاں قراقرم میں ہیں۔ یہ ایک ترکی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی کالا پتھر ہے۔ یہاں دنیا کی عظیم ترین چٹانیں موجود ہیں جن کی لمبائی اور چوڑائی ہزاروں فٹ میں شمار ہوتی ہے۔ برف کے بے شمار تودے سینکڑوں سال سے ایک عظیم الجثہ اژدھے کی طرح پڑے ہیں بحیرہ منجمد شمالی اور جنوبی کے علاوہ دنیا کا عظیم ترین برف کا ذخیرہ یہاں موجود ہے۔ دنیا کا حسین ترین اور نایاب جانور برفانی چیتا یہاں پایا جاتا ہے۔

نصیر اس علاقے میں شاہراہ ریشم کی تعمیر کے بعد کئی دفعہ آیا لیکن تلاش بسیار کے باوجود برفانی چیتے کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ سکا اور آج وہ اس کے سامنے سو رہا تھا اور اس کے لئے اجل کا فرشتہ بنا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر بعد چھت کے سوراخ سے سورج کی شعاعیں سیدھی غار میں پڑنے لگیں۔ سارا غار روشن ہو گیا۔ ہر چیز صاف طور پر دکھائی دینے لگی۔ چیتے کے ہونٹوں اور مونچھوں پر خون لگا ہوا تھا جو اب کالا پڑ گیا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کا پیٹ بھرا ہوا ہے۔ نصیر نے سوچا کہ ابھی فوری طور پر چیتے سے کوئی خطرہ نہیں۔ غور سے اس کا جائزہ لیا تو اس کے کتابی علم نے یہ جاننے میں مدد کی وہ نر نہیں مادہ ہے۔ پسلیوں وار پیٹ پر سفید بال چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ پنجوں کے گرد کالے چمکیلے بالوں کا کڑا تھا۔ گردن سے دم تک کھال ایک ریشمی کپڑے کا ٹکڑا لگتی تھی۔ وہ چیتنی ایک عورت کی طرح خوبصورت اور پر امن لگتی تھی بھلا ایسی مخلوق سے اس کی جان کو کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟

جب سورج کی شعاعیں اس دیوار پر پڑیں جہاں چیتنی لیٹی تھی تو اس نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ پنجہ ٹیک کر اٹھی اور کود کر غار کے فرش پر آ گئی۔ اس کے بعد ایک پنجہ اٹھایا خون چاٹا دوسرے کو دیکھا زبان سے چاٹ کر صاف کیا۔ دائیں پنجے سے چہرہ کا دایاں حصہ صاف کیا۔ بائیں سے بایاں حصہ صاف کیا۔ دم کو ایک بید کی طرح استعمال کیا۔ گردن سے کولہوں تک کئی بار اپنی کھال کو پیٹا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ سارے جراثیم اور دھول چھٹ گئی ہے تو اس عمل کو ترک کیا۔ اس کے بعد پہلے دائیں طرف اور بعد میں بائیں طرف اپنے بدن کو غور سے دیکھا جس طرح ایک عورت آئینے میں اپنے سراپا کا جائزہ لیتی ہے۔

اُسے چیتا کے بارے میں پڑھی ہوئی ساری کہانیاں یاد آنے لگیں۔ ریڈیارڈ کپلنگ پہلا ادیب تھا جس نے برصغیر کے جانوروں کے بارے میں کہانیاں لکھیں۔ اس کی ''جنگل بک'' کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ چیتوں کے بارے میں بھی اس نے کئی کہانیاں لکھیں ایک اعلیٰ ادیب ہونے کے باوجود اس کا انداز بعض جگہ حاکمانہ ہو جاتا ہے چونکہ وہ بنیادی طور پر انگریز سامراج کا کارندہ تھا۔ اس کے برعکس جم کاربٹ کی کہانیاں شکاریات کے بارے میں ہیں لیکن اس نے اس بات پر زور دیا کہ جانوروں کو محض تفنن طبع کے لئے نہ ہلاک کیا جائے اس طرح ہم فطرتی حسن کو تباہ کر رہے ہیں۔ اس کا اشارہ ان انگریز افسروں کی طرف تھا جو شکار کو تفریح کا ایک لازمی حصہ سمجھتے تھے۔

کپلنگ کی جانوروں والی کہانیاں ساری اس کے ذاتی مشاہدے پر مبنی نہیں تھیں۔ اس نے دوسروں کے مشاہدے سے بھی فائدہ اٹھایا چونکہ اسے کہانی لکھنے کے فن میں مہارت حاصل تھی اس لئے آج بھی اس کی کہانیاں مقبول ہیں اور ان کے مجموعے بار بار شائع ہو رہے ہیں۔

کپلنگ نے برفانی چیتے کے بارے میں جو کچھ لکھا تھا وہ اس کا ذاتی مشاہدہ نہیں تھا۔ سنی سنائی اور غیر مستند باتوں پر مبنی تھا۔ اس نے لکھا کہ ہر چیتے پر پانچ کالے دھبے ہوتے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ اس کے سامنے جو چیتنی کھڑی تھی اس کی سفید کھال پر پانچ سے زیادہ دھبے تھے۔ کسی نے گلگت میں اسے بتایا تھا کہ چیتے کو اس کے کالے دھبوں کی تعداد سے انفرادی طور پر پہچانا جا سکتا ہے۔ اگر ایک کے دھبوں کی تعداد پانچ ہے تو

دوسرے کی چھ بھی ہوسکتی ہے اور تیسرے کی سات ہوسکتی ہے۔ جب اس کی مادہ چیتے کی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوئیں تو اس میں اسے ایک سنگینی اور بے رحمی کے بجائے ایک نرمی سی نظر آئی وہ دلفریب آنکھیں اسے اپنے اندر جذب کرنے لگیں اور وہ ایک نامعلوم مقناطیسی کشش کے زیر اثر اس کی طرف کھنچتا گیا۔

اس کا خوف کہیں چلا گیا اور وہ دلیری سے آگے بڑھ کر اس کی نرم نرم کھال سہلانے لگا۔ وہ ایک نشہ آور عورت کی طرح اپنے کولہوں کو گھمانے لگی۔ اسے یوں لگا کہ وہ نرم کھال ریشمی بالوں میں بدل گئی ہے۔ اس کے سامنے ایک عریاں بدن دھیرے دھیرے رقص کر رہا ہے اور اس کے لمبے کالے بال اس بدن کے ابھاروں کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں۔ اس واقعے کی ایک ایک تفصیل اس کے دماغ میں تازہ ہوگئی۔

وہ کئی سالوں کے بعد امریکہ سے واپس آیا۔ شاہراہ ریشم کی تعمیر کی وجہ سے اب سیدھا خنجراب کے درہ تک جانا آسان ہو گیا جس کے دوسری طرف چین کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ اسے خبر ملی کہ برفانی چیتے کو اس کی کھال کی مانگ کی وجہ سے بے دردی سے ہلاک کیا جا رہا ہے اگر کسی نے ان شکاریوں کو نہ روکا تو چیتے کی نسل اس علاقے سے ختم ہو جائے گی۔ وہ اپنے ساتھ ویڈیو کیمرہ لایا کہ اگر ہو سکے تو چیتے کی فلم بنالے۔ اگر چیتا نظر نہ آئے تو ان وادیوں اور پہاڑوں کی تصاویر بنا کر لے جائے جہاں چیتا رہتا ہے اس طرح اپنے دوستوں اور واقف کو وہ تصاویر اور حالات بتا کر کچھ رقم جمع کرے اور اس چیتے کی حفاظت کا کوئی منصوبہ بنائے۔

بلتت۔ہنزہ میں اس نے ایک گائیڈ اور ایک مزدور ساتھ لیا اور جیپ کے ذریعے پرالی پہنچے۔ وہاں سے قراقرم نیشنل پارک کا رخ کیا۔ شام ہوتے ہی سردی نے آ گھیرا۔

انہوں نے خیمے نصب کئے۔ تھوڑا بہت کچھ کھایا۔ آگ جلائی اور جب بدن گرم ہوا تو ربڑ کے بستروں میں گھس گئے۔

دوسری صبح بڑی خوبصورت تھی۔ چاروں طرف برفانی چوٹیاں سورج کی روشنی میں چمک رہی تھیں۔ سامنے کی پہاڑی پر سبزے کے قطعے آنکھوں کو طراوت دیتے تھے۔

ناشتے کے بعد اس نے کیمرہ اور دوربین گلے میں ڈالی اور سامنے والی ٹیکری کی طرف بڑھا جہاں سے ساری وادیاں نظر آتی تھیں۔ اس نے ٹیکری کی چوٹی پر پہنچ کر اردگرد کا جائزہ لیا کہ شاید کوئی چیتا یا مارخور نظر آ جائے لیکن وہاں صرف پتھر اور بعض جگہ سبزے کے تختے نظر آتے تھے۔

اچانک اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ یہ حقیقت نہیں وہم تھا۔ اس نے جلدی سے کیمرہ نکالا اور مارخور کو ہوا میں چھلانگ لگاتے ہوئے فلم پر پکڑ لیا وہ لہراتے ہوئے سینگوں کے ساتھ ہوا میں پرندے کی طرح بلند ہوا اور دور ایک چٹان پر ایک باز کی طرح اترا اور جہاں اس کے پاؤں چٹان سے مس ہوئے تھے وہاں ہی کھڑا رہا اسے اپنے بدن پر ایک غیر معمولی توازن حاصل تھا۔ پھر اس نے گردن گھما کر ادھر دیکھا جہاں سے اس نے چھلانگ لگائی تھی اور اپنے سینگوں کو ایک فاتحانہ انداز سے جھٹکا دیا۔ وہ حیران ہوا اتنا وزنی جانور کس طرح کھائی پار

کر کے دوسری طرف آرام سے اتر گیا۔ اس نے جلدی جلدی کئی تصویریں اتاریں اور ایک تصویر کو لوگوں نے بے حد پسند کیا جس میں مارخور ہوا میں معلق تھا جو بعد میں ایک مقامی اخبار میں بھی شائع ہوئی۔

مارخور کے بارے میں شمالی علاقوں میں بہت ساری کہانیاں مشہور تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ شکاریوں نے پاکستان بننے کے بعد آہستہ آہستہ سارے مارخور ہلاک کر دیئے ہیں۔ لیکن بہت سے مارخور اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے تھے اس لئے کہ ان کا بسیرا دس ہزار فٹ کی بلندی پر تھا جہاں شکاری کی گولی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اس نے مارخور کی نظر کا تعاقب کیا تو وہاں ایک برفانی چیتا پورے جلال و جمال کے ساتھ کھڑا تھا۔ بیچ میں ایک کھائی تھی اور مارخور اس کی دسترس سے نکل کر کھائی کے دوسرے کنارے پر چلا گیا تھا۔ اس نے فوراً ٹیلی لینز لگا کر چیتے کی تصاویر اتاریں۔ وہ اپنی تصاویر میں چیتے کے حسن کو پوری طرح پکڑنے میں کامیاب ہو گیا لیکن چیتے کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے غصے کے شعلوں کو فلم پر نہ کھینچ سکا جو شکار ہاتھ سے نکل جانے سے پیدا ہوتے تھے۔ چیتے اور مارخور میں بعض دفعہ کئی دن جنگ جاری رہتی ہے۔ چیتے کے مقابلے میں مارخور بہت کمزور ہے اور اسے معلوم ہے کہ اگر ان کی لڑائی ہوئی تو چیتا اچھل کر اس کی گردن کو پکڑے گا اور دوسرے لمحے توڑ دے گا۔ اس لئے فرار میں اس کی خیریت ہے۔ چیتا جب مارخور کا تعاقب کرتا ہے تو وہ اسے کھائی کے کنارے تک لے آتا ہے اور موقع پا کر کھائی کو چھلانگ لگا کر عبور کر لیتا ہے۔ بعض دفعہ کھائی کے اس پار اوپر یا نیچے جانے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا تو وہ چٹانوں کے اردگرد اگی ہوئی گھاس سے اپنی بھوک مٹاتا ہے اور چور نظروں سے دیکھتا ہے کہ چیتا چلا گیا ہے یا وہاں موجود ہے۔ چیتا صبر اور انتظار کا حربہ استعمال کرتا ہے اور کسی چٹان کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ اس کی کھال کا رنگ ایسا ہے کہ بعض دفعہ وہ کالی اور سفید چٹانوں کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ مارخور شاید سمجھے کہ چیتا چلا گیا ہے اور جب وہ کھائی کو چھلانگ لگا کر واپس آئے تو چیتا اس کے پاؤں زمین پر لگنے سے پہلے ہوا میں اسے دبوچ لے گا۔

مارخور اتنا بے وقوف نہیں تھا وہ انہی پہاڑوں میں رہتا تھا اور چیتے کی مکاری سے پوری طرح واقف تھا۔ بعض اوقات یہ محاصرہ کئی دن جاری رہتا ہے۔ عام طور پر چیتا حوصلہ ہار دیتا ہے اور کسی دوسرے شکار کی تلاش میں نکل جاتا ہے۔ مارخور گھوم پھر کر دوسری طرف چٹانوں کا جائزہ لیتا ہے اگر چیتا نظر نہ آتا تو اپنی آنکھوں کے بجائے اپنی ناک پر زیادہ بھروسہ کرتا جب ہوا کے جھونکوں کے ساتھ چیتے کے بدن کی بو آنی بند ہو جاتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ چیتا اپنی کچھار چھوڑ کر چلا گیا ہے لیکن مارخور پھر بھی کئی گھنٹے اپنی ناک کو چیتے کی سمت سے آنے والی ہوا کی طرف لگائے رکھتا جب چیتے کے بدن کی بو آنی بند ہو جاتی تو وہ کھائی کو چھلانگ لگا کر عبور کرتا اور واپس اپنی جگہ آ جاتا۔

جب اندھیرا ہونے لگا تو وہ رک گئے اور انہوں نے اپنے خیمے دریا سے ذرا فاصلے پر گاڑ تھے۔ اگر خیمے دریا کے پاس ہوتے تو رات کو جو جانور دریا پر پانی پینے آتے تھے وہ گھبرا کر ان کے خیموں پر حملہ کر سکتے تھے۔

دوسری صبح انہوں نے ناشتہ کے فوراً بعد خیمے اکھاڑے اور دریا کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اس نے اپنا ویڈیو اور تصویر والے کیمرے تیار رکھے لیکن کہیں بھی کوئی مارخور چیتا یا کوئی پرندہ نظر نہ آیا۔ ہر طرف کالی بھوری جلی ہوئی چٹانیں اور ویرانے۔ عجیب ہولناک منظر تھا۔ پھر دریا نے ان کا راستہ روک لیا اور اس کو عبور کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں تھا۔

مقامی لوگوں نے دریا کے دونوں کناروں پر لکڑی کے دو کھمبے گاڑے ہوئے تھے جن کے درمیان ایک مضبوط رسی بندھی تھی جس پر لکڑی کی ایک ڈولی چلتی تھی جو مسافروں کو آر پار لے جاتی تھی۔ نصیر نے اپنے گائیڈ اور مزدور کے ساتھ باری باری ڈولی کے ذریعے دریا پار کیا۔ اگر ڈولی ٹوٹ جائے تو دریا کے تیز اور یخ بستہ پانی سے جان بچانا محال ہے۔

وہ دو دن چلتے رہے گھاس کے میدان آئے اور گزر گئے لیکن مارخور اور چیتا نظر نہ آیا۔ ''کیا ہم صحیح راستے پر جا رہے ہیں؟'' نصیر نے گائیڈ سے پوچھا۔

''جی ہاں۔ ابھی کوئی نہ کوئی چیتا یا مارخور سامنے والے پہاڑوں میں نظر آئے گا۔''

لیکن سامنے والے پہاڑ خاصے دور تھے۔

دوسرے دن منظر بدلنا شروع ہو گیا۔ سبز گھاس اور پودے مرجھانے لگے۔ پھر سفید ریت ان کے پاؤں کے نیچے کچر کچر کرنے لگی۔ رات کو شدید سردی نے آن گھیرا۔ ایسا لگا کہ وہ ٹھٹھر کر مر جائیں گے۔ دھند کے کثیف مرغولے خیمے میں گھس آئے۔ ہر چیز معدوم ہو گئی اسے لگا وہ دھند کے غبار پر سوار آسمان کی پہنائیوں میں کہیں اڑ رہا ہے۔ بڑی مشکل کے بعد اسے نیند آئی۔ جب صبح ہوئی تو وہ --- دھندلی دھندلی تھی۔ دھند نے سورج کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا جیسے گرہن لگا ہو اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی خیمے میں عبدل اور مزدور کا سامان موجود تھا اور ربڑ کے بستر بھی پڑے تھے لیکن وہ دونوں غائب تھے۔ اس نے ان کا سارا دن انتظار کیا۔ ادھر ادھر گھوم کر ان کو تلاش کیا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ اندھیرا ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہوا بھی تیز ہونے لگی اور جب اندھیرا گہرا ہوا تو ہوا اس طرح شور مچانے لگی جیسے آسمان سے کوئی بلائیں اترتی ہوئی چیخ رہی ہوں۔ اس نے دیکھا کہ جب دونوں آدمی نہیں آ رہے تو ان کے بستر بھی اکٹھے کئے اور ان میں گھس گیا۔ اس طرح سردی سے بچاؤ ہو گیا۔ اور اسے نیند آ گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے باہر نکل کر دیکھا کہ دھوپ کی تمازت لوٹ آئی تھی اس کی شعاعیں نہ صرف اس کی بدن کو گرم کر رہی تھیں بلکہ سہلا رہی تھیں۔

اس نے خشک گوشت کے ٹکڑوں اور روٹی کے ساتھ ناشتہ کیا اور پانی سے ان ٹکڑوں کو حلق سے نیچے اتارا۔ اس کے بعد ایک تھیلے میں ضروری سامان کچھ خشک گوشت کے ٹکڑے، گندم کے نان اور پانی کی بوتل رکھی اور چل پڑا۔ وہ ایسی خراب جگہ نہیں رک سکتا تھا۔ یہاں زیادہ ٹھہرنا موت کو دعوت دینا ہے۔

نصیر نے مغربی پہاڑوں پر بادل جمع ہوتے دیکھے۔ کالے سیاہ اور ان میں بجلی کی لہر چاندی کی طرح

چمکتی نظر آئی۔ چند گھنٹوں میں اس نے وادی کو پار کیا اور ایک ٹیکری پر چڑھنے لگا چوٹی پر پہنچ کر اس نے چاروں وادیوں کی طرف دیکھا اسے کوئی چیز متحرک نظر نہ آئی اسے سمجھ نہیں آئی تھی اب کس سمت جائے۔ وہ نیچے اترنے لگا۔ اچانک دھند کے طوفان نے آ گھیرا۔ اس کا پاؤں پھسلا اور اس نے اپنے آپ کو ہوا میں اڑتا محسوس کیا پھر ہوش وحواس کھو بیٹھا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ لمبی لمبی مخملی گھاس میں لیٹا ہوا تھا اور آفتاب تیزی سے مغرب کی طرف جا رہا تھا اور خنک ہوا تیز ہو رہی تھی۔ اچانک اندھیرا گہرا ہو گیا۔ آفتاب کسی اونچے پہاڑ کے پیچھے چھپ گیا۔ سامنے ایک اور ٹیکری تھی وہ دوڑ کر وہاں چڑھ گیا کہ وادی میں دیکھے شاید کہیں سے دھواں نکلتا نظر آئے اور وہ رات کو وہاں پناہ لے سکے۔ اس نے چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کچھ نظر نہ آیا۔ پھر ٹیکری کے بہت قریب ایک پتلی دودھیا دھوئیں کی لہر فضا میں بلند ہوتی نظر آئی وہ دیوانہ وار چٹانیں پتھر اور جھاڑیاں پھلانگتا وہاں پہنچ گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی ٹیکری پر لداخی طرز کا گھر تھا۔ نیچے مویشیوں کا طویلا اور اوپر رہائش کے کمرے تھے۔ عمارت کے گرد اس نے گھوم کر دیکھا تو کوئی دروازہ نظر نہ آیا۔ جب اس نے روشنی کی ایک باریک لکیر کو دیکھا تو اس طرف ایک کھڑکی تھی وہ ایک دیوار کے سوراخ میں پاؤں پھنسا کر کھڑکی کے پاس پہنچا اور اسے ہاتھ لگایا تو ایک پٹ کھل گیا۔ یہ ایک لمبا کمرہ تھا۔ اوپلوں کی بجھتی ہوئی آگ میں اسے ایک سایہ نظر آیا۔ اس نے سر سے پاؤں تک اپنے بدن کو ایک شال میں چھپایا ہوا تھا۔ آہٹ سے وہ سایہ کھڑکی کے پاس آیا۔ ایک سفید عریاں بازو شال سے نکلا اور اس کے ہاتھ کو پکڑ کر کھینچا وہ اندر کود گیا۔ اس نے پلٹ کر کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔ سایہ آگے بڑھا اور پیٹھ موڑ کر کمرے کے درمیان رک گیا۔ ریشم کے سرکنے کی آواز آئی شال زمین پر گر گیا اس کے سامنے ایک حسین سڈول نسوانی بدن اس طرح دہکتا ہوا لگا جیسے اوپلے دہک رہے تھے۔ چند لمحوں بعد اس نے گردن کو خم دیا اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں اس کی طرف مسکرائیں۔ ان میں ایک بیباکی اور ترغیب تھی۔ یہ شاید اس کا وہم ہو وہ ابھی تک دھند کے مرغولوں میں غوطے کھا رہا تھا۔ یہ عریاں عورت کوئی آسمانی مخلوق یا اپسرا ہے لیکن اسے جلد احساس ہو گیا کہ وہ گوشت پوست کی عورت ہے وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اوپلوں کی آگ کے پاس لے گئی جس کے قریب ایک کشمیری گابھا بچھا ہوا تھا۔ جب وہ بیٹھ گیا تو عورت نے دوزانو ہو کر تسمے کھولے جوتے اتارے۔ جرابیں اتاریں اور گابھے کے ایک طرف رکھ دیں اور اٹھ کر اندر کوٹھڑی میں گئی چند اوپلے اور سرسوں کے تیل کی بوتل لائی۔ اوپلے بجھی آگ کے اردگرد رکھے اور دوبارہ دوزانو ہو کر پہلے اس کا ایک پاؤں اپنی ران پر رکھا اور پھر دوسرا اور چلو میں تیل ڈال کر ان کی مالش کی۔ تھوڑی دیر بعد نصیر نے محسوس کیا کہ درد کی لہریں مدھم پڑ گئی ہیں اور ایک اجنبی لذت کے بلبلے اس کے پاؤں میں ابھرنے لگے۔

اس عورت کو اپنی عریانیت کا کوئی احساس نہیں تھا۔ اس کی حرکات اور سکنات بالکل فطری تھیں۔

''تم بھوکے ہو؟''

''بہت بھوکا ہوں-- ارے تم اردو بول رہی ہو۔''

''جی ہاں-- میں کشمیر میں پلی بڑھی ہوں۔ میرے والد ایک کشمیری تاجر کے ساتھ کام کرتے تھے۔ میں نے ان کی عورتوں سے کشمیری زبان سیکھی ۔ جب کشمیر میں جنگ شروع ہوئی تو ہم لوگ لداخ واپس آ گئے--اب یہاں سے بھی جنگ کوئی زیادہ دور نہیں۔''

''اب تمہارے ماں باپ کہاں ہیں۔''

''وہ دونوں مر چکے ہیں۔''

''تم یہاں اکیلی رہتی ہو۔''

''نہیں-- میں اپنے شوہر کے ساتھ رہتی ہوں۔''

''وہ کہاں ہے؟''

''وہ یاک اور بھیڑوں کو لے کر اونچی وادیوں میں گیا ہے تا کہ جانور اچھی طرح اپنے بدن میں چربی جمع کر لیں۔ جو سردی کے موسم میں کم خوراک ملنے کی وجہ سے ان کے کام آتی ہے۔''

''تم اکیلی یہاں اس ویرانے میں اکتا نہیں جاتی ہو۔''

''میرے پاس تمام موسم گرما میں مہمانوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ میں ان کے ساتھ اتنا اچھا سلوک کرتی ہوں کہ کئی مہمان بہانے بہانے سے دوسری دفعہ بھی آ جاتے ہیں۔ اس طرح کبھی دو مہمان اکٹھے بھی آ جاتے ہیں۔ دوسری عورتیں اس صورت حال میں ایک مہمان کو واپس کر دیتی ہیں یا اسے دوسرے دن کو آنے کی درخواست کرتی ہیں لیکن میں ایسا نہیں کرتی ۔ ان دونوں سے کہتی ہوں کہ حوصلہ کریں اور رقابت نہ کریں تو باری باری دونوں کی خدمت کروں گی۔''

''تو کیا یہاں کے مردوں میں رقابت کا جذبہ بالکل نہیں ہے۔''

''رقابت کا جذبہ موجود ہے۔ بدھ کی تعلیمات نے امن و آشتی کا ایسا جذبہ پیدا کیا ہے کہ رقابت کا جذبہ دب گیا ہے۔ آپ نے کبھی نہیں سنا ہو گا کہ لداخ میں کوئی قتل ہوا ہو۔''

''کمال ہے۔''

''ویسے میں بھی اپنی طرف سے کوشش کرتی ہوں کہ کوئی وجہ ایسی پیدا نہ ہو کہ مہمانوں کو بری لگے۔ یہ ایک لمبا کمرہ ہے-- میں دونوں کونوں میں بستر بچھا دیتی ہوں اور بیچ میں کمبل ٹانک دیتی ہوں۔ جس مرد کے پاس میں ہوتی ہوں میں سرگوشیوں میں بات کرتی ہوں۔ پچھلے ایک ہفتہ سے کوئی مہمان ادھر نہیں آیا۔ میں بہت پریشان اور اداس تھی۔ میں نے بدھ کے آگے سر ٹیک کر کئی دفعہ دعا مانگی۔ کوئی اچھا سا جوان آدمی میری طرف بھیج دے۔ اس نے میری دعا قبول کی اور آپ کو میری طرف بھیج دیا۔''

''میں راستہ بھول کر ادھر آ گیا ہوں۔''

''بدھ نے آپ کو راستہ بھلایا اور میرے پاس بھیج دیا۔''

''بدھ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے ایک خوبصورت عورت کے پاس بھیج دیا۔''

''وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اس کی آنکھوں میں ایک نشہ تھا اس نے اپنے عریاں بدن کو تھر کایا تو نصیر کی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں۔ اسے گرمی لگی اس نے کوٹ اتارا قمیض اتاری عورت نے اسے گابھے پر اوندھے منہ لیٹنے کا اشارہ کیا چند لمحوں بعد نرم نرم گرم گرم ہمدرد انگلیوں کے لمس سے وہ مدہوش ہونے لگا۔ آہستہ آہستہ اس کا بدن لذت کے انجانے سمندر میں ڈوب گیا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو رات کے لمس کی لذت اس کے بدن میں جوں کی توں موجود تھی۔ اسے وہ آسودگی نصیب ہوئی تھی۔ جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ جو لذت آسانی سے حاصل ہو جائے وہ ہوس ہے۔ جو وصل مشکلات سے تکمیل کو پہنچے وہ فنا کے پل صراط سے گزر کر ابدی ہو جاتا ہے۔ شاید اسی کا نام عشق ہے لیکن فلسفہ تصوف کے مطابق عشق کا سوز و ساز' جذبہ و مستی' تڑپ اور بے قراری وصال کے بعد انجام کو پہنچ جاتی ہے۔ لیکن اس کے بدن میں ایک لذت کا جذبہ پیہم رواں دواں ہے۔ یہ کارگاہ فنا سے ایک قدم آگے ہے۔ یہ سرشاری' یہ بے خودی وصال کے بعد فنا نہیں ہوتی۔ ایک غیبی قوت نے ایک عورت کے بدن کے توسط سے اسے نروان دیا۔ ابدی سکون -- جسے اہل تصوف عرفان کہتے ہیں۔ اس کے دماغ میں سارے فلسفے سارے نظریات گڈ مڈ ہونے لگے۔

اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے ایک جوان عورت لمبی کالی قمیض شلوار اور سرخ کاڑھی ہوئی صدری پہنے لکڑی کے تخت پوش پر بیٹھی ایک گلوبند بن رہی تھی۔ دھاگے کی چرخی اس کے پاؤں میں رکھی تھی۔ وہ ہر سلائی کے جھٹکے کے ساتھ سر پر رکھی اونچی کالی ٹوپی کو بھی سہلاتی تھی۔ اس نے سوچا یہ رات والی عورت نہیں جب ان کی آنکھیں چار ہوئیں تو وہ اس کے قریب آئی۔

''ناشتہ تیار ہے۔''

اس جملے سے اس کا سارا نشہ اتر گیا۔ رات کو جو کچھ ہوا تھا شاید خواب تھا۔ اس عورت نے گابھے پر دسترخوان بچھایا اور پھر کوٹھڑی کی طرف گئی۔ اس نے جلدی سے پتلون قمیض اور کوٹ پہنا اور باہر نکل گیا۔ دھوپ بڑی اچھی لگی۔ اس میں ایک طرح کی پیاری پیاری تمازت تھی۔ جب وہ ضروریات سے فارغ ہو کر اندر آیا تو وہ لوٹا اور چلمچی لئے کھڑی تھی۔ اس نے ہاتھ منہ دھویا۔ اس نے ایک سفید کپڑا پکڑا۔ اس نے منہ صاف کیا عورت نے دسترخوان کی طرف اشارہ کیا۔ ایک رقابی میں -- باکرخانیاں دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ دسترخوان کے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ عورت بھی اس کے پاس آ بیٹھی۔ اس نے پاس رکھے بھاپ اڑاتے سموار کی ٹونٹی کھولی اور ایک کھلے منہ کے پیالے میں چائے ڈال کر اس کے سامنے رکھی جس میں سے بنفشہ کے پھولوں کی خوشبو آ رہی تھی۔

اس نے باکرخانی کا ٹکڑا منہ میں رکھا وہ اتنا خستہ تھا کہ اسے زیادہ چبانے کی ضرورت نہیں پڑی۔

''یہ باکر خانیاں ایک مہمان سرینگر سے لایا۔ دوسرا مہمان وادی سے بنفشہ کے پھول خود چن کر لایا ہے۔''

''واہ تمہارے مزے ہیں۔''

''بدھ کا شکر ہے کہ لوگ مجھے اتنا پسند کرتے ہیں۔''

''تم بھی ناشتہ کرو۔''

''میں نے بہت دیر ہوئی ناشتہ کر لیا۔ منہ اندھیرے اٹھی بکریوں کا دودھ نکالا اور پھر انہیں پاس والی چراگاہ میں چھوڑ کر آئی۔ ابھی میرے پاس صرف پانچ بکریاں ہیں اور باقی میرے شوہر کے ساتھ اوپر والی چراگاہ کو گئی ہیں۔''

''یہ کونسا علاقہ ہے؟''

''لداخ۔''

''تو میں دشمن کے علاقے میں ہوں۔''

''ہاں --لیکن دشمن کے گھر میں نہیں-- آپ یہاں بالکل محفوظ ہیں۔''

''میرا دل چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ کے لئے تمہارے پاس رہ جاؤں۔''

''اگر یہ جنگ نہ ہوتی تو میں اپنے شوہر سے بات کر کے آپ کو دوسرا شوہر بنا لیتی۔ ہم تینوں روزانہ اکٹھے سوتے بڑا مزہ آتا۔''

''ایسا ممکن ہے؟''

''لداخ میں ایسا ہوتا ہے۔''

''تم مجھے دوسرا شوہر ہونے کی صورت میں دوسری عورتوں کے ساتھ سونے کی اجازت دیتیں؟''

''کیوں نہیں؟''

''تمہارا شوہر حسد نہیں کرتا۔''

''نہیں حسد کرتا۔ وہ بھی جب گرمی کے خاتمے پر اونچی وادی سے واپس آتا ہے تو راستے میں کئی عورتوں کے ساتھ راتیں گزار کر آتا ہے۔ لداخ میں عرصہ دراز سے یہ رواج ہے جب شوہر بھیڑ بکریاں چرانے اونچی وادیوں میں چلے جاتے ہیں تو ان کی بیویاں کئی مہینے ان سے جدا رہتی ہیں۔ تنہائی سے بچنے کے لئے بیویاں دوسرے مردوں سے دوستی کرتی ہیں۔ عورت باہر کھلنے والی کھڑکی کے پیچھے چراغ جلاتی ہیں۔ وہاں سے گزرنے والا کوئی مرد جب روشنی دیکھتا ہے تو وہ کھڑکی کو دھکا دیتا ہے' وہ کھل جاتی ہے اور اندر داخل ہو جاتا ہے۔ اگر کھڑکی کے پیچھے کوئی روشنی نہیں اور وہ اندر سے بند ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس عورت کے پاس کوئی مرد ہے یا اس کا شوہر واپس آ گیا ہے۔ سردی کی لمبی راتوں میں ہم ایک دوسرے سے لپٹے اپنے تجربات کو دہراتے ہیں۔ یوں وہ

سرد راتیں پیار کی گرمی میں گزر جاتی ہیں۔"

"جب تمہارا شوہر واپس آئے گا تو اسے میرے بارے میں بتاؤ گی۔"

"ضرور بتاؤں گی کہ میری ایک ایسے شاندار آدمی سے ملاقات ہوئی جس نے نہ صرف مجھے جسمانی تسکین اور آسودگی بخشی بلکہ میرے ذہن کو بھی ایک نئی لذت سے آشنا کیا--اگر حالات سازگار ہوتے تو میں اسے دوسرا شوہر بنالیتی۔"

"شاریہ--یہ بتاؤ کہ بھارتی فوج کی چوکی یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"اس کا مجھے علم نہیں لیکن بھارتی فوج کے گشتی دستے اوپر نیچے کی ترائیوں میں نظر آتے رہتے ہیں۔"

"اگر بھارتی فوج کو معلوم ہو گیا کہ تم نے ایک پاکستانی کو پناہ دی ہے تو جانے تمہارے ساتھ کیا خراب سلوک کریں--مجھے یہاں سے جلد ... جلد نکل جانا چاہئے۔"

"اگر آپ اکیلے نکل کھڑے ہوئے تو یہ پہاڑ اور ترائیاں ایک جیسی لگتی ہیں آپ آسانی سے بھٹک سکتے ہیں۔ اگر ایک آدھ دن اور رک جائیں تو میرا ایک دوست آنے والا ہے وہ آپ کو پاکستانی سرحد تک پہنچا دے گا۔ وہ غیر ملکیوں کے لئے گائیڈ کا کام کرتا ہے۔"

"ایسا نہ ہو کہ مجھے بھارتی فوج کے حوالے کر دے۔"

"نہیں--وہ ایسا نہیں کر سکتا وہ سرحد محبوب ہے۔"

"اگر وہ کل تک نہ آیا تو میں خود روانہ ہو جاؤں گا۔"

دوسری شام مایا نے کھڑکی کے پاس چراغ جلایا اور جب رات بھیگنے لگی تو نصیر جانے کے لئے تیار ہوا اس وقت ایک نوجوان آدمی کھڑکی سے کود کر اندر آیا اس کی نظر نصیر پر پڑی وہ سیدھا مایا کی طرف گیا اسے لپٹا کر بے تابی سے بوسے دینے لگا مایا اسے اپنی زبان میں ڈانٹتی رہی لیکن اسے دھکا دے کر الگ نہیں کیا جب اس کا جوش ٹھنڈا ہوا تو اسے آرام سے پیچھے کیا۔

"حوصلہ کرو--دیکھتے نہیں گھر میں مہمان موجود ہے۔" اس نے اردو میں کہا۔

"معاف کرنا مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں کوئی مہمان ہے میں کل آ جاؤں گا۔" اس نے اردو میں جواب دیا۔

"غفور کے خاندان سے ہماری پرانی دوستی ہے--یہ سرینگر سے انگریز سیاحوں کے ساتھ لداخ آتا ہے اور جب موقع ملتا ہے تو مجھے ملنے آ جاتا ہے۔"

غفور نے کوئی جواب نہ دیا اور نصیر کو غور سے دیکھا۔

"غفور تم سے ایک بہت ضروری کام ہے۔ میں دو دن سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔"

"بتاؤ کیا کام ہے؟"

''تم نے اس مہمان کو پاکستانی سرحد تک چھوڑ کر آنا ہے۔''

''کب جانا ہے؟''

''ابھی -- میں تمہارا انتظار کروں گی -- صبح سے پہلے آ جانا۔''

''چلئے صاحب۔''

مایا نے خشک میووں اور انجیروں کا ایک تھیلا لا کر نصیر کو دیا پھر ایک چھوٹا سا کمبل لا کر اس کے شانے پر رکھا جس پر کشمیری انداز کے بیل بوٹے کاڑھے ہوئے تھے۔

''یہ میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔'' مایا نے کہا۔

''میں اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھوں گا۔''

پھر مایا نے پیچھے ہٹ کر منہ پھیر لیا اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ پہلے نصیر اور پھر غفور کھڑکی سے باہر نکلا اور کسی نے کھڑکی بند کر دی۔

وہ چلتے رہے اور صبح ہو گئی۔ انہوں نے سرسوں اور جو کے کھیت پار کئے اور غفور رک گیا۔ ''یہ پاکستانی علاقہ ہے۔ اب میں واپس جاتا ہوں۔''

نصیر نے کچھ روپے نکال کر اسے دیئے۔

''شکریہ -- خدا حافظ۔''

''خدا حافظ۔''

دوسرے لمحے وہ سرسوں کے کھیت میں غائب ہو گیا۔ مایا غفور کا انتظار کر رہی ہو گی۔ اس کے بدن میں حسد کی لہر سی اٹھی۔

مایا سے ملاقات کا واقعہ یاد کر کے حیران ہوا۔

چینی نے آنکھ کھول کر اسے دیکھا پھر ایک انگڑائی لی اور دم ہلاتی اس کے پاس آئی۔ نصیر نے اس کی گردن شانوں اور کولہوں کو سہلانا شروع کیا۔ وہ ساتھی والی چٹان پر چڑھ کر لیٹ گئی اور دوسرے لمحے اس نے دیکھا کہ وہ سو گئی۔ شاید رات کو کھائے ہوئے گوشت کا خمار ابھی نہیں اترا تھا۔ اس نے موقعہ غنیمت جانا۔ تھیلا اٹھایا غار سے نکل کر نیچے دریا کی سمت بھاگنے لگا۔

ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اسے دھب دھب کی آواز آئی اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا اسے معلوم تھا وہ اس کا تعاقب کر رہی ہے۔

دوسرے لمحے پانچسو پاؤنڈ کا ایک جثہ ہوا میں بلند ہوا۔ اب موت واقعی اس کے قریب تھی اسے ہلکا سا تھپڑ لگا وہ ڈھلوان سے نیچے لڑھکنے لگا۔ اس کے بعد اسے کچھ یاد نہ رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو وہ مخلوق وہاں موجود نہیں تھی۔ خدا کا شکر ادا کیا اور کپڑے جھاڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا جائزہ لیا۔ چینی نے نہ کوئی ناخن مارا تھا اور نہ اس

کی جلد کو اپنے خونخوار دانتوں سے چھوا تھا۔ نصیر نے موقعہ غنیمت جان کر دوڑنا شروع کیا۔ وہ ایک ٹیکری سے دوسری ٹیکری پر چڑھا تو وہ سامنے ایک چٹان پر بیٹھی تھی اور ایک خاص انداز سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے کہہ رہی ہو کہ تم مجھ سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے۔ وہ رک گیا وہ اٹھ کر آہستہ سے اس کے پاس آئی اور اپنے بدن کو اس کے بدن سے مس کیا۔ جب ان کی نگاہیں چار ہوئیں تو اس نے آنکھیں نیچے کر لیں جیسے اپنی گزشتہ حرکت سے شرمندہ ہو۔ نصیر نے اس کی گردن اور پیٹھ سہلائی۔ خوشی کا اظہار کرنے کے لئے اس نے قلابازیاں کھانی شروع کیں اور نیچے ڈھلوان میں کہیں غائب ہو گئی۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ اگر وہ دور چلی گئی ہو تو وہ بھاگ جائے لیکن اس کی آنکھوں نے ایسا نظارہ دیکھا کہ اسے یقین نہ آیا۔ ایک حسین وجمیل مارخور جس کے سینگ دوسرے مارخوروں سے کئی درجہ بڑے تھے اور جسامت میں بیل سے بڑا نظر آتا تھا فضا میں ایک باز کی طرح بلند ہوا۔ اس نے ایک گہری کھائی پار کی اور آہستگی سے دوسرے کنارے پر اتر گیا۔ اس کے پیچھے مادہ مارخور ہوا میں اچھلی اور پار اتر گئی اور آخر میں ایک چھوٹا مارخور چھوٹے چھوٹے سینگوں کے ساتھ ہوا میں ایک گیند کی طرح اڑا اور اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ گیا۔

تینوں نے پلٹ کر پہلے کنارے کی طرف دیکھا جہاں چینی غیظ وغضب میں ہوا میں اچھلی اور گمان ہوا کہ وہ بھی لمبی کھائی عبور کرے گی لیکن دوسرے لمحے وہ واپس اسی کنارے پر گری اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اتنی طویل کھائی پار نہیں کر سکتی۔

نصیر صرف ایک لمحہ کے لئے رکا اور دوڑنا جاری رکھا وہ اس جگہ سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ چند لمحوں بعد دھب دھب کی آواز آئی۔ اس کا دل بیٹھ گیا۔ وہ خونخوار چینی اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ اسے اتنے فاصلے سے کیسے اس کے بدن کی بو آ گئی تھی پھر اس کے دماغ نے کس طرح دوسری بوؤں سے اس کے بدن کی بو کو الگ کیا اور اسکی سمت بھاگنے لگی۔ اسے لومڑی کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ غیر معمولی قوت شامہ کی مالک ہے لیکن چینی کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔ اب اسے احساس ہوا کہ چینی کی قوت شامہ بھی لومڑی سے کم نہ تھی۔

اس نے آسمان سے آتی ایک دوسری آواز سنی۔ ایک پاکستانی فوجی ہیلی کاپٹر ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ اس نے دونوں بازو ہوا میں بلند کئے اور پھر چینی کی طرف اشارہ کیا اور ہیلی کاپٹر کو سمجھانے کی کوشش کی کہ سب خیریت ہے لیکن ہیلی کاپٹر والوں کو سمجھ نہ آئی۔ دوسرے لمحے دو دھماکے ہوئے چینی گری' ڈھلوان سے لڑھک کر اس کے قدموں میں لوٹنے لگی۔ اس کی گردن سے خون کے فوارے نکلنے لگے' آنکھیں بجھنے لگیں لیکن اسے ان میں ایک محبت اور خلوص کی چمک دکھائی دی۔ پھر وہ آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں وہ حیران ہو کر سوچنے لگا کیا ایک جانور اور انسان میں محبت ہو سکتی ہے؟

نانگا سائیں

علی عثمان قاسمی

نام اس کا نانگا سائیں تھا۔ نانگا سائیں مکمل طور پر کپڑوں کی قیود سے آزاد نہیں تھا۔ بس شلوار نہیں پہنتا تھا لہذا محلے کے لوگوں نے یہ لقب دے ڈالا حالانکہ جب کرتا شلوار کا کام بھی دے تو پھر ننگا پن کیسا۔ سائیں تو وہ تھا اس میں کوئی شک نہیں۔ گلے میں لمبی لمبی مالائیں پہنتا تھا اور پیروں میں گھنگھرو بندھے تھے۔ عجیب بغلول آدمی تھا۔ گرمیوں' سردیوں میں تن پر وہی ایک میلا' سبزی مائل کرتا نظر آتا تھا۔ ہاتھوں کے ناخن بڑھے رہتے تھے اور ان میں میل اس طرح جما ہوتا تھا جیسے بارش کا پانی کسی گڑھے میں دیر تک جمع رہے تو کائی جم جاتی ہے۔ سر کے بال وحشت زدہ انداز میں بڑھے ہوئے تھے۔ البتہ چہرے پر معصومیت کی پرچھائیں تھیں۔ اگر نہلانے' دھلانے اور ذرا سی تراش خراش کے بعد اس کو سنوارا جاتا تو وہ یقیناً خوش شکل دکھائی دیتا۔ بولتا تھا تو بالکل بچوں کے سے لہجے میں باتیں کرتا تھا۔ ظاہری تصنع یا بناوٹ کے ذریعے کبھی اپنے آپ کو ولی اللہ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کرتا تھا کہ بچارا اس کا شعور نہیں رکھتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ذہنی طور پر معذور جو تھا۔ اسے جعلی پیروں اور سائیوں کی طرح بوٹی پینے کا شوق بھی نہیں تھا۔ برگد کے گھنے شجر تلے اس کا زیادہ تر وقت گزرتا۔ کبھی کسی نے اسے وجدانی کیفیت یا سرور وصل کے لئے بھنگ گھونٹتے ہوئے نہیں دیکھا۔ گلے میں مالائیں بھی اس نے خود سے نہیں ڈالی تھیں۔ شروع شروع میں محلے کے باہر سے کچھ ملنگ آئے۔ جنہوں نے نانگا سائیں کو ولی اللہ کے سنگھاسن پر بٹھا کر پیری مریدی کا سلسلہ شروع کرنا چاہا تاکہ پیسے اینٹھ سکیں۔ ان کی دکان چل بھی نکلی اور توہم پرست عورتیں ان کے دام میں آ گئیں لیکن پھر ایک دو عورتوں کے ساتھ ان ملنگوں نے کچھ ایسی ''ولایت'' کا مظاہرہ کیا کہ محلے والوں کے غضب سے بچنے کے لئے ان کے پاس بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہ بچا۔ نانگا سائیں پر البتہ کوئی حرف نہ آیا کیونکہ وہ تو سائیں تھا۔

ناںگا سائیں اس لحاظ سے خوش قسمت تھا کہ محلے کے بچے اسے زیادہ تنگ نہیں کرتے تھے۔ وہ اطمینان کے ساتھ برگد کے درخت تلے بیٹھا رہتا جہاں لوگوں کے بقول اردگرد کے شوروغل' ٹریفک کے رش' گردوغبار اور آلودہ ماحول میں بھی اسے نروان حاصل تھا۔ جس کے لئے عام آدمی صرف آرزو ہی کرسکتا ہے۔ برگد کی بل

کھاتی 'لاسی' اور جھریوں ایسی چھاؤں سے کھیلنا اس کا پسندیدہ فعل ٹھہرا تھا۔ لیکن وہ سارا دن پیڑ تلے نہ بیٹھتا محلے کی گلیوں میں بھی پھرتا اور چکر لگاتا۔ محلے کی عورتیں اس کے گھنگھروں کی آواز سے اس کی آمد کا اندازہ لگا لیتیں۔ کھانے پینے کے لئے تانگا سائیں کو کبھی مانگنا نہیں پڑتا تھا۔ عورتیں خود ہی عقیدت کے ساتھ اسے تازہ پکی ہوئی ہانڈی میں سے پنھ کی بوٹیاں اور دیسی گھی میں چپڑی ہوئی روٹیاں پیش کرتی تھیں۔ وہ فراڈیے ملنگ تو نہیں رہے تھے لیکن سائیں برہنہ کے ولی اللہ ہونے کی دھاک باقی تھی۔ اور پھر سائیں برہنہ کی معصومیت تو ویسے بھی مصدقہ تھی۔ معصوم کی پرتاثیر دعا اور شفقت حاصل کر کے منتوں اور مرادوں کی تکمیل کے لئے سائیں کی خدمت ضروری سمجھی جاتی تھی۔ عورتوں کو اگر سبزی خریدنا ہوتی تو چھت پر کھڑے کھڑے پیسے چھکو میں ڈال کر رسی ڈھیلی چھوڑ دیتی تھیں۔ اور جب سبزی فروش سبزی تول کر چھکو میں ڈال دیتا تو رسی اوپر کھینچ لیتیں لیکن جب سائیں کو کھانے کھلانے کا فریضہ درپیش ہوتا تو سب کام کاج چھوڑ کر تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے آتیں اور تانگا سائیں کی سیوہ کرتیں۔ سائیں کبھی کسی کی چوکھٹ پار نہیں کرتا تھا۔ شاید چار دیواری میں مقید ہو جانے کا خوف اسے لاحق تھا۔ لہٰذا ہمیشہ کھلی فضا میں چلتا پھرتا اور سوتا نظر آتا تھا۔

لوگوں کا خیال تھا کہ سائیں کو رفع حاجت کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ لوگ اس ضمن میں ایک صاحب کا نام لیا کرتے تھے جنہوں نے برسوں ٹھنڈے پانی میں آنکھیں بند کئے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر ریاضت کی اور من کی لو محبوب سے لگانے کا حق ادا کیا۔ دوسرے ولیوں کے حوالے سے بھی اس نوع کے مافوق الفطرت قصے زبان زد عام تھے لیکن میں نے کبھی ان قصوں پر یا تانگا سائیں کی کشفاتی 'اولیانہ صلاحیتوں پر یقین نہیں کیا۔ دراصل میرے محلے میں جس میں نچلے درمیانے طبقے کے لوگوں کی کثرت ہے جن میں سے بیشتر کو مذہب سے منافقانہ قسم کی محبت ہے البتہ میری تربیت خاصے مختلف ماحول میں ہوئی ہے اور خصوصاً لاہور کے بہترین تعلیمی اداروں میں پڑھنے کے بعد جدید علوم سے بھی لگاؤ ہے اور ساتھ ہی غیر فطری' مافوق الفطرت عقائد کے بارے میں تشکیک آمیز رویہ بھی میری فطرت کا خاصا بن گیا ہے۔ لہٰذا میرے نزدیک سائیں محض ایک مظلوم انسان تھا جو ذہنی پسماندگی کے باعث غلاظت میں لتھڑی ہوئی زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ مجھے چشم تصور میں اس کے بغلوں کے بے ہنگم بالوں سے گھن آتی تھی اور یہ سوچ کر بھی متلی ہونے لگتی تھی کہ پتا نہیں وہ طہارت کے اصولوں سے بھی واقف ہے یا نہیں۔

سائیں کے بارے میں میں ہمیشہ متجسس رہا کہ آخر وہ محلے میں آیا کہاں سے تھا۔ لیکن اس کا جواب کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔ یہ بات طے تھی کہ اس کی پیدائش اس محلے میں ہرگز نہیں ہوئی تھی۔ پکی کانی کے بیجوں کا کڑوا تیل بیچنے والے علم دین کے بقول اس نے سب سے پہلے سائیں کو آج سے کئی برس پیشتر اسی برگد کے پیڑ تلے دیکھا تھا جہاں محلے میں آمد کے بعد اس کا مستقل آستانہ تھا۔ اس وقت سائیں کی عمر پندرہ برس ہوگی۔ ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں اور وہ برگد کے مضبوط اور چوڑے چکلے بیٹے ایسے وجود سے چمٹ کر دہشت زدہ انداز میں

رہا تھا جیسے نئے ماحول کی اجنبیت سے پریشان ہو۔ یہ علم دین کا بیان تھا۔ واللہ عالم اس میں کہاں تک صداقت تھی۔ جو بھی ہو یہ تانگا سائیں کی خوش قسمتی ہی تھی کہ پیشہ ور فقیروں کے ہتھے نہیں چڑھ گیا ورنہ کیا پتہ اس کا معصوم سر آہنی شکنجے میں جکڑ کر اور بعد میں سبز چوغہ پہنا کر اسے شاہ دولے کا چوہا بنا دیتے۔ دربار پر دھمالیں ڈلواتے یا پھر جیب منواتے۔ لیکن محلے کے لوگوں کو سائیں کے ایام رفتہ سے آگہی حاصل کرنے کا ایسا کوئی خاص شوق نہیں تھا کہ وہ اس موضوع پر سر کھپائی کرتے۔ ہاں جہاں تک سائیں کی برہنہ ہونے یا پھر یوں کہہ لیجئے کہ سائیں برہنہ کے شلوار نہ پہننے کا تعلق تھا تو اس کا تسلی بخش جواب کم از کم میرے ذہن میں موجود تھا۔ دوسرے لوگ تو اسے سائیں کے ملے پن کی دلیل مان کر نظر انداز کر دیتے تھے لیکن میرا یہ خیال تھا کہ شلوار نہ پہننے کی وجہ سائیں کی جلی ہوئی پنڈلیاں فراہم کرتی ہیں۔ میرا گمان یہ کہتا تھا کہ کسی وجہ سے حادثاتی طور پر سائیں کی شلوار کو آگ لگی ہوگی جس کا نشان اس کی پنڈلیوں پر ہمیشہ باقی رہا۔ نتیجتاً آگ کا ایسا خوف اس کے ذہن میں بیٹھا کہ اس نے شلوار کے بغیر ہی رہنا سیکھ لیا۔ کچھ لوگوں نے سائیں کو شلوار پہنانے کی کوشش کی لیکن اس نے ایسی اذیت ناک چیخیں ماریں جیسے کسی اندوہناک کرب کا شکار ہونے جا رہا ہو۔ آنکھیں بنٹوں کی طرح باہر ابل پڑیں زبان دانتوں تلے دب گئی اور منہ سے لعاب دہن چھینٹوں کی صورت میں خارج ہونے لگا۔ لگتا تھا گویا تشنج کا حملہ ہے۔ دیر تک سائیں برہنہ زمین پر پڑا ہانپتا رہا۔ ایسے میں مجھے اپنے نظریے پر مزید یقین ہونے لگا۔ اگرچہ واضح ثبوت میرے پاس بھی موجود نہ تھا۔ پھر بھی میرا نظریہ اور دلیل قرین عقل معلوم ہوتا تھا۔ بالکل جس طرح ارتقائے کائنات کے ضمن میں بگ بینگ یا دیگر نظریات موجود ہیں۔ جو سو فیصد درست نہ سہی پھر بھی سائنسی دلیل اور عقلی روح رکھتے ہیں ایسے نظریات کے مقابلے میں جن پر محض عقیدت مندی کا ملمع چڑھا ہوتا ہے اور یہی ان کی صداقت کا ثبوت ہوتا ہے۔ میں نے کہا نا میں اپنے محلے میں سب سے زیادہ پڑھا لکھا ہوں شہر کے بہترین کالج کا طالب علم رہا ہوں دل سے نہیں دماغ سے سوچتا ہوں۔ قیاس آرائیوں پر ایمان لے آنے کی بجائے بین دلائل یا ٹھوس شواہد کا متلاشی رہتا ہوں۔

خیر یہ بات تو جملہ معترضہ کے طور پر کہی گئی ورنہ سائیں تو سائیں تھا اسے کیا پتا مغرب کی عقلیت پسندی اور مستشرقیت کی تقلیدیت کیا ہوتی ہے۔ ہاں البتہ سائیں کی شلوار جو اس نے کبھی نہیں پہنی اس کا اس واقعہ سے گہرا تعلق ہے جو میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں۔

ایک دن ایسا ہوا کہ سائیں کی نظر التفات نے دوپہر کے کھانے کے لئے میرے غریب خانے کو عزت بخشی۔ میری بیوی صفیہ نے چانپوں سے ہڈیاں علیحدہ کر کے ستھرا گوشت سائیں کی خدمت میں پیش کیا۔ میں نے صفیہ کو ٹوکنا مناسب نہ سمجھا۔ بے چاری ایم اے پاس ہونے کے باوجود توہم پرستانہ عقائد میں گتھی ہوئی تھی۔ خیر اگر میں بھی گھر پر اکیلا ہوتا تو سائیں کے کھانے کے لئے ضرور کچھ پیش کرتا۔ لیکن خصوصی طور پر کسی قسم کا اہتمام ہر گز نہ کرتا اور نہ ہی ایسے پر تکلف طعام کا بندوبست کرتا۔ میری بیوی اور لوگوں کو بھی کھانا کھلاتی تھی۔ مثلاً گھر کی

نوکرانی یا پھر محلے سے کوڑا اٹھانے کے لئے آنے والا خاکروب جنہیں اسٹیل کے گلاس میں پانی ملتا تھا اور پلیٹ کی جگہ پولی تھین کے لفافے میں فریج سے ٹھنڈا سالن اور چاول پیش کئے جاتے تھے جس میں اگر بوٹیاں موجود بھی ہوتی تھیں تو علیحدہ پلیٹ میں محفوظ کر لی جاتی تھیں تا کہ خاکروب یا نوکرانی کا لقمہ نہ بن سکیں۔ لہٰذا سائیں کے سلسلے میں یہ خصوصی انتظامات نہ صرف بے معنی تھے بلکہ دوسرے مستحقین کے مقابلے میں مجھے تو یہ صاف اور کھلی ڈسکریمینیشن معلوم ہوتی تھی۔

بہرکیف جو بھی ہوا اس روز پہلی مرتبہ میں نے سائیں کو کھانا کھاتے دیکھا۔ سائیں کے پاس نوکرانی کھڑی اس بات کا مستعدی سے خیال رکھ رہی تھی کہ سائیں کو روٹی' سالن یا پانی طلب نہ کرنا پڑے بلکہ ختم ہونے سے پہلے ہی میسر آ جائے۔ سائیں شائستگی کے ساتھ چھوٹے چھوٹے لقمے توڑتا اور انہیں دیر تک چباتا۔ کسی قسم کا بے ڈھنگا یا وحشی پن نظر نہیں آتا تھا اور نہ ہی اسے گوشت کا ایسا لالچ تھا۔ شاید اس لئے بھی کہ روزانہ گول بوٹی کا گوشت کھا کر وہ رجا ہوا تھا۔ شوربا پی کر اس نے بہت سی بوٹیاں پلیٹ میں چھوڑ دیں۔ یوں لگتا تھا کہ سوکھی ہوئی نہر میں بڑے بڑے پتھر باقی رہ گئے ہوں۔

اس کے بعد اکثر سائیں ہمارے گھر سے روٹی کھا کر گیا' دوپہر کو میں تو کام کے سلسلے سے باہر ہوتا تھا' لہٰذا کچھ کہہ نہیں سکتا تھا لیکن شام کو بھی اکثر میں نے اسے اپنی گلی میں ٹہلتے دیکھا یا یوں کہہ لیجئے کہ اس کے گھنگھروؤں کی آواز سے اسے ٹہلتے سنا۔ شام کو کھانا سرو کرنے کے لئے صاعقہ اور سرور غیر معمولی دلچسپی دکھاتے۔ نوکرانی کام کر چکنے کے بعد چلی جاتی تھی۔ لہٰذا یہ دونوں اپنے ننھے منے ہاتھوں سے سائیں برہنہ کو کھانا کھلانے میں جت جاتے۔ صفیہ دروازے پر کھڑے دونوں کو تکتی رہتی۔

اس روز آندھی کے آثار تھے۔ صفیہ نے مجھ سے درخواست کی کہ میں ذرا بچوں کا خیال رکھوں۔ چار و ناچار میں باہر آ کر کھڑا ہو گیا۔ کام چھوڑ کر آنا پڑا تھا۔ طبیعت میں جھنجھلاہٹ کا عنصر غالب تھا۔ لہٰذا بے وجہی کے سے انداز میں سائیں کو تکتا رہا۔ سائیں کھانا کھا کر اٹھا ہی تھا کہ طوفان کا ایسا جھکڑ چلا جس سے سائیں کا میلا' بدبودار کرتا ہوا میں لہرانے لگا اور زور سے پھڑ پھڑانے لگا' یہاں تک کہ اس کا چہرہ اپنی کرتے کے دامن میں چھپ گیا۔ سائیں بچوں کی طرح کلکاری مار کر ہنسنے لگا اور دونوں ہاتھ پھیلا کر مستی کے عالم میں چکر کاٹنے لگا' جیسے کوئی صوفی رقص کر رہا ہو۔

صاعقہ اور سرور برتن سمیٹنا بھول گئے اور پھر وہ ہنستی ہوئی اندر دوڑ گئی۔ سرور شرمندگی' خجالت اور غصے کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس کے پیچھے دوڑا۔ اور پھر یکلخت میں نے بھی محسوس کیا کہ جھکڑ چلنے سے سائیں مکمل طور پر برہنہ ہو گیا تھا۔ باوجود اس کے کہ سائیں کے جسم کے ہر حصے پر الجھے ہوئے بے ترتیب اور گھنے بال تھے تاہم یہ بال اس جھکڑ سے حاصل ہونے والی تازگی اور لذت کا راستہ نہ روک سکے۔ اب ننگا سائیں مکمل سرمستی کی عالم میں تھا' اور گرد و پیش سے بالکل بے خبر ایک دائرے میں رقص کر رہا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ اس کے

جسم کو ٹٹولتا جاتا تھا۔ اس دوران صفیہ سے میری آنکھیں چار ہوئیں تو وہ گڑبڑا کر کمرے میں چلی گئی۔ میں بھی گھر کے اندر دوڑا، غسل خانے میں کھونٹی پر ٹنگی اپنی شلوار کو جھپٹ کر ہاتھ میں پکڑا اور واپس گلی میں آیا جہاں سائیں پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ پھر وہ اچانک رک گیا۔ میں نے اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر دھکا دیا جس سے وہ اپنے لتھڑے ہوئے جسم کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ اب وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سکون کے آثار تھے یوں لگتا تھا پہاڑوں سے گرنے والا کوئی پرشور نالہ میدانی علاقے میں داخل ہو گیا ہو۔ میں اسے شلوار پہنانے کے لئے آگے بڑھا میرا خیال تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح اس دفعہ بھی شدید مزاحمت کرے گا اور شلوار نہیں پہنے گا، لیکن ناگا سائیں نے بغیر مزاحمت کے شلوار پہن لی اور پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور پھر وہ ہنستا چلا گیا۔

o.....o.....o

خزاں دریدہ بدن

برطانیہ میں مقیم معروف شاعر

صابر رضا

کا نیا شعری مجموعہ عمدہ گیٹ اپ کے ساتھ

امپورٹڈ پیپر پر شائع ہو گیا ہے۔

صفحات: 192 قیمت: 250

ملنے کا پتہ: **روداد پبلی کیشنز**

734-' سٹریٹ 102' جی نائن فور اسلام آباد

-93 LEES Road Ashton underline
Lanca shire, OL6 8BQ
UK.

مشکور حسین یاد

ہستی کے اعتبار کی صورت یہی تو ہے
آ اپنے سامنے کہ حقیقت یہی تو ہے

اپنے پرائے کی یہاں تفریق ہے فضول
سب کو گلے لگا کہ محبت یہی تو ہے

پہچان تیری دیر میں ہو اور دور تک
تو مان یا نہ مان کہ شہرت یہی تو ہے

تو بھی جمالِ ارض ہے میں بھی جمالِ ارض
اس خاک کے مزاج کی وسعت یہی تو ہے

ہے جو بھی اس کے روبرو اک شاہکار ہے
آئینۂ خیال کی حیرت یہی تو ہے

سعیٔ بشر میں عزمِ قیامت ہے جلوہ گر
غم ہائے روزگار کی عظمت یہی تو ہے

تو اپنے ساتھ ہے تو زمانہ ہے تیرے ساتھ
طاقت یہی تو ہے تری دولت یہی تو ہے

اس کے علاوہ یادؔ نہیں کچھ ہمیں خبر
تم اپنے آپ میں ہو شرافت یہی تو ہے

شبنم رومانی

ستم ظریفیِٔ معنی کا شاخسانہ ہوئی
غزل بھی لغزشِ اظہار کا بہانہ ہوئی
بھٹک رہی ہے کسی اجنبی قلمرو میں
وہ رَوٗ جو ذہن سے سوئے قلم روانہ ہوئی
کھلا سکی نہ کوئی پھول بارشِ احساس
فقط اجاڑ زمینوں کا آبیانہ ہوئی
نگارِ فکر؛ وہ سنگ افگن غلط انداز
جو اپنے سنگِ ملامت کا خود نشانہ ہوئی
جو آسمان بناتی تھی ان زمینوں کو
وہ شاعری بھی مری جان! اب فسانہ ہوئی
ہم اجنبی تھے مگر اتنے اجنبی بھی نہ تھے
جو گفتگو ہوئی اس سے وہ محرمانہ ہوئی!

✻

شبنم رومانی

یہ فیصلہ گُلِ نکہت مآب! میں نے کیا
بھرے چمن میں ترا انتخاب میں نے کیا
ملائی روشنیٔ طبع روشنائی میں
تب اپنے آپ کو جزوِ کتاب میں نے کیا
کھلا یہ مجھ پہ کہ میں خود ہی اپنا دشمن ہوں
خود اپنی ذات کا جب احتساب میں نے کیا
مرا خدا انہیں پردوں میں کائنات کے ہے
سو کائنات سے اکثر خطاب میں نے کیا
جو مجھ کو خوف تھا روزِ حساب کا شبنمؔ
تو اُس کا شکر ادا بے حساب میں نے کیا

✻

شبنم رومانی

یادوں میں سُرخی، آنکھوں میں کالک بھر گئے
کیسے کیسے چاند اور سورج پردہ کر گئے!

جن کی ہیبت طاری تھی ساری دنیا پر
آج آئینہ دیکھ کے اپنے آپ سے ڈر گئے

جو زندہ ہیں، اپنے آپ سے شرمندہ ہیں
لیکن وہ، جو مرنے سے پہلے ہی مر گئے

ساحل والے رہ گئے اپنا سا منھ لے کر
ڈوبنے والے ڈوب کے دریا پار اتر گئے

ظالم نے جانے کتنوں کو قتل کیا تھا
ہم بدنام تھے، سب الزام ہمارے سر گئے

ہم کو کیا کیا ناز تھا اپنے حُسنِ لُغت پر
آج اس کے الفاظ ہمیں بھی حیراں کر گئے

خورشید رضوی

ہمیں رکھتی ہے یوں قیدِ مقام آزردہ
کہ جیسے تیغ کو رکھے نیام آزردہ

ہے جانے کس لئے ماہِ تمام آزردہ
کھڑا ہے دیر سے بالائی بام آزردہ

گریباں چاک کر لیتی ہیں کلیاں سن کر
ہوائے صبح لاتی ہے پیام آزردہ

بتا اے زندگی یہ کون سی منزل ہے
ہے خواب آنکھوں سے اور لب سے کلام آزردہ

یہ خاکِ ست رو اس کے ہیں اپنے عنصر
نہ ہو اس سے ہوائے تیز گام آزردہ

گری ہے تاک پر شاید چمن میں بجلی
پڑے ہیں سرنگوں مینا و جام آزردہ

غزل کس بحر میں خورشید یہ لکھ ڈالی
نہ کر محفل کو یوں اے کج خرام آزردہ

بخش لائلپوری

جزیرے سر اپنا اٹھانے لگے ہیں
پسینے سمندر کو آنے لگے ہیں

ہم اہلِ تکبر کے اونچے منارے
جلا کر زمیں پر گرانے لگے ہیں

منڈیروں پہ اب ٹمٹماتے دیئے بھی
ہواؤں کا زور آزمانے لگے ہیں

یہ ناچیز مٹی کے کم مایہ ذرّے
پہاڑوں کو آنکھیں دکھانے لگے ہیں

جہاں بجلیوں کی ہیں آماجگاہیں
وہاں ہم نشیمن بنانے لگے ہیں

جو اک لمحۂ دید میں جل گئے تھے
انہیں بجھتے بجھتے زمانے لگے ہیں

ازل سے خلاؤں کے ہم ہیں مسافر
ستارے ہمیں آشیانے لگے ہیں

نئی سان پر جو چڑھا کر ہیں لائے
وہ سکے بہت ہی پرانے لگے ہیں

*

بخش لائلپوری

اونچے اونچے محل گرائے جا سکتے ہیں
اجڑے بجڑے بام سجائے جا سکتے ہیں

گم ناموں کے نام کی شہرت ہو سکتی ہے
ناموروں کے نام مٹائے جا سکتے ہیں

کانپ رہی ہے دنیا جن کی ہیبت سے
ان کو بھیانک خواب دکھائے جا سکتے ہیں

بطنِ فنا سے آگ کی بارش ہو سکتی ہے
اہلِ ستم کے شہر جلائے جا سکتے ہیں

طوقِ غلامی توڑ کے اہلِ مغرب کا
آزادی کے نغمے گائے جا سکتے ہیں

جنگ و جدل پر مائل مفسد لوگ یہاں
امن و اماں کی زد پر لائے جا سکتے ہیں

کڑی رتوں میں اگر طلب ہو سائے کی
بانجھ زمیں سے پیڑ اگائے جا سکتے ہیں

ہر اک آنگن رزق سے روشن ہو سکتا ہے
ہر اک گھر سے بھوک کے سائے جا سکتے ہیں

*

نوٹ: یہ اشعار امریکہ پر حملے کے بعد لکھے گئے ہیں ان میں اس طرف واضح اشارے موجود ہیں۔ بخش

ڈاکٹر خیال امروہوی

اب سوچ یہی ہے ہمیں ماضی نے دیا کیا
بالوں کی سفیدی کو سیاہی نے دیا کیا

جو دشمن انساں ہیں وہ قارون بنے ہیں
لیکن ہمیں انسان پرستی نے دیا کیا

بے نام تمنا ہی رہی عمر کی ساتھی
راوی سے ملا کیا ہمیں روہی نے دیا کیا

چہروں کے خط و خال پہ زردی ہے مسلط
اس نسل کو بیچاری جوانی نے دیا کیا

اخلاص کے مارے ہوئے اب سوچ رہے ہیں
ایثار سے کیا مل گیا' نیکی نے دیا کیا

جو اصل فسادی ہیں مقدر کے دھنی ہیں
ہم سب کو نزاعات فروعی نے دیا کیا

موہوم فوائد کی امیدوں کے علاوہ
بے ربط لکیروں کی ہتھیلی نے دیا کیا

سب اپنی بقا اور تحفظ میں ہیں مشغول
انسان کو قانون کی کرسی نے دیا کیا

ہم ووٹ تو دے آئے تھے انسان سمجھ کر
اس ووٹ کے بدلے ہمیں موذی نے دیا کیا

خالد اقبال یاسر

مطلق جسے سمجھنے لگوں وہ مجاز ہو
ناکام اس طرح نہ کسی کا ریاض ہو

کیا کیا نہ اس کے ناز اٹھائے تمام عمر
محبوب ہو تو غمزہ و عشوہ طراز ہو

رکھنا ہی ہر کہیں سے مجھے زاویہ درست
لگتا ہے جو نشیب مبادا فراز ہو

ایسا بھی ہو کہ ہر کس و ناکس کے واسطے
قانون کا منادی سے پہلے نفاذ ہو

اس سے ہی دشمنی مرا مقصود تو نہیں
شاید یہ میری جنگ کا بس اک محاذ ہو

ظالم سمجھ رہا ہے خدا اس کے ساتھ ہے
کیا جانے اس کی اصل میں رسی دراز ہو

خاموش ہو کے دیکھ لیا اس خیال سے
کیا علم اس کی آنکھ میں یاسر لحاظ ہو

٭

خالد اقبال یاسر

پہلے تھی اپنے وقت سے جو بھی نوید تھی
برزخ مرے نصیب میں کچھ دن مزید تھی

اک ہاتھ مختصر سے کسی فیصلے کی نقل
اک ہاتھ اک عریضے کی خستہ رسید تھی

ذہن رسا کے سامنے تھی منزل مراد
حد نگاہ سے مگر کتنی بعید تھی

انسان تھا میں بدل نہ سکا اس کے ساتھ ساتھ
دنیائے دوں سرشت میں ہر پل جدید تھی

ہر بے نظر تھا مسند و اسناد یافتہ
اہل نظر کی شہر میں مٹی پلید تھی

ابھرا نہیں غبار سے وہ مرد منتظر
ان شورشوں کے شور میں جس کی شنید تھی

رخصت کے وقت پہلے بھی کوئی نہ ساتھ تھا
پہلے بھی خلق اس طرح مشتاق دید تھی

تلوار اٹھانی پڑ گئی تنگ آ کے ایک دن
خواہش سکون و امن کی اتنی شدید تھی

اک راز ہے جو کھل کے بھی یاسر نہ کھل سکا
بے کار قفل زندگی کی ہر کلید تھی

٭

ناصر زیدی

تمہارے واسطے دل کا نگر سجا نہ سکے
یہ داغ وہ ہے جسے آج تک مٹا نہ سکے

غمِ زمانہ کے ہاتھوں سے ہیں ہم مجبور
ہنسی تو ایک طرف، صرف مسکرا نہ سکے

عجیب حال ہوا ہے تمہاری فرقت میں
کسی کے بن نہ سکے اور تمہیں بھلا نہ سکے

سنبھال رکھے ہیں اب تک امانتوں کی طرح
یہ دل کے زخم کسی کو بھی ہم دکھا نہ سکے

انہیں ملال اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ وہ
کچھ اور سنگِ ستم ہم پہ آزما نہ سکے

زمانہ ہو گیا رستے جدا ہوئے لیکن
ہم اپنی شمعِ تمنا کو تو بجھا نہ سکے

ہر اک کے واسطے سینہ سپر رہے ناصؔر
ہوائے دہر سے خود کو مگر بچا نہ سکے

٭

ناصر زیدی

کب کوئی تازہ ستم تجھ پہ مرے دل نہ ہوا
آفریں! پھر بھی تو تقدیر کا قائل نہ ہوا

اس کی محرومیِ قسمت پہ میں افسردہ ہوں
ہائے وہ دل جو ترے ظلم کے قابل نہ ہوا

منفرد آپ ہی ٹھہرے ہیں زمانے بھر میں
کوئی بھی آج تلک جس کا مماثل نہ ہوا

زندگی تو نے مجھے لا کے کہاں پر چھوڑا
شکریہ! پھر بھی میں درماندۂ منزل نہ ہوا

ڈوبنے والا معزز ہے مری نظروں میں
سخت طوفاں میں جو منت کشِ ساحل نہ ہوا

تند خوئی میں عجب رنگ ہیں اس کے یارو!
خوش کلامی سے فقط میں ہی تو گھائل نہ ہوا

کیسی افتادِ طبیعت کا ہے حامل ناصؔر
خود سے لڑ بیٹھا اگر کوئی مقابل نہ ہوا

٭

اکبر حمیدی

یوں بھی ہیں دلوں میں تصویریں جیسے الماریوں میں تصویریں
وہ زمانے حسین چہروں کے جس طرح چوکھٹوں میں تصویریں
کیسے چھپ چھپ کے دیکھا کرتے تھے نوجواں دوستوں میں تصویریں
کیسے دن تھے کہ ایک دوجے کو بھیجتے تھے خطوں میں تصویریں
ایک تصویر خانہ ہے وہ شخص اس کے سب منظروں میں تصویریں
جنبش دلفریب زاویوں میں اور سب زاویوں میں تصویریں

کوئی آیا تو دیکھے گا اکبر
رکھی ہیں کاغذوں میں تصویریں

٭

اکبر حمیدی

محبت کے زمانے آ گئے ہیں عنایت کے زمانے آ گئے ہیں
چلو اب جیت جانے دیں اس کو شرافت کے زمانے آ گئے ہیں
گھنے جنگل تھے طاقت کے زمانے سیاست کے زمانے آ گئے ہیں
ہوئے تہ دار نظروں کے اشارے علامت کے زمانے آ گئے ہیں
بہت ہے جنبشِ ابرو بھی ہم کو بلاغت کے زمانے آ گئے ہیں
بہر سُو چہچہے ہیں گل رخوں کے قیامت کے زمانے آ گئے ہیں

کون زلفیں کھول کر آئے ہیں اکبر
کہ راحت کے زمانے آ گئے ہیں

٭

افضل گوہر

دیر تک کوئی کسی سے بدگماں رہتا نہیں
وہ وہاں آتا تو ہو گا میں جہاں رہتا نہیں

ایک میں ہوں دھوپ میں کتنا سفر طے کر لیا
ایک تو ہے جو کبھی بے سائباں رہتا نہیں

تم کو کیوں پیڑوں پہ لکھے نام مٹنے کا ہے دکھ
اس بدلتی رت میں پتھر پر نشاں رہتا نہیں

وہ بنا لیتا ہے اپنا گھونسلہ دیوار میں
جس پرندے کا شجر میں آشیاں رہتا نہیں

تو پرندوں کی طرح اڑنے کی خواہش چھوڑ دے
بے زمیں لوگوں کے سر پر آسماں رہتا نہیں

٭

افضل گوہر

اب تو ہر بار ہی لگتا ہے کہ دم نکلے گا
جانے کس عمر میں اس جسم کا خم نکلے گا

اس کے دشمن نے اگر کاٹ دیئے ہاتھ تو کیا
اب کے دانتوں سے پکڑ کر وہ علم نکلے گا

تم بھی رونے کا سبب پوچھتے ہو دکھ دے کر
ایسے موسم میں تو پتھر سے بھی نم نکلے گا

میں تو بیٹھا ہوں یونہی سر کو جھکا کر ورنہ
تیرا قد بھی مری دستار سے کم نکلے گا

عمر کی اڑتی ہوئی ریت پہ افضل گوہر
دیرپا کیسے کوئی نقشِ قدم نکلے گا

٭

محمد فیروز شاہ

O

ہمارا منصب تھا گل رتوں کی روایتوں کو سنبھال رکھنا
مگر ہمیں بھی ہے اب خزاں کی وراثتوں کو سنبھال رکھنا

منافقت کے محاصرے میں مرا گھروندا بھی آ گیا ہے
مجھے تو ہرگز نہ راس آیا رفاقتوں کو سنبھال رکھنا

کبھی جو تاریخِ شب لکھو تو یہ سچ کی عینی شہادتیں ہیں
ہمارے بے انت رتجگوں کی امانتوں کو سنبھال رکھنا

ہم اپنی نسلوں کے واسطے کوئی سرخروئی تو چھوڑ جائیں
لہو سے لکھے ہوئے دنوں کی عبارتوں کو سنبھال رکھنا

ہماری عمریں تو برفباری کی یخ رتوں میں بکھر رہی ہیں
اس آزمائش میں تم انا کی تمازتوں کو سنبھال رکھنا!

صائمہ اسماء

ہنسی کی آنکھ میں پھیلا نمی کا رنگ دیکھا ہے
اندھیروں میں لپیٹا روشنی کا رنگ دیکھا ہے

سدا پہلو میں بھی مد مقابل کی طرح رہنا
کسی کی دوستی میں دشمنی کا رنگ دیکھا ہے

بڑی گہری محبت کی دھنک ہے جن نگاہوں میں
انہی میں گاہے گاہے دل لگی کا رنگ دیکھا ہے

کتابوں سے نکلتا ہے تو پہچانا نہیں جاتا
وگرنہ سامنے اکثر خوشی کا رنگ دیکھا ہے

چرا کر لے نہ جائے فاصلوں کی دھوپ بھی جس کو
کسی پر اس قدر گہرا کسی کا رنگ دیکھا ہے

یہ دیکھا ہے کہ گمراہی نشاں بنتی ہے منزل کا
تغافل کی ڈگر میں آگہی کا رنگ دیکھا ہے

شکستہ، سوختہ جاں بھی، تمنائے بہاراں بھی
درختوں پر خزاں میں آدمی کا رنگ دیکھا ہے

لگے جو دھوپ اڑ جائے، ملے بارش تو بہہ جائے
کبھی رنگوں سے کچا زندگی کا رنگ دیکھا ہے

نہ جانے اس پہ اترے گا کبھی ٹھہراؤ کا موسم
ہر اک لحظہ بدلتا اوڑھنی کا رنگ دیکھا ہے

شہرتِ خستہ

انتظار حسین

مولانا حالی نے شیخ سعدی کے ذکر میں بیان کیا کہ شیخ ایک لمبی مدت تک بیت المقدس میں سقائی کی خدمت انجام دیتے رہے۔ در مسجد پر کھڑے ہیں اور دوڑ دوڑ کر پیاسوں کو پانی پلا رہے ہیں۔ یہ تصویر ایک زمانے سے میرے ذہن میں اٹکی چلی آ رہی ہے۔ اب شہرت بخاری کو یاد کر رہا ہوں تو احساس ہوا کہ اسی کے متصل ایک اور تصویر میرے ذہن میں اٹکی ہوئی ہے۔ ایک منحنی نوجوان پانی سے بھرا ایک جگ اور ایک گلاس لے کر ٹی ہاؤس سے نکلتا ہے اور وائی ایم سی اے کے بورڈ روم میں جا کر گلاس اور جگ کو ایک طرف رکھ ڈسٹر سے کمرے کے وسط میں بچھی بڑی میز کو صاف کرتا ہے، کرسیوں کو جھاڑ پونچھ کر میز کے گرد سلیقہ سے آراستہ کرتا ہے۔ اتنے میں لوگ آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ لیجئے حلقہ ارباب ذوق کا جلسہ شروع ہو گیا۔ بحث گرم ہوئی۔ گرما گرمی میں بولتے بولتے جس کا حلق خشک ہوا اس کے لئے پانی کا گلاس حاضر ہے۔

شہرت بخاری نے کتنے برسوں تک اور کتنے ذوق وشوق سے حلقہ کی یہ خدمت انجام دی کہ اب اس کی یہ تصویر میرے تصور میں کھب کر رہ گئی ہے۔ اس حساب سے شہرت کو حلقہ ارباب ذوق کا سقہ کہیں تو کیا مضائقہ ہے۔

یہ پاکستان کی اولین دہائی کا ذکر ہے۔ قیوم نظر حلقہ میں مرکزی شخصیت کی حیثیت رکھتے تھے اور بالعموم سکریٹری کا عہدہ سنبھالے رکھتے تھے اور شہرت ہر پھر کر ان کا نائب سکریٹری۔ شہرت کا عشق حلقہ سے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ اتنا بڑھا کہ اس نے اپنے پہلے مجموعے کا انتساب بھی ایک جذباتی انداز میں حلقہ کے نام کیا۔

میں سوچ رہا ہوں کہ شہرت کا حلقہ سے یہ عشق آخر کس خوشی میں تھا۔ حلقہ تو روایت سے بغاوت کرنے والوں کا اڈا تھا۔ میرا جی اس وقت اردو شاعری کی دنیا میں بغاوت کا سب سے بڑا نشان تھے۔ پھر حلقہ میں جس شاعر نے سر اٹھایا میرا جی کی ریت کو اپنایا اور روایت سے بغاوت کو اپنا طرۂ امتیاز جانا۔ ادھر شہرت روایت کا پرستار۔ کلاسیکی شاعروں کا کلمہ پڑھتا تھا۔ غزل پر ریجھا ہوا تھا۔ نئی شاعری سے سخت بدکتا تھا۔ سو اگر اس نے احسان دانش کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تو بجا کیا۔ حلقۂ دانش سے نکل کر حلقہ ارباب ذوق میں کس تقریب

سے آیا۔ اور پھر ایسا ویسا نہیں آیا۔ موصوف حلقہ کے عاشق بن گئے۔ یہ انمل بے جوڑ بات نہیں ہے کیا۔ مگر شہرت کی زندگی میں ایسی انمل بے جوڑ باتیں بہت نظر آئیں گی۔

شہرت، سچا اور پکا روایت پسند تھا۔ پرانی وضع کا تعصب کی حد تک قائل۔ کوئی نئی بات ہو زندگی میں یا ادب میں اس پر بہت تاؤ کھاتا تھا۔ ارد گرد جو نوجوان نئی شاعری کا ڈھول پیٹتے نظر آتے تھے ان پر کس طرح دانت پیستا تھا۔ ہاں اگر کوئی میراجی کا حوالہ دے دیتا تو دم سادھ لیتا تھا۔ یا پھر بھنا کر جواب دیتا کہ وہ تو میراجی تھا۔ یہ کل کے چھوکرے جاہل اجڈ یہ کس برتے پر میر و غالب کا منہ چڑاتے ہیں اور بڑوں کے منہ آتے ہیں۔ یہی زندگی کے معاملات میں اس کا محور تھا۔ نئے چلن اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ وضع کا پابند' سخت قسم کا قدامت پسند مگر اچانک ایسا کچھ کر گزرتا کہ ہم حیران رہ جاتے۔

زمانہ اپنی سواریوں کے واسطے سے بھی تو پہچانا جاتا ہے۔ ان دنوں ہم سائیکل کے زمانے میں سانس لے رہے تھے۔ حلقہ کی دو سائیکلوں نے بہت شہرت پائی۔ قیوم نظر کی سائیکل اور مبارک احمد کی سائیکل۔ قیوم صاحب گورنمنٹ کالج میں جب استاد بنے تو انہوں نے نیکر کو تیاگا اور کوٹ پینٹ پر آ گئے۔ لیکن سائیکل سے انہوں نے آخری دنوں تک نباہ کیا۔ یہی سواری شہرت بخاری کی بھی تھی۔ مگر ایک شام ٹی ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے ہمیں اچانک موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ سنائی دی۔ دیکھا کہ شہرت موٹر سائیکل سے اتر رہا ہے۔ ٹی ہاؤس کے سائیکل سٹینڈ پر یہ پہلی موٹر سائیکل آ کر کھڑی ہوئی تھی۔ سکوٹر کی تو خیر ابھی شہر میں نمود ہی نہیں ہوئی تھی۔ لاہور کی دنیائے ادب میں دو موٹر سائیکلیں آگے پیچھے نمودار ہوئیں۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کی موٹر سائیکل اور شہرت بخاری کی موٹر سائیکل۔ خیر لیث صاحب تو جلد ہی ترقی کر کے موٹر سائیکل سے گزر کر موٹر سوار بن گئے۔ مگر شہرت نے اپنی موٹر سائیکل کو اپنی قدامت پسندی کے رنگ میں رنگ لیا۔ پھر زمانے نے کتنی کروٹیں لیں۔ شہر میں سکوٹروں کی ریل پیل ہوگئی۔ حلقہ کے کتنے رکن اور ٹی ہاؤس کے کتنے باسی سائیکل اور سکوٹر دونوں سواریوں سے گزر کر موٹر سوار بن گئے مگر شہرت جیسے اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ چپک گیا ہو۔ مگر خود وہ موٹر سائیکل بھی تو اس کے ساتھ چپک گئی تھی۔ شہرت نے ایک مرتبہ اسے بیچ بھی ڈالا تھا۔ مگر وہ موٹر سائیکل تو اب شہرت کے لئے کمبل بن چکی تھی۔ خریدار ہفتے ڈیڑھ ہفتے ہی میں اسے بھر پایا اور شہرت کو واپس کر گیا۔ اصل میں اب اس موٹر سائیکل کو صرف شہرت ہی چلا سکتا تھا۔ تو جس سواری کو ہم نے نئے زمانے کی سواری جان کر خوش آمدید کہا تھا وہ اب ہمیں زمانہ قدیم کی یادگار نظر آتی تھی اور شہرت کی قدامت پسندی کا اشتہار لگتی تھی۔

مگر ذاتی طور پر مجھے اس موٹر سائیکل کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ اس کے مجھ پر اور مجھ ایسے کئی اور دوستوں پر بہت احسانات ہیں۔ اب آپ تصور کیجئے کہ گرمی کی دوپہر ہے۔ ہم ٹی ہاؤس میں بند بیٹھے ہیں۔ اتنی ہمت نہیں کہ گھر جائیں۔ ایسے عالم میں ہمارا آخری سہارا شہرت ہوتا تھا۔ میں اور سعید محمود اس کی موٹر سائیکل پر پیچھے بیٹھے اور دم کے دم میں اس کے گھر پہنچ گئے۔ کھانا کھایا' آرام کیا۔ دن ڈھلے نہائے دھوئے اور پھر اس برق

رفتار سواری پر بیٹھ کر نی باؤس پہنچ گئے۔ اس گھر میں شہرت اکیلا دم تھا۔ دوسرا اس کا ملازم مختار جو کھانا بہت اچھا بناتا تھا۔ اور ہر دم خدمت کے لئے حاضر۔ اس گھر میں شہرت برس کے برس محرم کی تقریب سے دوستوں کو جمع کرنے کا اہتمام کرتا تھا۔ ۸ محرم کی شب وہ کس عقیدت اور احترام سے موم بتیاں جلاتا' اگر بتیاں سلگاتا۔ مرثیہ پڑھنے کے لئے ہر دوست تیار۔ آخر میں حاضری جسے اعجاز حسین بٹالوی آج تک آلو شورا کہہ کر یاد کرتے ہیں اور ہونٹ چاٹتے ہیں۔

شہرت ان دنوں تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔ اور ہم نے جیسے فرض کر لیا تھا کہ اس کا زیست کرنے کا بس یہی طور رہے گا۔ مگر شہرت نے ایک مرتبہ پھر یاروں کو حیران کیا۔ بس جیسے اس کی زندگی میں اچانک موٹر سائیکل نمودار ہوئی تھی بس ایسے ہی اچانک اس سونے گھر میں دلہن کی ڈولی آئی۔ مگر ڈولی کہاں آئی۔ یہ باغیانہ شادی تھی۔ کیسی ڈولی۔ کہاں کا جہیز' کہاں کی بری۔ نہ برات نہ براتی۔ نہ دولہا کے خاندان والے شریک تھے نہ دلہن کے خاندان والے۔ ڈھائی تین دوست۔ ایک میں' ایک سعید محمود' ایک بگا نقوی۔ اور ہاں عابد حسن منٹو۔ اصل میں یہ اس قماش کی شادی تھی جس کے لئے آج کل عاصمہ جہانگیر کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ اس وقت عاصمہ جہانگیر والی خدمات کے لئے شہرت نے عابد حسن منٹو کو پکڑ لیا۔

جب یاروں کو اس شادی کا پتہ چلا تو ہکا بکا رہ گئے کہ وہ جو قدامت پسندی پر فخر کرتا تھا اور سماج کے باغیوں کو اٹھتے بیٹھتے برا بھلا کہتا تھا اس نے شادی کس باغیانہ شان کے ساتھ رچائی۔

مگر یاروں کو ابھی اس سے بڑھ کر حیران ہونا تھا۔ انہوں نے تو شہرت کا ادیب کی حیثیت سے وہی روپ دیکھا تھا جو حلقہ میں نمایاں ہوا تھا کہ اپنی غزل کی فضا میں مگن ہیں۔ ترقی پسندوں سے بیزار ادیب کے سیاست میں حصہ لینے کے سخت خلاف۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ۵۸ء میں لاہور میں ادیبوں کی طرف سے یوم الجزائر منایا گیا تھا اور میں اس کی انتظامی کمیٹی میں سکریٹری کی حیثیت میں شامل تھا تو شہرت کو اس پر سخت اعتراض ہوا تھا۔

''یار تم بھی ترقی پسند ہو گئے۔''

''یہ ترقی پسند ہونے نہ ہونے کا مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے اپنی وضاحت پیش کی۔ ''الجزائر میں مسلمان آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہمیں ان کی حمایت کرنی چاہئے۔''

شہرت اس دلیل سے مطمئن نہیں ہوا۔ مگر یہ تو ۵۸ء کا ذکر ہے۔ اعلانِ تاشقند کے بعد تو پاکستان میں دنیا ہی بدل گئی تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو ایوب خان کی اطاعت کا رسہ تڑا کر آزاد ہو چکے تھے۔ وہ سیاست کی دنیا میں آندھی دھاندی آئے اور سیلاب بن کر امنڈے۔ کتنے ایسے شرفا جو اب تک سیاست سے بے تعلق چلے آتے تھے اس میں بہہ گئے۔ اور یاروں نے حیرت سے دیکھا کہ بہہ جانے والوں میں اپنا دھان پان شہرت بھی ہے۔ یہ محض بھٹو کی شخصیت کا سحر تھا یا اس میں کچھ شہرت کے جذباتی تقاضوں کا بھی دخل تھا۔ شہرت میں عقیدت کا جذبہ تو وافر

مقدار میں تھا۔ مگر اب تک وہ ماضی کی شخصیتوں پر صرف ہو رہا تھا۔ سب سے بڑھ کر چہاردہ معصومین پر۔ حاضر میں کوئی شخصیت اس کی جذباتی ضرورتوں کو پورا کرتی تب ہی تو اس کی پرستش کی مستحق ٹھہرتی۔ بھٹو نے سیاست میں طوفانی شان کے ساتھ نمودار ہو کر ان جذباتی ضرورتوں کو پورا کر دیا۔ جو کسر رہ گئی تھی اسے پھانسی کے واقعہ نے پورا کیا۔ بھٹو صاحب نے شہید ہیرو بن کر شہرت کے اندر جوش کھاتے ہوئے سارے جذبہ عقیدت کو سنگھوالیا۔ اس بچے اور پکے کربلائی نے گریہ کو تو پہلے ہی اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ بھٹو صاحب کی پھانسی کے بعد اس گریہ کو ایک نئی جہت مل گئی۔ شہرت نے بھٹو صاحب کو پھانسی پانے کے بعد مرتبہ شہادت پر فائز دیکھا اور جوش گریہ میں اس راہ میں گھر لٹانے پر آمادہ ہو گیا۔ محاورتاً نہیں۔ اس نے اس راہ میں سچ مچ اپنا گھر لٹا دیا۔ گھر سے بے گھر ہوا۔ بیوی کہیں شوہر کہیں۔ جب فرخندہ بخاری کو جیل سے نکال کر شام پہنچایا گیا تو شہرت نے اپنی خانہ بربادی کو کسی اور ہی سیاق و سباق میں دیکھنا شروع کر دیا۔ آپ کو کچھ معلوم ہے کہ شام کونسا مقام ہے۔

عابد ملے یہ وطن میں کسی نے کیا کلام
گذرے کہاں زیادہ ستم تم پہ یا امامؑ
مولا نے تین بار کہا شامؑ شامؑ شام

اب اس سید زادے نے شام کے اس کردار کو یاد کیا اور اپنی بے گھری، بے دری کو مظلومیت کے اس مبارک سلسلہ کے ساتھ دل ہی دل میں نتھی کر لیا۔ بیگم کو پیغام بھجوایا کہ شام پہنچ ہی گئی ہو تو بی بی زینب کے روضے پر حاضری ضرور دینا۔ وہ بی بی ہماری حاجت روائی کریں گی۔

فرخندہ خدا خدا کر کے شام کے قید خانے سے نکلیں اور لندن پہنچیں۔ اور شہرت بخاری کا قدم کہاں ٹی ہاؤس سے باہر نہیں نکلتا تھا، کہاں اب وہ لندن کی جانب رواں دواں تھا۔

کتنے برس شہرت لندن میں رہا۔ بس ہم خبریں سنتے رہے کہ یہ غریب الوطن وہاں کس بے سرو سامانی میں بسر کر رہا ہی اور لاہور کے ہجر میں رو رو کر شام و سحر کر رہا ہے۔ پیپلز پارٹی کے کتنے جیالوں نے دیارِ غیر میں جا کر اپنا مقدر بدل لیا۔ اس خانہ خراب نے لندن جا کر کیا کمایا۔

زمانے بعد جب خبر ملی کہ شہرت اور فرخندہ آخر کے تئیں وطن واپس آ رہے ہیں تو میں استقبال کے لئے خوشی خوشی ایئر پورٹ پہنچا۔ وہاں کیا خوب منظر دیکھا کہ نعرہ لگاتے جیالوں کا ہجوم۔ بیچ میں ایک جیپ پر شہرت اور فرخندہ اس شان سے کھڑے ہیں کہ گلوں میں ان کے گجرے ہیں اور سروں پر پھول برس رہے ہیں۔ اس ہجوم کو چیر کر جیپ تک پہنچنا میرے لئے ممکن نہیں تھا۔ بس دور کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا۔ شہرت کی نظر کہیں مجھ پر پڑ گئی۔ وہ چپکے سے جیپ سے اترا اور مجھ سے آ کر بغل گیر ہو گیا۔ پھر ہم دونوں مل کر یہ خوش کن منظر دیکھتے رہے کہ فرخندہ بی بی پر پھولوں کی بارش ہو رہی ہے اور جیالے جوش و خروش کے ساتھ جیوے جیوے بھٹو کے نعرے لگا رہے ہیں۔

اصل میں اس نئے معرکۂ حق و باطل میں پہلے شہرت نے قدم رکھا تھا۔ مگر پھر یوں ہوا کہ فرخندہ بی بی

جوش میں آ گے نکل گئیں۔ شہرت آخر کو شاعر نکلا شاعر بھی رجعت پسند قسم کا۔ غریب پیچھے رہ گیا۔ جوش اس کے یہاں بھی بہت تھا مگر بس جوشِ گریہ کی حد تک۔ جوشِ عمل اور جوشِ گریہ کے بیچ جو ایک فاصلہ ہے وہ یہاں بھی نظر آ رہا تھا۔ ایئر پورٹ والے استقبال میں بھی یہ فاصلہ نظر آ رہا تھا۔ پھر یہ فاصلہ خوشگوار اور ناخوشگوار رنگ سے بڑھتا ہی چلا گیا۔

عجیب ہوا کہ زندگی کے آخری مرحلہ میں آ کر شہرت کا یاروں کے ساتھ بھی فاصلہ پیدا ہو گیا۔ جانے کیا کچھ اس کے دل پر گزر رہی تھی کہ اس نے دانستہ یہ فاصلہ پیدا کیا۔ ملاقات ہماری شہرت سے اب کم کم ہی ہوتی تھی۔ مگر اعجاز حسین بٹالوی ۸ محرم کی شب کے واسطے سے ایک نوسٹالجیا میں مبتلا چلے آتے تھے۔ شہرت جس اہتمام اور عقیدت سے اس شب مجلس منعقد کرتا تھا اسے وہ بھول نہیں پا رہے تھے۔ ہر محرم پرے کی صبح مجھے ان کا فون آتا

''کل ۸ کی شب ہے۔ شہرت کے یہاں چلنا ہے۔''

اور میں کہتا کہ ''وہ روایت پرست اس مبارک روایت کو کب کا چھوڑ گیا۔ وہ بلاتا تب ہی تو ہم جاتے۔''

''نہیں جانا ضرور ہے۔ ذکرِ امامؑ کرنا ہے اور آلو شورا کھانا ہے۔''

تو ہم زبردستی کئی سال تک اس مبارک شب شہرت کے یہاں گئے۔ لیکن نہ وہ دوستوں کا جمگھٹا نہ ذکرِ امامؑ میں وہ خضوع و خشوع۔ ایک برس تو یہاں تک ہوا کہ شہرت نے آخری وقت میں معذرت کر لی کہ مجلس کا اہتمام ممکن نہیں ہے۔ بہرحال پچھلے محرم پر ہم جمع ہوئے تھے۔ ہم کون۔ بس یہی ڈھائی تین فرد۔ اعجاز حسین بٹالوی' مسعود اشعر اور میں۔ شہرت' کمر خمیدہ' گفتگو میں بے ربطی۔ زمانے کی شکایت جو پہلے بھی تھی مگر اب بہت بڑھ گئی تھی۔

یہ ہماری شہرت سے آخری ملاقات تھی۔

''میرے بھائی جان''

(شہرت بخاری کے بارے میں ان کے بھائی سلیم اقبال سلیم کے ذاتی تاثرات)

سید محمد انور شہرت بخاری' میرے پھوپھی زاد بھائی تھے' وہ عمر میں مجھ سے قریباً چار سال بڑے تھے' اس لئے میں انہیں ''بھائی جان'' کہتا تھا۔ اس دور میں خاندان کے سب افراد تایا' چچا' پھوپھیاں ایک ساتھ رہا کرتے تھے' میں اور بھائی جان مرحوم بھی ایک ہی گھر میں پلے بڑھے......

جب میں نے آنکھ کھولی تو ہم اندرون دہلی دروازہ لاہور میں ''میاں سلطان کی حویلی'' میں رہا کرتے تھے۔ ہم دونوں میں بھائی سے زیادہ دوستی کا رشتہ تھا...... کچھ عرصہ بعد ہمارے بزرگوں نے نئی آبادی ''فاروق گنج'' میں زمین خرید کر دو بڑے مکان بنوائے...... ایک کا نام ''سادات منزل'' اور دوسرے کا نام ''سعدی منزل'' تھا-- یہ دونوں گھر بفضل تعالیٰ اب بھی موجود ہیں' ہمارا بچپن تو حویلی میاں سلطان میں گزرا پھر ''سادات منزل' میں پڑھائی کا سلسلہ شروع ہوا...... اسکول' اور کالج کی تعلیم ہم دونوں نے یہاں ہی مکمل کی۔

بھائی جان بچپن سے ہی صدموں کا شکار رہے' چھوٹے سے تھے تو والدہ فوت ہو گئیں۔ پھر ان کی بڑی بہن اور والد نے ان کی سرپرستی کی' جب بھائی جان کالج میں پڑھتے تھے تو ان کے والد کا بھی انتقال ہو گیا...... یوں وہ محرومی کا شکار رہے' ...... اسی دور میں وہ اپنی بہن آپا قیصر مرحومہ کے پاس ''سعدی منزل'' میں رہنے لگے۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ انہوں نے شعر و شاعری شروع کر دی...... شہرت تخلص رکھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں شہرت سے خوب نوازا...... ابتدا میں بھائی جان احسان دانش مرحوم سے بہت متاثر تھے...... اکثر احسان صاحب کے گھر جاتے اور اپنا کلام سناتے' میں بھی ان کے ہمراہ احسان دانش کے ہاں جایا کرتا تھا۔ بھائی جان کو دیکھا دیکھی مجھے بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا...... کافی غور کے بعد میں نے ساحل تخلص رکھا' کوشش کر کے چند مصرعے کہے' اور بھائی جان کو دکھائے' وہ پڑھ کر ہنسنے لگے اور کہا کہ...... ''یار سلیم یہ شاعری تمہارے بس کا روگ نہیں' اسے معاف کرو...... '' چنانچہ ہم نے بھی عافیت اسی میں سمجھی۔ یہاں میں یہ بتاتا چلوں کہ ہمارے خاندان میں چند قابل

قدر شاعر گزرے ہیں۔ ان میں سعادت یار خان رنگین اور پھر بھائی جان کی نانی اماں مرحومہ اور میری دادی جان مرحومہ کے والد مرزا مائل دہلوی نمایاں ہیں ---- شہرت بخاری مرحوم بھی اسی ادبی سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔

بھائی جان مرحوم ''حلقہ ارباب ذوق'' لاہور کے سیکرٹری تھی' ہر اتوار سہ پہر کو میں اور بھائی جان سائیکل پر سوار .Y.M.C.A ہال جاتے' وہاں حلقہ کی ادبی نشست ہوتی' جلسہ ختم ہونے پر سب شاعر' ادیب ''پاک ٹی ہاؤس'' میں جمع ہوتے اور چائے کا دور چلتا ---- یہ ''نیم ادبی ماحول'' رات آٹھ نو بجے تک جاری رہتا پھر سب برخاست ہو جاتے ---- مجھے یاد ہے ان دنوں حلقہ میں یوسف ظفر' قیوم نظر' ناصر کاظمی' شہرت بخاری' انتظار حسین' انجم رومانی' امجد الطاف' شاد امرتسری اور بہت سے بزرگ ادیب و شاعر تشریف لاتے تھے' ہمارے گھر پر بھی بھائی جان کے پاس ان میں سے بہت سے احباب آتے تھے' اور شعر و شاعری کے ساتھ چائے چلتی تھی

بھائی جان ''سیلف میڈ'' شخصیت کے مالک تھے۔ ابتدا میں ملٹری اکاؤنٹس' اور ریلوے ہیڈ کوارٹرز میں بھی ملازمت کی۔ بعد میں دارالترجمہ پنجاب میں بھی کام کیا' کالج میں لیکچرار رہے اور ''بزم اقبال'' کے چیئر مین بھی رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر طرح سے نوازا اور عزت بخشی۔

پنجاب یونیورسٹی میں پہلی بار ایم اے اردو کی کلاسز کا اجراء ہوا' تو میں نے اور بھائی جان نے اورینٹل کالج لاہور میں ایم اے (اردو) میں داخلہ لیا' ہمارے ہم درسوں میں قیوم نظر' یوسف ظفر اور امجد الطاف تھے بھائی جان امتحان پاس کر کے کالج میں لیکچرار ہو گئے' پھر پروفیسر بن گئے۔ کالج میں ہمارے اساتذہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ' ڈاکٹر ابواللیث صدیقی' پروفیسر وقار عظیم' اور ڈاکٹر عبادت بریلوی شامل تھے' سر عبدالقادر مرحوم' علامہ اقبال پر لیکچر دیتے تھے۔

پھر کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ بھائی جان مع اپنی فیملی کے لندن چلے گئے۔ ان کے بیٹے ہُو علی نے وہاں سے ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا اور آج کل وہ ''کراموبل ہسپتال لندن'' میں ڈاکٹر کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں' چھوٹی بیٹی نے لندن سے law کا امتحان پاس کیا اور وہ آجکل لاہور میں پریکٹس کر رہی ہیں' بڑی بیٹی لاہور ہی میں تدریس کے شعبہ سے منسلک ہیں۔

میں نے 1948ء میں ریڈیو پاکستان میں ملازمت اختیار کر لی اور بحیثیت ڈپٹی کنٹرولر ریٹائر ہوا' آخری سالوں میں' میں ''پاکستان براڈ کاسٹنگ اکیڈمی'' میں وائس پرنسپل تھا۔ اسی دوران یعنی 1965ء میں' حکومت کی طرف سے میں ٹیلی ویژن کی ٹریننگ حاصل کرنے ایک سال کے لئے جرمنی چلا گیا' واپسی پر ''سنٹرل ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ'' چک لالہ میں بحیثیت سینئر انسٹرکٹر سات سال کام کیا۔ ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن کی وجہ سے میری پوسٹنگ اسلام آباد میں رہی' اس طرح لاہور چھوڑنا پڑا۔

بھائی جان کے انتقال سے قریباً دو ماہ قبل میں لاہور ایک شادی میں شرکت کے لئے گیا۔ بھائی جان سے بہت تفصیل سے ملاقات ہوئی ---- پرانے قصے' احباب کے حالات اور میرے بچوں

کے بارے میں دریافت کرتے رہے ...... پھر کہنے لگے۔ ''سلیم تم بھی بے وفا نکلے'' ...... میں نے کہا کیوں بھائی جان کہنے لگے ''یار تم نے لاہور بھی چھوڑ دیا اور مجھے بھی چھوڑ دیا'' ...... میں نے کہا بھائی مجبوری ہے' ملازمت کی وجہ سے اسلام آباد جانا پڑا' پھر وہاں گھر بنا لیا ...... لہٰذا آپ سے دور ہو گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ بھائی جان کے ساتھ یہ میری آخری ملاقات ہو گی!

بھائی جان کے کئی شعری مجموعے شائع ہوئے' ان میں ''شب آئینہ'' اور نثر میں ''کھوئے ہوؤں کی جستجو'' مجھے اس وقت یاد آ رہے ہیں ...... حال ہی میں قریباً دو ماہ قبل وہ جوہر ٹاؤن لاہور میں نیا گھر خرید کر اس میں آباد ہوئے مگر قسمت نے وفا نہ کی ...... بھابھی صاحبہ اور بچے بتا رہے تھے کہ چند ہفتوں سے ان کا بلڈ پریشر گر گیا تھا' جسمانی طور پر بہت کمزور ہو گئے تھے' آخری دنوں میں تیز بخار آتا رہا ...... اس دوران وہ اپنے والدین' بڑی بہن مرحومہ اور مجھے بہت یاد کرتے تھے' بڑے بیٹے علی بُو کو دیکھ کر کہتے ''سلیم تم کب آئے' تم کہاں تھے'' ...... علی بُو کہتے ''ابو جی میں تو آپ کا بیٹا ہوں علی بُو۔ چچا سلیم تو اسلام آباد میں ہیں'' ......

میرے پیارے بھائی جان 11 اکتوبر 2001ء کو صبح 9 بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے ...... اگلے دن جمعہ کو انہیں میانی صاحب لاہور کے آبائی قبرستان میں سپرد خاک کر دیا ...... اتفاق کہ ان کی قبر اپنی والدہ کے پائتین بنی ...... اور ماں کے قدموں میں جگہ پائی ...... انا للہ وانا الیہ راجعون o

کلیات انجم رومانی

عمدہ گیٹ اپ کے ساتھ امپورٹڈ کاغذ پر

مرتب: یاسمین انجم جاوید

صفحات: 528 قیمت: ایک ہزار روپے

ملنے کا پتہ: روداد پبلی کیشنز

•734' سٹریٹ 102' جی نائن فور اسلام آباد

• فکشن ہاؤس 18 مزنگ روڈ لاہور

ملا محمد حسن براہوی

آغا محمد ناصر

بلوچستان میں اردو زبان و ادب کے حوالے سے نائب ملا محمد حسن براہوی کا نام حرف آغاز قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب تک کی تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ آپ کا اردو کلام 1847ء میں ترتیب دیا جا چکا تھا۔ بلوچستان میں نہ صرف اردو شاعری بلکہ اردو زبان کے حوالے سے اولیت کا شرف ملا محمد حسن کو حاصل ہے اور بلوچستان میں اردو شاعری کا پہلا نمونہ آپ کے کلام کے توسط سے ہی ملتا ہے۔

ملا محمد حسن براہوی کی تاریخ پیدائش کے بارے میں کوئی تحریری دستاویز موجود نہیں لیکن ان کی زندگی کے حالات و واقعات کو مدنظر رکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے دادا آغا علی جان بنگلزئی خوانین قلات کے ایک اہم اور بااعتماد مصاحب تھے اور خان قلات میر نصیر خان نوری (1749ء-1817ء) کے ان دوستوں اور ساتھیوں میں سے تھے جنہوں نے قید و بند کی صعوبتوں میں بھی ان کا ساتھ نبھایا اور ان کی حکومت میں بھی ان کے ساتھ رہے۔ خان آف قلات نے آغا علی جان بنگلزئی کی انہی خدمات کی وجہ سے ان کے بیٹے یعنی ملا محمد حسن کے والد نائب میر عبدالرحمٰن کو کچھی کا نائب مقرر کیا۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آغا علی جان بنگلزئی کا خاندان نہ صرف خوانین قلات سے قربت کی وجہ سے اہم تھا بلکہ انتظامی اور علمی لحاظ سے بھی قابل قدر تھا۔ ملا محمد حسن براہوی نے جس معاشرے میں آنکھ کھولی وہ وسطی بلوچستان کا ایک چھوٹا سا علاقہ قلات تھا' جو اپنی جغرافیائی حیثیت کی وجہ سے ایک خاص اہمیت رکھتا تھا' یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے اور افغانستان کو فتح کرنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ صدیوں سے افغانستان اور ایران کے زیر اثر رہنے کی وجہ سے ریاست قلات کی سرکاری' علمی اور ادبی زبان فارسی تھی اور مقامی زبانوں یعنی بلوچی اور براہوی میں پڑھنے لکھنے کی کوئی روایت موجود نہیں تھی۔ بلوچستان کی تاریخ دیکھنے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں مدارس اور تعلیمی ادارے نہ ہونے کے برابر تھے۔ اپنے خاندانی پس منظر کے حوالے سے ملا محمد حسن یقیناً ان خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں گے جو عربی اور فارسی کے علاوہ بلوچی اور اردو بولنے' پڑھنے اور لکھنے پر قدرت رکھتے تھے۔ انہوں نے چار خوانین کو دیکھا اور ان میں سے دو کے ساتھ وزیراعظم کی حیثیت سے کام

کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے انگریزوں کے ساتھ بھی کام کیا۔ ملا محمد حسن براہوی کی انہی خصوصیات نے انہیں خوانین قلات کا منظور نظر بنایا ہوگا اور خان قلات میر محراب خان (1831ء-1839ء) نے انہیں اپنا وزیر اعظم مقرر کیا۔ گل خان نصیر اپنی کتاب ''تاریخ بلوچستان'' میں ملا محمد حسن کو ایک سازشی قرار دیتے ہیں اور ان پر گوناگوں الزامات عائد کرتے ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ملا محمد حسن براہوی نہ صرف خان آف قلات کے وزیر رہے بلکہ وہ ایک عرصے تک انگریزوں کے ساتھ بھی منسلک رہے' خان قلات میر محراب خان کی شہادت میں ملوث ہونے کے الزامات کے باوجود ملا موصوف میر محراب خان کے بیٹے میر نصیر خان دوئم (1840ء-1857ء) کے وزیر بھی رہے اور انگریزوں سے سفارتی تعلقات کے حوالے سے گفت وشنید بھی کرتے رہے۔ انہی سرکاری' درباری سازشوں اور دشمنوں کی کینہ پروری اور بغض وعناد کی وجہ سے بالآخر انہیں قید میں ڈال گیا جہاں وہ دو سال بعد فوت ہوئے۔ ان کے بیٹے میر مولا داد خان نے جو تاریخ وفات کہی اس کے مطابق ملا محمد حسن 5 رمضان المبارک 1272 ہجری میں زہر خورانی کی وجہ سے فوت ہوئے۔

عاقبت زہر ریخت در حلقش — از کف حاسدان کین آور
شد شہید آن امیر شہد کلام — رفت در خلد بر لب کوثر
گفت با آہ و نالہ در کوشش — کہ دو ہفت از غفور ساز بدر

(بنگلزئی' 1973ء' 7)

1286-14=1272ھ

نائب ملا محمد حسن براہوی کو تاریخ میں ایک متنازعہ شخص تو بنا دیا گیا لیکن ان کی صلاحیتوں اور علم و دانش کے وہ بھی معترف ہیں جو ان کو ایک سازشی اور غدار قرار دیتے ہیں۔ تاریخ بلوچستان کے مصنف گل خان نصیر لکھتے ہیں کہ ''ملا محمد حسن بلا کا ذہین' چالاک اور چاپلوس تھا۔ انگریزوں کی طرف سے اشارہ پا کر اس نے دو چار ملاقاتوں میں میر نصیر خان کا دل موہ لیا۔ میر نصیر خان نے زیادہ تر اس خیال سے بھی کہ ملا محمد حسن انگریزوں کے ساتھ وقت گزار چکا ہے' ان کی خو بو اور سیاست سے واقف ہے' انگریزوں کے ساتھ گفت وشنید اور خط و کتابت کرنے میں اس کی صحیح رہنمائی کرے گا اور اس طرح اسے انگریزوں کی خوشنودی حاصل ہو سکے گی اپنے باپ کے قاتل اور بلوچستان کے غدار اعظم کو پھر آغوش میں لے کر اپنا وزیر بنا دیا۔'' (نصیر 1979ء' 180) اس سے زیادہ ان کی قابلیت اور صلاحیتوں کی کیا داد دی جا سکتی ہے۔

ملا محمد حسن براہوی ایک صاحب کمال اور انتہائی ذہین شخص تھے وہ بیک وقت سیاست کی وادیٔ پر خار کے باسی بھی تھے اور علم و دانش سے مالا مال عالم بھی' عربی' فارسی' بلوچی' براہوی اور اردو زبانوں پر دسترس رکھنے والے بھی اور تین زبانوں کے شاعر بھی۔ ان کے فارسی اور بلوچی شاعری کے ہزاروں اشعار اب تک محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر انعام الحق کوثر اپنی کتاب ''بلوچستان میں اردو'' کے صفحہ نمبر 331 پر لکھتے ہیں کہ ''محمد حسن براہوی بیک وقت بلوچی' براہوی' فارسی اور اردو میں شعر گوئی کا ملکہ رکھتے تھے' آپ کے پانچ قلمی دیوان دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں

چارتو فارسی زبان میں ہیں پانچویں قلمی نسخے کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ فارسی میں ہے اور اکتالیس اوراق پر مبنی ہے اس میں صرف مسدس ہے' حصہ اردو کے اوراق اکتیس ہیں اس نسخے کی لوح سنہری ہے ہر ورق پر دوہرا سنہری حاشیہ موجود ہے بعض عنوانات اور مقطعے سرخ روشنائی سے لکھے ہوئے ہیں......مجموعی طور پر قلمی نسخہ دیدہ زیب ہے اردو کے اشعار کی تعداد پانچ سو بائیس ہے دیباچہ فارسی زبان میں رقم کیا گیا ہے۔'' (کوثر' 1986 ' 331)

کلیات محمد حسن براہوی کو 1976ء میں مجلس ترقی ادب لاہور نے پہلی مرتبہ شائع کیا جسے ڈاکٹر انعام الحق کوثر نے مرتب کیا تھا۔ ملا محمد حسن کے اردو کلام میں منقبت' ترجیع بند' مستزاد' مخمس اور رباعیات بھی موجود ہیں۔ ان میں حضرت علیؓ کی شان میں تقریباً ڈیڑھ سو اشعار ہیں۔

ایک ایسے دور میں جب بلوچستان میں مسجدوں کے امام بھی افغانستان سے آتے تھے ملا محمد حسن براہوی جیسی شخصیت کا بلوچستان میں ہونا یقیناً ایک حیرت کی بات ہے۔ تاہم ملا محمد حسن براہوی کی اردو شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے اردو شعراء سے متعارف تھے اور ان کے کلام تک بھی ان کی رسائی تھی' لیکن اردو کے عظیم مراکز سے بہت دور اندرون بلوچستان' جہاں پڑھنا لکھنا تو دور کی بات' اردو بولنے اور سمجھنے والے بھی موجود نہیں تھے' ملا محمد حسن براہوی کی اردو شاعری ایک اچنبھے کی بات ہے۔

تاریخی واقعات کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہے کہ نادر شاہ افشار اور احمد شاہ ابدالی کے ہندوستان پر حملوں کے وقت ریاست قلات کے لشکری ان کی فوج میں موجود تھے اور سندھ سے ملحقہ سرحدات پر اردو زبان و ادب کے اثرات یقیناً پڑے ہوں گے جس کی وجہ سے بلوچستان کے لوگ اردو سے کسی نہ کسی حد تک واقف بھی ہوں گے لیکن بلوچستان کے سیاسی' سماجی اور ثقافتی ماحول میں جہاں صدیوں سے فارسی کی حکمرانی رہی وہاں اردو کی ضرورت تجارتی اور سفارتی مقاصد کے علاوہ شاید ہی کچھ ہو۔ ایسے میں ملا محمد حسن براہوی کی شخصیت ہی ایسی ہو سکتی تھی جو اردو زبان و ادب سے تعلق پیدا کر سکتی۔ البتہ ایسے دور میں جب دہلی میں ولی دکنی کے ریختہ نے میر اور غالب جیسے عظیم شعراء کی غزل کی صورت میں اردو شاعری کو بام عروج پر پہنچا دیا تھا ملا محمد حسن براہوی کی اردو شاعری کا مقابلہ ابتدائی دکنی دور کے شعراء سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ملا محمد حسن براہوی کے کلام کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اردو زبان پر اتنی قدرت نہیں رکھتے تھے جو ہندوستان کے رہنے والوں نے ان سے بہت پہلے حاصل کر لی تھی۔ وہ اردو کو ''زبان ہندی'' کہتے ہیں۔ ان کے کلام میں زبان و بیان کی نہ وہ صفائی و روانی ہے اور نہ وہ شعری معیار و لطافت جو اس دور کے دیگر اہل زبان شعراء کے یہاں عام ہے۔ ملا محمد حسن کے دیوان کو دیکھ کر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انکا ذخیرہ الفاظ محدود ہے اور فارسی زبان پر کامل دسترس رکھنے کے باوجود وہ اردو زبان پر کماحقہ دسترس نہیں رکھتے تھے۔ اپنے دیوان کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ ''چونکہ این حقیر پر تقصیر در الفاظ ہندی مہارت کامل وقوت شامل کما ہو حق نداشتہ' بنا بر امداد الٰہی و طریقہ طبع آزمائی چند غزل معدود در سلک تحریر مشہود ناظرین زراکت و فطانت آئین میسازد امید کہ اگر سہو خطا دراں

مشاہدہ کنند بذیل تصحیح و اصلاح بپوشند۔'' ان کی شاعری کی عمومی موضوعات عشق اور محبوب کی تعریف و توصیف ہیں۔ جسے ہم ''گفتگو کردن بہ زنان'' والی شاعری کہہ سکتے ہیں؛ جس میں محبوب کے خد و خال، قد و قامت اور جفاؤں کا بیان ہے۔ البتہ حضرت علیؓ اور آئمہ اطہار کی شان میں بھی اچھے اشعار ہیں اور دعائیہ شعر بھی ہیں۔ جن کی تعداد ڈیڑھ سو کے قریب ہے۔ ملا محمد حسن کے اشعار میں فارسی کا رنگ غالب ہے اور جب وہ فارسی بحروں میں فارسی شعراء کی زمینوں میں شعر کہتے ہیں تو ان کا معیار کچھ بہتر ہو جاتا ہے۔ مثلاً

مرا گل رو رکھو گلشن میں گامؔ آہستہ آہستہ
کہ زیبا ہے گلستاں میں خرام آہستہ آہستہ
رخ مرے یار کا گلزار ہے سبحان اللہ
لب ترا لعل شکر بار ہے سبحان اللہ
کروں کیا وصف میں جو کیا ہے دلبر
سمن بر ہے سمن بر ہے سمن بر

ملا محمد حسن کی اکثر غزلیں سات سات اور نو نو اشعار پر مشتمل ہیں، ملا موصوف نے ان زمینوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے جن میں کئی مشہور اساتذہ کی غزلیں ہیں اور بعض سنگلاخ زمینوں میں بھی غزلیں ملتی ہیں جیسے

مکھ تیرا دیکھ کر ہوا شمس و قمر خجل
اے لب شکر ترے دو لبوں سیں شکر خجل
کر مکھ سیں دور گیسوئے پر پیچ و تاب کوں
بے تاب کر ز تاب رخ آفتاب کوں

بعض اشعار میں لفظوں کے برمحل استعمال سے خوبصورتی پیدا کی گئی ہے اور قافیے کے ذریعے صوتی تکرار پیدا کر کے ترنم اور نغمگی پیدا کی گئی ہے

تیرے لب پر جس کے لب نے لب رکھا، کہنے لگا
شہد ہے شکر ہے، شیریں ہے، شکر گفتار کا

گلشن میں ترا قد، قد دل جوئی ہے واللہ
گل روئی ہے، گل روئی ہے، گل روئی ہے واللہ

فارسی اور اردو کے علاوہ ان کے یہاں پنجابی کے بہت سے الفاظ جیسے لکایا بمعنی چھپایا، گل بمعنی گلا، چلکنا بمعنی چمکنا، تینوں بمعنی تجھے وغیرہ استعمال ہوئے ہیں۔ ملا محمد حسن نے احادیث بھی اپنے اشعار میں نقل کی ہیں۔ ملا محمد حسن براہوی کے کلام میں تذکیر و تانیث کی پابندی بھی نہیں ملتی اور فنی لحاظ سے بھی ملا محمد حسن کا کلام

نقائص سے پاک نہیں اور بیشتر غزلوں کے مصرعے بے وزن اور اشعار بحر سے خارج ہیں۔ بعض غزلیں قافیے سے بے نیاز اور ساقط الوزن ہیں۔ املا کی غلطیوں نے اشعار کے رہے سہے حسن کو مزید داغدار بنا دیا ہے۔ انہوں نے بلوچی، براہوی الفاظ کا استعمال بھی اپنی اردو شاعری میں نہیں کیا ہے اور نہ ہی مقامی حالات و واقعات اور اشیاء کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے اردو میں اپنے تخلیقی شعور سے کچھ زیادہ کام نہیں لیا ہے لیکن ان تمام نقائص کے باوجود بلوچستان جیسے دور افتادہ اور اردو زبان و ادب کے ثقافتی، علمی اور ادبی مراکز سے دور ملا محمد حسن کی یہ اولین کوشش انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ وہ بلوچستان میں اردو زبان کے پہلے صاحب دیوان شاعر کی حیثیت سے نقش اول ہیں۔

یار کھولا صف گلزار میں چوں بند نقاب
ہو گیا غرق غرق شرم سیں گلشن میں گلاب
دیکھ کر مکھ اسیں گل رنگ کا گلہائے چمن
کہا اوس گل نے کیا صفحہ گلشن کوں خراب
ہات میں جام و دگر ہات میں مینا کوں پکڑ
آ کھڑا مجمع خوباں جو او مست شراب
زلف کا قفل ترا شانے نے جس دم کھولا
آہوئے چین و خطا پارہ کیا نافہ تاب
کرنا اوصاف ترا کس کا جو مقدور نہیں
ذکر کرتا ہے حسن خلق میں از حکم کتاب

ملک خوبی میں رخ ماہ تمام ایسا ہو
باغ میں سرو خراماں کوں خرام ایسا ہو
طوطی اس لب سیں شکر لے کے سخن گو ہویا
آری آری لب شیریں کا کلام ایسا ہو
موئے سیں رو کو چھپایا و چمن میں آیا
پردہ داری رخ خورشید کوں شام ایسا ہو
مے پیا مجلس عشاق میں آیا چل کر
جمع میں شمع بت مست مدام ایسا ہو
سرو باغی نے دکھا قامت و رفتار اس کا

خم کیا قد کہ قد و قامت و گام ایسا ہو
خلق ہر سو سیں پھرا' رو کیا اس کی طرف
پیروی فرض ہے چو پشت امام ایسا ہو
یار اسی دم ز حسن ایں غزل نغز سنا
کہ خوبان لشکر لب کوں غلام ایسا ہو

وفا کروں میں اگر' او جفا' کرے تو کرے
جفا' وفا پہ اگر بے وفا' کرے تو کرے
نقاب کھول کے گلشن میں جب چلا آوے
ہزار بلبل بے دل' نوا کرے تو کرے
دیا چو شانہ کف یار خط مشکیں کوں
بناف نافہ آہو' خطا کرے تو کرے
یہی کرشمہ و ناز و ادا سیں وہ دلبر
بلند گر صف خوباں میں جا کرے تو کرے
یہ قد و قامت و خوبی سیں' در صف گلشن
چمن میں شور قیامت' بپا کرے تو کرے
شکر دیا لب طوطی کوں لب سیں وہ مہرو
سخن کو او لب شیریں ادا کرے تو کرے
حسن کا دل جو ہے مائل بہ حسن گلرویاں
ہمیشہ گل کا ثنا و دعا کرے تو کرے

جب چمن میں وہ یار آتا ہے
گل سیں بوئے بہار آتا ہے
باد اٹھایا جو پردہ اس گل سیں
نالہ صد ہزار آتا ہے
گل خجل ہو کے گلستاں میں کھڑا
گر او گل عذار آتا ہے

دیکھ رفتار اس کا سرو چمن
باغ میں بے وقار آتا ہے
بہر سرو خرام تیرا پری
کبک از کوہسار آتا ہے
تیری پابوسی واسطے جاناں
صف گل شرم سار آتا ہے
بہر وصف صنم ز نطق حسن
صفت بے شمار آتا ہے

رخ مرے یار کا گلزار ہے، سبحان اللہ
لب ترا لعل شکر بار ہے، سبحان اللہ
مکھ ترا آئینہ تمثال چلکتا ایسے
طوطی ہند کو گفتار ہے، سبحان اللہ
دست مشاطہ تری زلف کوں چوں شانہ کرے
کہا یہ تار سیہ مار ہے، سبحان اللہ
تیرے لب بوسہ جو مارا لب ساغر اوپر
مائل اس کا لب ہشیار ہے، سبحان اللہ
تیرے مکھ سیں جو صبا پردہ اٹھایا بہ چمن
شرم سیں چہرہ گل، خار ہے، سبحان اللہ
حسن تیرا نہ حسن دیکھ ہوا حسن پرست
سب حسیں تجھ کو پرستار ہے، سبحان اللہ
پیچ و پیچ خم بہ خم، صد حلقہ زلف یار ہے
قید ہے، تار رسن ہے، رشتہ ہے زنار ہے
یہ کجی تیرے بھوؤں کی دیکھ کر عالم کہا
قوس ہے، مہ ہے، کماں ہے، تیغ جوہر دار ہے
تیرے لب پر جس کے لب نے لب رکھا کہنے لگا
شہد ہے، شکر ہے، شیریں ہے، شکر گفتار ہے

منتظر تیرے قدم کا اے تجن در بوستاں
گل ہے، بلبل ہے، چمن ہے، صفحہ گلزار ہے
نیش مژگاں کو ترے میں اے پری رو کیا کہوں
تیر ہے، نوک سناں ہے، ناوک خونخوار ہے
دے حسن کے ہاتھ میں جو ہے تمہارے ہاتھ میں
جام ہے، مینا ہے، جاناں شیشہ ہے، سرشار ہے

مستزاد ہندی

تجھ مکھ نے کیا غرق عرق اے بت گلرو گل ہائے چمن کو
تجھ زلف کے ہر تار کیا بند، پری رو آہوئے ختن کو
دو لب میں نہاں ہے جو تار تنگ شکر کا اے یار شکر لب
لے کر ترے دو لب سیں لب طوطی خوش گواں وہ لحظہ تخن کو
جب رخ سے ترے باد صبا پردہ اٹھایا تجھ رخ کی جلا دیکھ
پروانہ مرا جمع میں پھر از سر غیرت اس شمع لگن کو
جس قبر کے اوپر جو پڑا تجھ کو گزر گاہ چوں حضرت عیسیٰ
اس مردہ ترے دم سیں اسی دم نکل آیا کر پارہ کفن کو
زنار کیا تار سر زلف تو گل پر ہر مومن و کافر
بے شک تو سر مو کو بسر شانہ تو وا کر صد پیچ و شکن کو
با قد خراماں صف گلشن میں چلا آ اے سرو سہی قد
اس قد قیامت سیں خجل کر بہ سر پا اس سرو سمن کو
میں بندہ ہوں تیرا تو تو مرا ہے جو خداوند خوبی سیں خبر لے
اے خسرو خوباں، کرو اک رات تو خورسند جانانہ حسن کو

کروں کیا وصف میں جو کیا ہے دلبر
سمن بر ہی سمن بر ہے، سمن بر
بپا اس قد و بالا کو کہوں کیا
صنوبر ہے، صنوبر ہے، صنوبر

دو نرگس اس کا جوں جلاد بے رحم
ستمگر ہے، ستمگر ہے، ستمگر

بہ دل بردن دو لب آں غنچہ لب کا
فسوں گر ہی، فسوں گر ہے، فسوں گر

بقتل عاشقاں وہ شوخ سرمست
دلاور ہے، دلاور ہے، دلاور

اسی کے واسطے بلبل چمن میں
نوا گر ہے، نوا گر ہے، نوا گر

جسے تیں دل دیا وہ دلربا کوں
تونگر ہے، تونگر ہے، تونگر

بہ بحر عشق جس نے غوطہ مارا
شناور ہے، شناور ہے، شناور

جلایا عشق کی آتش میں جو جاں
سمندر ہے، سمندر ہے، سمندر

پلایا جس کو مے، محشر تلک او
قلندر ہے، قلندر ہے، قلندر

حسن کا کلبہ اس کے مکھ سیں دیکھو
منور ہے، منور ہے، منور

حوالہ جات

کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، کلیات محمد حسن براہوی، مجلس ترقی ادب لاہور 1976ء
بنگلوئی، میر محمد حسن، گلدستہ قلات، مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان 1973ء
کوثر، ڈاکٹر انعام الحق، بلوچستان میں فارسی شاعری، بلوچی اکیڈی کوئٹہ 1968ء
لالہ رائے بہادر ہتورام، تاریخ بلوچستان، بلوچی اکیڈی کوئٹہ بار سوئم 1987ء
نصیر، میر گل خان، تاریخ بلوچستان، قلات پبلشرز، کوئٹہ بار دوم 1979ء
احمد، ڈاکٹر فاروق، بلوچستان میں اردو زبان و ادب قلات پبلشرز کوئٹہ 1998ء

انور شعور

دکھاوا ہے بس غم گساری نہیں ہے
یہاں ہوشیاری ہے، یاری نہیں ہے

ہوائیں کئی طرح کی چل رہی ہیں
نہیں ہے تو بادِ بہاری نہیں ہے

محبت بڑی چیز ہوتی ہے لیکن
بڑی چیز لوگوں کو پیاری نہیں ہے

کنواں کھود کر جام بھرتے ہیں پیاسے
مئے ناب کی نہر جاری نہیں ہے

کسی در پہ جانے، پہ مجبور ہیں ہم
خوشی سے گوارا یہ خواری نہیں ہے

کوئی پاس ہو تو ہماری ہے دنیا
وہی دور ہو تو ہماری نہیں ہے

ہمیں ناز ہے اپنی گم راہیوں پر
ندامت نہیں، شرمساری نہیں ہے

جو ہم سوچتے ہیں وہی بولتے ہیں
کسی قسم کی رازداری نہیں ہے

نہیں اختیار آج بھی دل پہ تاہم
وہ پہلی سی بے اختیاری نہیں ہے

طبیعت میں ٹھہراؤ سا آ گیا ہے
وہ بے تابی و بے قراری نہیں ہے

یہیں بیٹھے بیٹھے انہیں یاد کر لو
شعورؔ آج کوئی سواری نہیں ہے

٭

انور شعور

دنیاؤں کا ہے سلسلۂ لامتناہی
آخر یہ کہیں جا کے رکے گا بھی الٰہی

اکثر یہی دیکھا ہے رہِ عشق میں ہم نے
دو چار قدم چل کے کھڑے ہو گئے راہی

خورشید نکلنے کے تو آثار نہیں ہیں
اے کاش چلی آئے ادھر بادِ صبا ہی

شاہانہ بھی کٹتی ہے، فقیرانہ بھی لیکن
ناچیز کو زیبا نہ فقیری ہے نہ شاہی

دن رات کسی حسرت و افسوس میں گزرے
خود ایک ساز ہو گئی ناکردہ گناہی

قلعے بھی ہمیشہ نہیں رہتے تہہ افلاک
بام و در و دیوار کی تقدیر، تباہی

محسوس تو ہوتی ہے سنائی نہیں دیتی
کیا طرزِ بیاں ہے تری دزدیدہ نگاہی

کرتے رہے برداشت مروت میں ہمیں وہ
ہم نے بھی شعور ان سے اسی طور نباہی

*

انور شعور

کون و مکاں میں ہم نے تا دور چل کے جانا
مشکل ہے اس قفس سے باہر نکل کے جانا

بے کار ہے تڑپنا، بے سود ہے مچلنا
ہم نے تڑپ کے دیکھا، ہم نے مچل کے جانا

زندہ مثال ہیں ہم مجنوں و کوہ کن کی
تُف ہے، ہمیں بھی تم نے لوگ آج کل کے جانا

سرطان بھی بہانہ، یرقان بھی بہانہ
امراض کو ہمیشہ دھوکے اجل کے جانا

اس زندگی کا مقصد، اس زندگی کا مصرف
جانا دیئے نے لیکن جل کے، پگھل کے جانا

ساتھ اس شکستہ پا کا تم چھوڑ جاؤ لیکن
سنسان راستہ ہے آگے سنبھل کے جانا

اچھا لباس شامل ہوتا ہے شخصیت میں
گھر سے شعور اپنا حلیہ بدل کے جانا

*

انور شعور

اس کے رخسار پھول ہوں گویا
اور پلکیں ببول ہوں گویا

لوگ سنتے ہیں، بھول جاتے ہیں
اچھی باتیں فضول ہوں گویا

بے اصولی ہمیں پسند نہیں
خود بڑے بااصول ہوں گویا

یوں خفا ہیں وہ میرے شعروں پر
وہی شانِ نزول ہوں گویا

اڑتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں
ہم ترے در کی دھول ہوں گویا

یاد ہیں یوں محبتیں اپنی
نوجوانی کی بھول ہوں گویا

ان کے حیلے بہ غور سنتا ہوں
صدقِ دل سے قبول ہوں گویا

دیکھیے تو شعور کی صورت
انتہائی ملول ہوں گویا

٭

انور شعور

ہونے کے باوجود کہاں بات ہوتی ہے
ان سے مشاعروں میں ملاقات ہوتی ہے

پہلے ہم آنسوؤں میں نہاتے تھے اور اب
ہوتی بھی ہے تو نام کی برسات ہوتی ہے

ہم پہ نہیں ہے کوئی توجہ تو کیا ہوا
اس گھر میں ہر کسی کی مدارات ہوتی ہے

ہر طرح کی شراب کا ہے تجربہ ہمیں
یہ چیز واقعی بڑی بدذات ہوتی ہے

معلوم ہے ہماری طلب جس عزیز کو
آتا ہے وہ تو ہاتھ میں سوغات ہوتی ہے

قسمت سے معرکے کا ارادہ ہے، دیکھیے
اب جیت ہوتی ہے کہ ہمیں مات ہوتی ہے

بیٹھے ترستے رہتے ہیں ایک ایک چیز کو
مت پوچھ کس طرح گزر اوقات ہوتی ہے

دو چار لوگ شاعری کرتے ہیں آج کل
ورنہ تو بالعموم خرافات ہوتی ہے

رہتی ہے جستجو ہمیں دن رات کچھ نہ کچھ
کیا زندگی برائے سوالات ہوتی ہے

خوابوں کا کوئی وقت مقرر نہیں شعور
ہوتا ہے دن خراب کبھی رات ہوتی ہے

٭

انور شعور

یہ جعل، یہ فریب، یہ چھل اپنے آپ سے
اے بے عمل یہ طرزِ عمل اپنے آپ سے

ہر وقت اپنے آپ میں رہنا نہیں درست
کچھ دیر کے لئے تو نکل اپنے آپ سے

اوروں سے جیتنا بھی کوئی جیتنا ہوا
اک معرکہ یہ بانگ دہل اپنے آپ سے

اب اس طرف نگاہ نہ جائے گی بھول کر
وعدہ کیا تھا ہم نے اٹل اپنے آپ سے

انسان کیوں زمین پہ بت پوجنے لگا
پوچھے خدائے عز و جل اپنے آپ سے

دل چھوڑ کر گیا ہے کوئی جب سے اے شعورؔ
آباد ہے یہ گھر، یہ محل اپنے آپ سے

٭

انور شعور

شہر میں آج کل کہاں بادہ
اور ہم ہیں اسی کے دل دادہ

رہتی ہے کشمکش سی دونوں میں
ذہن پرکار اور دل سادہ

بولنا چاہتے ہیں سچ لیکن
ہم نہیں خودکشی پہ آمادہ

ہم نے ہر کارواں کا ساتھ دیا
اور پھر ہو گیا الگ جادہ

اے شعورؔ اپنے آپ کو آخر
کیا سمجھتا ہے آدمی زادہ

٭

انور شعور

لگتا ہے مے کدے میں دربارِ عام اپنا
جیسی بھی ہو میسر پینا ہے کام اپنا

مے نوش مر رہے ہیں روز اس قدر کہ ہم بھی
ہر صبح ڈھونڈتے ہیں خبروں میں نام اپنا

اچھا ہے، دن گزاریں پھولوں کی طرح ہنس کر
اس باغ میں رہے گا کب تک قیام اپنا

آتا ہے مے کشوں کو بس اول فول بکنا
کونے میں آ گئے ہیں ہم لے کے جام اپنا

ممکن تھے جو حوادث وہ پیش آ چکے ہیں
افسانہ چاہتا ہے اب اختتام اپنا

اپنے لئے غلامی کرتا ہے دوسروں کی
ہوتا ہے درحقیقت انساں غلام اپنا

آسودگی کے حق میں ہے زہر نصف نوشی
اٹھنا شعور پی کر کوٹا تمام اپنا

٭

انور شعور

جب کوئی ساتھ چھوٹ جاتا ہے
آدمی ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے

دل کہیں واقعی نہیں جاتا
ہر جگہ جھوٹ موٹ جاتا ہے

روز آتا ہے قرض خواہ مرا
آ کے دروازہ کوٹ جاتا ہے

جب بھی کچھ اشک جمع ہوتے ہیں
کوئی آتا ہے، لوٹ جاتا ہے

صاف گوئی صفت نہیں کوئی
ہم سے ہر شخص روٹھ جاتا ہے

اے شعور آدمی نہیں جاتا
بزم میں سوٹ بوٹ جاتا ہے

٭

انور شعورؔ

بہت مسکرائے، بہت روئے ہیں — ہم اپنے میں یوں ہی نہیں کھوئے ہیں
نہیں یاد، اتنی بڑی عمر میں — کسی رات آرام سے سوئے ہیں
انہیں ہم تمنا کہیں یا طلب؟ — خدا جانے وہ تے ہیں یا طوئے ہیں
نجومی سے کیا پوچھنا ہے ہمیں — وہی کھیت کاٹیں گے جو بوئے ہیں
چلا آئے اب محتسب شوق سے — گلاس اور بوتل ابھی دھوئے ہیں

شعورؔ آدمی ناتواں ہے مگر
بڑے بوجھ کم بخت نے ڈھوئے ہیں

٭

انور شعورؔ

زندگی بھر نظر انداز کیا جاتا ہے — بعد میں صاحبِ اعزاز کیا جاتا ہے
دیے جاتے ہیں پسِ مرگ ادیبوں کو مکان — اور اس دین پہ کیا ناز کیا جاتا ہے
کیسی امید و غلط فہمی و خوش فہمی سے — پیار کے کھیل کا آغاز کیا جاتا ہے
کیا اسی طرز تغافل سے کسی کو اے دوست — مونس و محرم و دم ساز کیا جاتا ہے
اس طرح کرتے ہیں دو چاہنے والے باتیں — جس طرح فاش کوئی راز کیا جاتا ہے
آپ ہوتے ہیں نمودار کچھ ایسے جیسے — کوئی جادو، کوئی اعجاز کیا جاتا ہے
ہم سے ملنے کے لئے آئے ہو دنیا والو! — آؤ، دروازۂ دل باز کیا جاتا ہے

شغل ہوتا ہے مئے و جام کا جس شام شعورؔ
اہتمامِ سخن و ساز کیا جاتا ہے

٭

انور شعورؔ

کیسے زباں کھلے کسی امید کے بغیر
افسانہ کیا شروع ہو تمہید کے بغیر

خود کو سدھارنے کا ارادہ تو ہے مگر
مشکل ہے یہ عمل تری تائید کے بغیر

تو رونما نہ ہو تو بصارت سے فائدہ؟
بے کار ہے یہ چیز تری دید کے بغیر

میری زمین سنبل و گل کے بغیر ہے
اور آسمان ہے مہ و خورشید کے بغیر

جاتے ہیں کوہ و دشت کو دیوانے خود بہ خود
فرہاد اور قیس کی تقلید کے بغیر

اب موسمِ بہار نہ آئے گا لوٹ کر
ان سے تعلقات کی تجدید کے بغیر

لیتے نہیں وہ نام ہمارا کبھی شعورؔ
تنقیص و نکتہ چینی و تنقید کے بغیر

٭

انور شعورؔ

آتا ہے کوئی کوئی، بلاتا ہے کوئی کوئی
اتنے تعلقات بڑھاتا ہے کوئی کوئی

ہوتے ہیں دل فریب سبھی خوب رو مگر
تیری طرح حواس پہ چھاتا ہے کوئی کوئی

جام و سبو سے کون پلاتا نہیں بھلا
پیمانۂ نظر سے پلاتا ہے کوئی کوئی

آتے ہیں بے شمار مہینے بہار کے
صحنِ چمن میں پھول کھلاتا ہے کوئی کوئی

ہر شخص دیکھتا ہے مگر بولتا نہیں
احساس کو زبان بناتا ہے کوئی کوئی

دو چار دن ہر ایک نبھاتا ہے اے شعورؔ
لیکن تمام عمر نبھاتا ہے کوئی کوئی

٭

انور شعورؔ

کسی زلزلے کی زد پر ہیں مکیں، مکاں کے نیچے
کوئی چین سے رہا ہے کبھی آسماں کے نیچے؟

ہمہ وقت سو بلائیں مرے سر پہ ناچتی ہیں
میں کھڑا ہوں زندگی میں صفِ دشمناں کے نیچے

یہ زمین یہ ستارے رم و رقص کر رہے ہیں
کسی کہکشاں کے اوپر، کسی کہکشاں کے نیچے

مجھے یاد آ رہے ہیں وہ سب ایک ایک کر کے
جو صنم دبے ہوئے تھے دلِ بے نشاں کے نیچے

یہ ہوا کی رہ گزر ہے، کوئی اور ہم سفر ہے
کرۂ زمیں نہیں ہے مرے کارواں کے نیچے

ہے شعورؔ ابتدا سے یہ غم و الم کا سایہ
مری پرورش ہوئی ہے اسی سائباں کے نیچے

٭

انور شعورؔ

پچھتاؤ نہیں، لغزشِ پا ہو گئی ہو گی
انسان سے ہوتی ہے خطا، ہو گئی ہو گی

اس عالمِ فانی میں بقا کی کوئی صورت
پیدا ہوئی ہو گی تو فنا ہو گئی ہو گی

دانستہ تری یاد سے غافل نہ رہے ہم
بھولے سے کسی روز قضا ہو گئی ہو گی

ہوتا نہیں دل اور کسی بات پہ بے چین
آنے میں اسے دیر ذرا ہو گئی ہو گی

میں رات گئے نیند میں نکلا تھا اکیلا
ہم راہ مرے بادِ صبا ہو گئی ہو گی

وہ آنکھ ادھر آئی بھی ہو گی تو نہ جانے
خوش ہو گئی ہو گی کہ خفا ہو گئی ہو گی

دیکھی تھی شعورؔ ایک ابھرتی ہوئی قامت
اب تک تو نہ معلوم وہ کیا ہو گئی ہو گی

٭

انور شعور

بیٹھے رہے خموش عنادل میں آئے تھے
ہم بے زباں بھی تری محفل میں آئے تھے

کیا صرف گردشوں کے لئے ہم زمین پر
شام و شب و سحر کے سلاسل میں آئے تھے

رہتا ہے اس گلی میں پہنچ کر کہاں خیال
خوش آئے تھے کہ ہم کسی مشکل میں آئے تھے

کچھ واقعے ہوئے تھے اچانک ہمارے ساتھ
کچھ حادثات پیش مراحل میں آئے تھے

ہم نے تڑپ تڑپ کے گزارے تھے ماہ و سال
تب جا کے انبساط کی منزل میں آئے تھے

ہم عرض کر سکے نہ شعور اپنا مسئلہ
الجھے ہوئے وہ اتنے مسائل میں آئے تھے

"نشانِ جگرِ سوختہ!"
(آپ بیتی)

ڈاکٹر سلیم اختر

"دردوداغ":

11مارچ 2001ء

آئینہ جو چہرہ دکھا رہا ہے اس میں اسر کی سوکھی کھیتی میں کپاس ہی کپاس نظر آ رہی ہے، وہ پتلے ہونٹ جو کبھی ترشے لگتے تھے اور ہر طرح کی پیاس بجھانے کو تیار رہتے تھے اب خشک چشمہ کے سوکھے کناروں جیسے ہیں' درشیشوں والی عینک میں سے نظر آنے والی آنکھیں' جو تتلی کی مانند روپ کے پھولوں پر منڈلاتی تھیں اب بے حد چھوٹی اور ادراکِ حسن سے عاری ہونے کی وجہ سے خاصی اجاڑ نظر آتی ہیں' حسن کے بجائے الفاظ کے حسن کی متلاشی آنکھوں نے حیرت سے کھلنا اور افسوس میں بند ہونا فراموش کر دیا ہے' سراب کا منظر پیش کرنے والی آنکھوں میں جب پانی آتا ہے تو اشکِ ندامت کے بجائے اشکِ حسرت ہوتے ہیں (اگر میسر ہوں تو)۔ کتاب کا رسیا کتابی چہرہ لمبائی کی طرف مائل ہے' گالوں پر دو لکیریں نمودار ہو چکی ہیں' بال پیچھے ہٹے تو مزید نمودار ہونے والے ماتھے پر مزید لکیریں۔جن کا باعث تفکر نہیں تفکرات ہیں' خارج کی یہ نشانیاں بدن میں بعض دائمی عوارض کا موجب بنیں جیسے فشارِ خون' گٹھیا اور معدہ کے امراض!

آج میں سرسٹھ برس کا ہو گیا ہوں!

میرا چہرہ اگرچہ عمرِ گزشتہ کی کتاب کی تحریر میں تبدیل نہ ہوا مگر میں خود کو ایک سو سرسٹھ برس کا محسوس کر رہا ہوں' آج سے نہیں بلکہ ہوش سنبھالنے کے بعد ہی سے۔

میں راہِ حیات کے سرسٹھویں موڑ سے مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوں تو سروِ چراغاں کی جگہ جل بجھی شمعوں کا دھواں' گل و گلزار کے برعکس رقصِ وحشت میں محو بگولے' جذباتی نشیب و فراز اور ریگِ رواں کی ہم سفری' لیکن خارج کے برعکس یہ باطنی کیفیات ہیں کہ میں نے درحقیقت باطن ہی میں زیست کی ہے۔ چہرہ شانت مگر من

اشانت۔ میں ابلیس نہیں پھر بھی عام وہی:

سوز و ساز و درد و داغ و جستجوئے آرزو!

فلیش بیک:

قدیم ترین یادیں بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ قدیم ترین تاثرات زیادہ تر مبہم! ریگستان' اونٹ' بیروں کے درخت' خار دار جھاڑیاں' میں اونٹ پر بیٹھا ہچکولے کھاتا' کبھی کبھی کسی درخت کی شاخ سے بچنے کے لئے سر کو نیچے کر لیتا۔

گاؤں- میری والدہ کا گھر' جنازہ اٹھانے کے لئے تابوت' میری والدہ کی نانی کا انتقال ہوا ہے' سب ڈھونڈھ رہے ہیں ''جھیم کہاں گیا' جھیم کہاں گیا''

بالآخر مجھے تابوت میں سے برآمد کیا جاتا ہے' یہاں نہ جانے میں کیوں جا چھپا ہوں۔ عورتیں ہائے ہائے کر رہی ہیں۔ اتنی بڑی بدشگونی' یہ بچہ نہیں بچے گا۔

میں اتنا چھوٹا ہوں کہ پاؤں پر بٹھا کر پیشاب کرایا جا رہا ہے۔ کس کے پاؤں' نہیں معلوم!

گاؤں کی ریت سے اٹی گلی' سامنے سے وہ نائی آ رہا ہے جس نے ختنہ کی تھی- دیکھتے ہی مارے ڈر کے دوڑ لگا دیتا ہوں۔

گاؤں' ریگستان- مجھے کسی نے گھوڑے پر بٹھا رکھا ہے' میں دھڑام سے نیچے آ رہتا ہوں۔

شادی کا گھر- کمرہ عورتوں سے بھرا- ایک عورت کپڑے بدلنے کو ہے' وہ شلوار میں ڈالنے کے لئے ٹانگ اٹھاتی ہے اور میں منہ!

یہ اور اسی طرح کی کچھ اور یادیں' باتیں' تاثرات- زیادہ طرح نامکمل' غیر واضح- عمر کے ابتدائی زمانہ سے متعلق' میں نے بعد میں والدہ سے ان کے بارے میں دریافت کیا تو انہیں تابوت میں چھپنا یاد تھا اس وقت میں لگ بھگ اڑھائی برس کا تھا۔ ختنہ ہونا تو یاد نہیں لیکن اس سے وابستہ خوف یاد ہے بالکل اسی طرح جس طرح فرائیڈ نے سمجھایا ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہیں یہ تو نہیں کہ یہ سب حقیقت کے برعکس میری فینٹیسی ہی ہو لیکن کیوں؟

ایک اور بات جو مجھے یاد نہیں لیکن جس کا ذکر سنا۔

شہر میں یورپین سرکس کا شو تھا۔ ابا جی اور آپا جی سرکس دیکھنے آئے۔ میں گود میں تھا۔ سرکس کی ایک عورت کرتب دکھا رہی تھی کہ مجھ پر اس کی نظر پڑی' میں یقیناً اسی کو دیکھ رہا ہوں گا۔ اپنے ایکٹ کے بعد وہ ابا جی کے پاس آئی' مجھے گود میں لیا اور پیار کرتے ہوئے میرے بارے میں پوچھا۔ پھر اس نے عجیب بات کی' ایسی بات جس کی کسی سرکس گرل سے توقع نہیں' کہنے لگی یہ لڑکا بہت پیارا لگا ہے' تم اسے مجھے دے دو' میں اسے اپنے ساتھ

لے جاؤں گی اور اپنا بیٹا بنا کر رکھوں گی۔ ظاہر ہے میں بکاؤ نہ تھا۔ ابا جی نے سختی سے انکار کیا بلکہ سرکس والا دیکھتے مجھے لے کر وہاں سے بھاگے۔

بڑا ہونے کے بعد جب میں نے سرکس والی کی پیشکش کے بارے میں سنا تو اس نے میرے دن سپنوں میں خاصی رنگ آمیزی کی۔ میں تصور میں خود کو سرکس میں محسوس کرتا۔ میں trapeez پر کرتب دکھا رہا ہوں۔ ہجوم پرجوش تالیوں کی صورت میں داد دے رہا ہے۔ تصور میں مزید گرمی اس وقت پیدا ہو جاتی جب میں خود کو کسی سرکس گرل سے ہم آغوش محسوس کرتا۔ پریشان ہوتا تو گھر والوں پر غصہ آتا کہ مجھے کیوں سنبھال کر رکھا۔ یوں میں مزے کر رہا ہوتا۔ سرکس کا مقبول و معروف فن کار ہوتا وغیرہ وغیرہ۔

تذکرہ:

قاضی عبدالحکیم قریشی پسرور کے کسی گاؤں کے تھے۔ اپنے خاندان کے پہلے گریجویٹ اور وہ بھی اس زمانہ کے جب تعلیم عام نہ تھی۔ میٹرک تک پڑھ لینا ہی کافی ہوتا' جو بی اے کر لیتا نام کے ساتھ بڑے اہتمام سے ساتھ ڈگری لکھتا اور نیم پلیٹ پر نام کے ساتھ ڈگری لکھوانا نہ بھولتا۔

یہ ہمارے دادا تھے اور اس زمانہ کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا بہت اچھا کیریئر رہا۔ قید کئے گئے بعض افغان شہزادوں کے اتالیق رہے۔ بلوچستان میں غالباً پولیٹیکل ایجنٹ رہے اور پھر ملٹری اکاؤنٹس میں آ گئے اور وہیں سے ریٹائر ہو کر سیالکوٹ میں رہے اور انتقال کے بعد وہیں دفن ہوئے۔ عبدالمجید' عبدالحمید' عبدالرشید' حمیدہ' رشیدہ اور زبیدہ — یہ اولادیں تھیں۔

میرے والد عبدالحمید نے میٹرک کے بعد ایم اے جی آفس میں ملازمت کی اور اسی دفتر سے ریٹائر ہوئے۔ دیکھا جائے تو یہ خاندان آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سے کسی نہ کسی ملازمت کی صورت میں منسلک رہا میرے علاوہ سب کی جینز میں AA رہا۔

ابا جی فیروزپور میں تھے' میری والدہ امام بی بی کے والد منشی نور حسن فیروزپور کی تحصیل مکتسر کے گاؤں رتہ تھیڑا میں آباد تھے' کھاتا پیتا خوشحال گھرانہ تھا۔ گاؤں کے سکول کے وہ مدرس تھے اسی لئے منشی کہلاتے تھے۔ یہ راجپوتوں کا خاندان تھا ویسی ہی اکڑی گردن' اونچی ناک' قول و فعل کی صداقت اور دوستی میں جان نثار کرنے والے ویسے ہی راجپوت تھے جن کے بارے میں کہانیاں لکھی جاتی اور فلمیں بنتی ہیں۔

مجھے اپنے نانا یاد ہیں۔ چھ فٹ سے نکلتا قد' لمبے پٹے' ستواں ناک' باریک نقوش اور پاٹ دار آواز۔

امام بی بی کی ماں بچپن میں مر گئی' باپ نے ماں بن کر پالا۔ وہ گاؤں کے ماحول کے لحاظ سے خاصے ایڈوانس ہوں گے کہ بیٹی کو تعلیم دلائی۔ ادھر لاڈ پیار میں پلی بیٹی لڑکی کم اور لڑکا زیادہ تھی۔ لڑکوں کے ساتھ کھیلنا' درختوں پر چڑھ کر پھل توڑنے' کبڈی کھیلنے' کدکڑے لگانے' لڑکوں کی ٹھکائی کرنی۔

ہوش ربا:

والدہ جب بچپن کے واقعات سناتیں تو سن کر قدیم داستانوں جیسا لطف آتا۔ وہ بتاتیں چاندنی رات میں ہم بچے جب کھیل رہے ہوتے تو ہمیں احساس ہوتا کہ بچے بہت زیادہ ہیں۔ بعض انجانے بچے بھی ہوتے جو خوب مزے سے کھیلتے۔ جب ہم کھیل سے فارغ ہوتے تو وہ بچے ہمارے ساتھ نہ ہوتے۔

''وہ کہاں چلے جاتے تھے؟''

''بھئی وہ جنوں کے بچے تھے' ہمارے ساتھ کھیلنے آتے تھے' کھیل کے بعد غائب ہو جاتے۔''

''آپ کو ڈر نہ لگتا؟''

''ڈر کس بات کا؟ بچے تو بچے ہی ہوتے ہیں۔ خواہ جنوں ہی کے کیوں نہ ہوں۔''

والدہ کی باتوں سے یوں محسوس ہوتا گویا اس گاؤں میں انسانوں جتنے ہی جن بھوت اور چھلاوے بھی آباد تھے۔ پراسرار اور پرتحیر واقعات میرے لئے طلسم ہوش ربا سے کم نہ تھے۔ وہ بتاتیں:

میں اناج لینے کے لئے اندھیرے کمرہ میں داخل ہوئی تو ایک بچہ سے جا ٹکرائی۔ میں نے سمجھا کوئی بچہ شرارت کرنے اندر گھس آیا ہے۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑا کہ اچانک وہ غائب!

مجھے ان واقعات میں بہت مزہ آتا اور میں فرمائش کر کر کے ان سے یہ واقعات سنتا۔ والدہ بہت اچھے' موثر اور ڈرامائی انداز میں کہانی سناتی تھیں۔ چنانچہ عام سے واقعات میں بھی وہ ایک مزا پیدا کر دیتیں۔ مجھے سب سے دلچسپ چھلاووں کے واقعات لگتے۔ وہ سناتیں:

تمہارے نانا گھوڑی پر سوار' شہر سے واپس آ رہے تھے۔ شام ہو رہی تھی کہ انہوں نے بڑا ہی خوبصورت میمنا دیکھا۔ انہوں نے اسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا۔ تھوڑی ہی دور گئے تو دیکھا کہ میمنے کی ٹانگیں لٹک کر زمین سے رگڑ کھاتی جا رہی ہیں۔ انہوں نے گھبرا کر میمنے کو نیچے پٹکا اور اور گھوڑی کو ایڑ لگا دی۔ خاصی دور تک قہقہوں نے ان کا تعاقب کیا۔ اس طرح راہ میں ایک خوبصورت عورت ملی جو درحقیقت چڑیل تھی۔

عبرت والا واقعہ بھی یاد آ رہا ہے۔

ایک بڑی زبان دراز اور بدکار عورت کو دفن کرنے کے بعد جیسے ہی لوگ واپس مڑے اس کی قبر سے شعلے بلند ہونے لگے مگر شعلوں سے بلند عورت کی چیخیں تھیں۔

اس طرح کے واقعات سے یوں محسوس ہوتا گویا وہاں کا ہر درخت بھوت بسیرا ہو' ہر گھر جنوں کا مسکن اور ہر بچہ کا سنگی ایک جن بچہ! یہ سب مل جل کر غالباً پر امن بقائے باہمی کے اصول پر زندگی بسر کرتے ہوں گے کیونکہ انہوں نے کبھی جن بھوت کے گزند پہنچانے کی بات نہ کی۔

یہ واقعات میرے تحت الشعور میں محفوظ رہے اور بعد میں جب علمی سطح پر اشیاء اور وقوعات کو سمجھنے کی

کاوشوں کا آغاز ہوا تو میں نے مافوق الفطرت، جادو اور اس سے متعلقہ افعال و اشغال کو انگریزی میں اچھی کتابوں کی مدد سے سمجھنے کی کوشش کی۔ میں زندگی میں فلسفہ، منطق، عقل اور سائنس کا بہت زیادہ قائل ہوں لیکن اب بھی ذہن کا ایک گوشہ ان غیر عقلی باتوں اور غیر منطقی واقعات سے وابستہ تحیر کا اسیر ہے، شاید اس لئے کہ میں نے اندر کے اس بچہ کو جذباتی لحاظ سے پال پوس کر تر و تازہ رکھنے کے لئے اسے پروفیسر نقاد کے سایہ سے بچائے رکھا۔

میں نے پچھل پائیوں، آسیب، روحوں، ویمپائر، کالے جادو یا مافوق الفطرت سے وابستہ خوف پر مبنی بعض ایسے افسانے لکھے، جو جدید افسانوی رجحانات سے لگا نہیں کھاتے تو ان کا باعث یہی ہو سکتا ہے کہ میرا تحت الشعور بچپن کے ان واقعات کے سحر سے آزاد نہ ہو سکا۔ جس شوق سے میں نے فرائیڈ اور یونگ کا مطالعہ کیا اسی رغبت سے برام سٹوکر اور مسز عبدالقادر کو بھی پڑھا۔ کولن ولسن کی ''Occult'' میری پسندیدہ کتابوں میں سے ہے۔

تری تلاش میں:

نوجوانی میں خاصی شوریدہ سری تھی۔ ان دنوں مجھے ایک عجیب خبط تھا کہ مجھ پر کوئی پری عاشق ہو جائے۔ بچوں کو بالعموم دوپہر میں ویرانوں میں پھرنے اور بالخصوص درخت کی جڑ میں پیشاب کرنے سے منع کیا جاتا ہے۔

''جن بھوت ناراض ہو جاتے ہیں۔''

''کیوں؟''

''وہ درختوں پر رہتے ہیں اور جب ان کے گھر پر پیشاب کیا جائے تو انہیں سخت غصہ آتا ہے چنانچہ وہ پیشاب کرنے والے پر سوار ہو جاتے ہیں۔''

یا پھر یہ بتایا جاتا:

''کبھی کبھار پری کسی خوبصورت نوجوان پر عاشق ہو جاتی ہے۔''

''عاشق ہو کر کیا کرتی ہے؟''

''وہ نوجوان کو اپنے ساتھ پرستان لے جاتی ہے۔ سونے کے تخت پر بٹھاتی ہے، طرح طرح کے میوے کھلاتی ہے اور خوب خاطر کرتی ہے۔''

چنانچہ ہم نے بھی پرستان میں جا کر سونے کے تخت پر بیٹھنے کی ٹھانی۔ میں انبالہ شہر سے باہر جا نکلتا اور عین جب کہ سورج سر پر چمک رہا ہوتا بڑے بڑے درخت تلاش کر کے ان کی جڑوں میں دھار مارتا مگر افسوس پری نے تو کیا کسی چڑیل نے بھی توجہ کی نظر سے نہ دیکھا۔ یہ واقعہ ہے تب کا جب آتش بارہ تیرہ برس کا تھا۔

آپا جی!

گاؤں کی سروقد امام بی بی عبدالحمید قریشی سے بیاہ کر فیروزپور میں قاضیوں کے خاندان کی بہو بنی تو نیا نام رضیہ پایا۔ اس زمانہ کے لحاظ سے اعلیٰ نہ سہی مگر تعلیم یافتہ اور بے حد خوبصورت' کانگڑہ سکول کی مصوری میں باریک نقوش والی عورتوں سے مشابہہ' آواز رسیلی' بہت اچھا گا لیتی تھیں۔ حس ملیح اور حس مزاح کی حامل اور ساتھ ہی اضافی خوبی یہ کہ وہ دوسروں کی آواز اور لہجوں کی کامیاب نقل اتار لیتی تھیں۔ لمبی مخروطی انگلیوں والے ہاتھ سفید چمکدار دانت اور کمر سے نیچے جاتے بے حد گھنے بال' والدہ نے انتقال سے پہلے خاصی لمبی بیماریاں جھیلیں مگر سفید ہو جانے کے باوجود آخر وقت تک' بالوں کی لمبائی برقرار رہی۔

صداقت' فیاضی' وفا' ایثار' قربانی' راجپوتوں سے مخصوص یہ کرداری صفات والدہ میں بدرجہ اتم موجود تھیں اسی لئے عمر بھر رشتہ داروں کی ہدف بنی رہیں۔

ہم نے جب آنکھ کھولی تو سب کو انہیں آپا کہتے سنا۔ وہ ایک طرح سے جگت آپا تھیں۔ چنانچہ ہم سب بھائی بہن بھی انہیں آپا جی ہی کہتے تھے اور اب میں انہیں آپا جی ہی لکھوں گا۔

پدرم:

ابا جی بھی وجیہہ انسان تھے۔ میں بچپن میں اپنے دوستوں کے بڑے' بُے بدصورت باپ دیکھتا تو فخر سے سوچتا ابا جی سب کے باپوں سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ ویسے بھی چھوٹے بچے میں حس مبالغہ خاصی فعال ہوتی ہے۔ چنانچہ اسے افراد' اشیاء' اور توقعات لارجر دین لائف نظر آتے ہیں۔ انگریزوں کی عمل داری میں سرکاری ملازمت مشاہرہ اور عزت' ہر دو کے لحاظ سے بہتر تھی۔ ابا جی کو اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑے اور بہترین شوز کا شوق تھا اسی طرح وہ خاصے خوش خوراک بھی تھے۔ ہم بہن بھائیوں نے بچپن ہی میں اچھا کھا اور پی لیا جس کے باعث بعد میں کھانے نے ہمارے لئے کسی طرح کے کمپلیکس کی صورت اختیار نہ کی بلکہ میں تو ابا جی کے بالکل برعکس ہوں کہ مجھے لباس' جوتوں اور کھانے پینے کا کبھی بھی شوق نہ رہا حتیٰ کہ نوجوانی میں بھی۔ جب لڑکا کالج میں ہیرو بن کر جاتا ہے۔

میں باپ بنا تو اندازہ ہوا کہ اچھا باپ بننا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ میں ذاتی طور پر کھانے پلانے کو باپ بننا نہیں سمجھتا' اچھا باپ بننے کا مطلب بیٹے کا اچھا دوست بننا ہے اور ہم سب بہن بھائیوں کے ساتھ ابا جی نے عمر بھی یہی رویہ رکھا۔ دوست بنے' دل دار بنے۔ مشرق کے روایتی باپ نہ بنے۔

ہمارے ہاں ایک ضرب المثل ہے۔ اولاد کو کھلاؤ سونے کا نوالہ مگر نگاہ شیر کی رکھو۔ یہ فراموش کر دیا جاتا ہے کہ سونا ہر عہد ہی میں شرفاء کی پہنچ سے دور رہتا ہے لہٰذا باقی رہ جاتی ہے شیر کی بلکہ شیر شاہ سوری کی آنکھ!

میری پیدائش کے بعد نسیم' شمیم دو بہنیں پھر خالد اور عابد دو بھائی اور پھر آخر میں سب سے چھوٹی بہن روبینہ۔ میں پہلا لہٰذا لاڈلا بچہ تھا۔ گھر پر میرا راج تھا' اس حد تک کہ خالد اور عابد دسویں جماعت کے طالب علم تھے

اور میں ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ بعض دفعہ ہاتھ بھی جھاڑ دیا کرتا تھا۔

ابا جی کے رویہ کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو پھر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اولاد کے بجائے انسان سمجھتے ہوئے ہمیں وہ شخصی آزادی دی جو چوتھی دہائی کے والدین میں بالعموم کم یاب تھی۔ اسی لئے مجھے چھپ کر کچھ بھی کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ اسے اس مثال سے سمجھئے۔ جب ہم راولپنڈی میں تھے تو ہم میٹرک کے کچھ دوستوں نے بڑی شاہ لطیف کے عرس میں جانے کا پروگرام بنایا۔ عرس میں جانا تو بہت اچھی بات ہے اور یقیناً ہر باپ یہ سن کر خوش ہوگا کہ میرا بیٹا عرس شریف پر جا رہا ہے لیکن پانچویں دہائی میں بڑی امام کے عرس پر تمام پاکستان کی نامی گرامی طوائفیں آتی تھیں اور رات بھر مجرا ہوتا تھا۔ اندر کمرہ میں شوقین شراب پیتے ہوئے جوا کھیلتے اور باہر ٹھمکا لگ رہا ہوتا۔

میرے تمام دوستوں نے رات باہر رہنے کے لئے نہایت خوبصورت اور فن کارانہ بہانے تراشے جبکہ میں نے صاف کہا کہ میں بڑی امام کے عرس میں جا رہا ہوں۔ یوں آزادی ملنے کے باعث میں احساسِ گناہ اور اس کے پیدا کردہ احساسِ ندامت سے محفوظ رہا۔

ابا جی' آپا جی اور ہم سب بچے مل کر گپ شپ لگاتے اور دوستانہ قہقہوں سے فضا گونجتی رہتی۔ ایسا ہی خوشگوار گھریلو ماحول شادی کے بعد میں نے اپنے بچوں کو دینے کی کوشش کی۔

میں تضادات سے پُر عجیب بلکہ عجیب و غریب لڑکا تھا۔ مجھے نصاب کی کتابوں سے نفرت تھی مگر میں کتاب خور بھی تھا۔ اسی طرح میں بہت زیادہ پر تجسس تھا۔ ہر وقت سوالات کرتا رہتا اور ابا جی نے ہمیشہ میرے سوالات کے جوابات دے کر شوق تجسس کو برقرار رکھا۔ ابا جی کتابوں کی خرید کے لئے پیسے دیتے۔ بچوں کے کئی رسالوں کا میں سالانہ خریدار تھا اور اس عمر میں (یعنی پانچویں چھٹی جماعت کا زمانہ) جب کہ بچوں کی اکثریت کے لئے نصابی کتب پڑھنا ہی مشکل مہم ہوتی ہے۔

مجھے آج کا تو علم نہیں لیکن اس زمانہ کے والدین بچوں کو غیر نصابی کتابیں پڑھنے سے روکتے تھے۔ وجہ؟ بچہ بدشوق ہو جائے گا' اخلاق خراب ہو جائے گا' فیل ہو جائے گا۔ جبکہ ابا جی کا رویہ اس کے برعکس تھا۔ میرے خیال میں اس کی بنیادی وجہ یہ ہوگی کہ ابا جی خود بھی مطالعہ کے بے حد شوقین تھے۔ لاہور میں تاجور نجیب آبادی اور اختر شیرانی ان کے دوستوں میں تھے' عبدالحمید عدم ان کے رفیق کار تھے اور ان سے گھریلو مراسم رہے۔ انبالہ میں ابن انشاء کے ساتھ دوستی تھی۔

ابا جی نے ہم سب کو یہ آزادی بھی دی کہ ہم نے اپنی مرضی کے مضامین کالج میں لئے۔ خالد نے ایف ایس سی کی اور پھر اس کی بے چین طبیعت اسے باہر لے گئی۔ وہ اس وقت امریکہ میں آباد ہے۔ عابد نے فائن آرٹس میں ڈگری لی۔ پھر جاپان اور پیرس جا کر مصوری میں مزید مہارت حاصل کی۔ ان دنوں وہ بلوچستان یونیورسٹی کے شعبہ فائن آرٹس سے وابستہ ہے۔ اسی طرح میں نے جو پڑھنا چاہا پڑھا!

جب میں نے ایف اے میں نفسیات کا مطالعہ شروع کیا تو ایڈی پس کمپلیکس کے لحاظ سے ابا جی میں خامیاں تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے اس وقت خاصی کوفت ہوئی جب انہیں ہر لحاظ سے بہت اچھا باپ پایا۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں اگر ابا جی روایتی باپ ہوتے۔ ادھر وہ جابر ادھر میں ضدی۔ یوں شخصیتوں کے ٹکراؤ سے میں کتنی ہی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو سکتا تھا لیکن اس کے باوجود میں ان کی شخصیت کے رنگ میں رنگے جانے کے کئی امور میں ان کے برعکس ثابت ہوا۔ مثلاً وہ بے حد خوش لباس اور خوش خوراک تھے۔ اسی طرح نفیس جوتے پہننے کا بھی شوق تھا۔ جب کہ میں قطعی طور پر برعکس ہوں' نہ کھانے پینے سے دلچسپی' نہ لباس اور جوتوں کا شوق' دلچسپ امر یہ ہے کہ جودت میرے برعکس ہے۔ اس معاملہ میں وہ صحیح معنوں میں اپنے دادا کا پوتا ہے۔

کھانے کے معاملہ میں میری کوئی خاص حسِ ذائقہ نہیں۔ اچھا برا' ٹھنڈا گرم باسی' بدمزہ ہر طرح کا کھانا خاموشی سے کھا لیتا ہوں۔ سعیدہ اگر کپڑوں کا دھیان نہ رکھتی تو میں شاید چاک گریباں نظر آتا۔

ایک مرتبہ دوستوں میں بحث ہو رہی تھی کہ نئی صدی میں کیسے داخل ہوا جائے۔ میں نے کہا میں تو ان ہی پرانے جوتوں کے ساتھ نئی صدی میں داخل ہو جاؤں گا۔

باپ بیٹے کے نفسیاتی رابطہ کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ بیٹا باپ سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا رہتا ہے مگر بھاگ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تو باپ ہی کے جوتے پہن کر بھاگ رہا ہے اور مزید کوفت اس وقت ہوتی ہے جب یہ انکشاف ہوتا ہے کہ اس نے تو پاؤں میں جوتے بھی غلط پہن رکھے ہیں۔

برج حوت:

برج حوت کی علامت مخالف سمت میں جاتی دو مچھلیاں ہیں۔ حوت کا لغوی مطلب بھی مچھلی ہی ہے۔ مچھلیوں کی رعایت سے اس برج کا بنیادی عنصر پانی اور حاکم سیارہ نیپچون ہے۔ 5 اور 8 خوش بخت عدد ہیں' ہر قسم کا ارغوانی رنگ موافق ہے اور جمعہ سعد ہے۔ ارغوانی رنگ کی مناسبت سے لال رنگ کی دھاریوں والے قیمتی پتھر موافق آتے ہیں۔

بارہویں برج حوت کے زیر اثر افراد (تاریخ پیدائش 20 فروری تا 20 مارچ) وجدان کے حامل' خواب دیکھنے والے شاعر' ادیب اور فنون لطیفہ سے دلچسپی رکھنے والے تخلیقی فن کار ہوتے ہیں' مخفی علوم سے بھی شغف ہوتا ہے۔ بے حد حساس ہوتے ہیں' یہی نہیں بلکہ خود کو پس پردہ رکھ کر دوسروں کی مدد کرنے والے' یاروں کے یار' وفادار' محبت میں ثابت قدم!

''Pisces : 2001'' میں سڈنی اومر 11 مارچ کو پیدا ہونے والے افراد کی شخصیت کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ افراد وجدانی رجحانات کے ساتھ ساتھ ترقی پسندانہ رویوں کے بھی حامل ہوتے ہیں۔ زمانہ کے ساتھ ہم آہنگی کی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ذاتی زندگی کو خوابوں سے پرسکون بناتے ہیں' زمانہ کی تیزی سے

نالاں رہتے ہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف تیز اور چالاک افراد ہی دنیا میں کامران رہتے ہیں۔ منصوبہ سازی کرتے ہیں مگر زیادہ تر تصورات ہی میں اسی لئے دن سپنوں کے رسیا ہوتے ہیں۔ مجھے اس سے سو فی صد اتفاق ہے کیونکہ مجھے تو یہ سیلف پورٹریٹ محسوس ہوتا ہے۔

علم الاعداد کی رو سے سلیم اختر کا پہلا حرف سیارہ یورینس کے اثرات ظاہر کرتا ہے۔ برج حوت کے زیر اثر پیدائش کی وجہ سے سیارہ نیپچون اور عدد 7 ہے۔ نام کے حروف کا شمار (5 + 4) 9 بنتا ہے۔ جس کا تعلق مریخ سے ہے۔ علم الاعداد کے بموجب میں متنوع اور متضاد خصوصیات کا حامل ہوں۔ نام کا عدد 9 گرم مزاجی اور انا کا مظہر ہے۔ 7 کی آبی اور 9 کی آتشی خصوصیات باہم مل کر جس شخصیت کی تشکیل کرتی ہیں وہ متضاد صفات کی حامل ہے وہی بات: ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں!

عمر زمان نے میرے زائچہ کی بنا پر یہ لکھا:

''...... اس طرح متنوع خصوصیات کی حامل ایک شخصیت سامنے آتی ہے جو مختلف سیاروں کے مثبت و منفی اثرات کے تضاد میں اپنی پہچان بنانے کی کوشش میں ہے۔ متعلقہ اعداد 7،5 اور 9 سلیم اختر کو پیدائشی نقاد ظاہر کرتے ہیں' پیدائشی سیارے کا عدد سات ڈاکٹر سلیم اختر کی رازدارانہ طبیعت' موسیقی اور سیاحت سے دلچسپی کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ انہیں پراسرار علوم سے بھی دلچسپی ہو سکتی ہے...... نام کا مجموعی عدد 9 انتہا درجہ کی انا پسندی اور آتشی مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ سلیم اختر کی طبیعت میں اور متضاد خصوصیات عدد 7 کی آبی تاثیر اور عدد 9 کی آتشی تاثیر جمع ہو کر انہیں ہر قسم کے ماحول میں ڈھل جانے اور ہر محفل میں مقبول ہو جانے کی صلاحیت بھی عطا کرتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں ایک مشکل شخصیت بھی بناتی ہیں' جس کے قریبی لوگوں سے تعلقات میں اکثر گڑ بڑ رہتی ہوگی' یہ دونوں اعداد ان کے جنسی رجحان کی نمائندگی بھی کرتے ہیں۔ اعداد کی روشنی میں ڈاکٹر سلیم اختر ایک زندہ دل' خوش مزاج اور باصلاحیت قلم کار کے طور پر سامنے آتے ہیں جس میں بہترین نقاد ہونے کے لئے تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ تصویر کے دونوں رخ دیکھ کر فیصلہ کرتے ہیں' کبھی کبھی بہت اعلیٰ ظرفی اور بعض اوقات بہت تنگ دلی کا مظاہرہ بھی کر جاتے ہوں گے' سنی سنائی بات پر یقین کرنے کی بجائے خود تجربہ کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بنیادی طور پر شریف النفس انسان ہیں۔ بعض اوقات غیر متوقع طور پر ارد گرد کے لوگوں سے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ عدد نو اور سات کے منفی اثرات میں شکی مزاج ہونا بھی شامل ہے۔ علم و فن سے دلچسپی نے ان کی طبیعت میں وسعت پیدا کی ہے اور مزاج کی بعض خامیوں پر قابو پانے میں کامیاب رہے ہیں' مستقل مزاجی ان کی شخصیت کا حصہ ہے' کسی بھی قسم کی صورت حال میں وقتی طور پر پریشان ہو سکتے ہیں لیکن گھبراتے نہیں اور ہمیشہ پرامید رہتے ہیں۔''

اپنا تو یہی عالم رہا:

ایک سب آگ ایک سب پانی

"9"

علم الاعداد فیثا غورث جتنا قدیم ہے۔ عہد عتیق کے اس حکیم کو اعداد سے بہت دلچسپی تھی' وہ ان میں اسرار اور الوہیت دیکھتا تھا۔ اس لئے وہ انسانی شخصیت کی تشکیل میں اعداد کی کارفرمائیوں کا قائل تھا۔ فیثا غورث تمام اعداد کے مقابلہ میں 9 کی پراسراریت اور اہمیت کا بے حد قائل تھا۔

3 کو 3 سے ضرب دے کر حاصل ہونے والے 9 کا مطالعہ اس لحاظ سے بہت دلچسپ ہے کہ اسے کسی بھی عدد سے ضرب دے لیں' ٹوٹل ہمیشہ 9 ہی رہتا ہے۔ دراصل 3 بذات خود اساطیری اہمیت کا حامل ہے۔ ہندوؤں میں ترشول اور ترمورتی' عیسائیوں میں تثلیث' عورت کی قدیم علامت ▽ اور مرد کا سمبل △ بھی تین زاویوں سے تشکیل پاتا ہے۔ یہودیوں نے ان ہی دونوں مثلثوں کو ملا کر ستارۂ داؤد ✡ بنایا جو ان کی مقدس علامت ہے۔ یہی اسرائیل کے پرچم پر ہے۔ قدیم زمانہ میں دو مثلثوں کا ملاپ دراصل نر ناری کے جنسی ملاپ کی علامت تھی۔ اس لحاظ سے 3 کی 3 گنا طاقت سے حاصل ہونے والا 9 اعداد کی محفل میں منفرد اور ممتاز نظر آتا ہے اور اسی 9 کا مجھ پر اثر رہا۔

9 کی مانند 7 بھی اہمیت کا حامل ہے۔ سات آسمان' سات طبقات ارض' سات سمندر' آسمان پر سات سہیلیوں کا اجتماع یعنی بنات النعش - دوزخ اور بہشت کے سات درجات-حتیٰ کہ آج کا 007- اور یہی 7 میرا عدد بنتا ہے۔ عمر بھر ان کی متضاد خصوصیات کے باعث اگر یہ عام رہا:

Poor Brutus always at war with himself!

تو باعث تعجب نہ ہونا چاہئے۔ ہاں! یقیناً یہ باعثِ تعجب ہونا چاہئے کہ میں نے بڑی کامیابی سے دنیا والوں سے داخلی کشمکش چھپا رکھی اور میرا اشانت چہرہ ہر طرح کی پردہ پوشی کرتا رہا۔ میں کیا کچھ تھا لوگوں نے نہ جانا' میں کیا نہ تھا لوگوں نے یہ مانا۔

معاف کیجئے! میں اعداد کے چکر میں کچھ زیادہ ہی دور نکل گیا' لہٰذا قلم کے ناقہ بے زمام کو واپس بچپن کی طرف لاتا ہوں۔

میرا بچپن متوسط گھرانے کے عام بچوں سے کوئی خاص مختلف نہ تھا۔ انگریزوں کے زمانہ میں سرکاری دفتر کا بابو خوشحال بھی ہوتا تھا اور عزت دار بھی۔ عہد غلامی تھا مگر آزادی کے مقابلہ میں معاشرہ کہیں زیادہ صاف ستھرا۔

شگافِ در سے:

میری باقاعدہ یادیں 1939ء سے شروع ہوتی ہیں۔ اس زمانہ میں ہم فلیمنگ روڈ کی ایک بند گلی کے آخری مکان میں رہتے تھے۔ اس سے اگلی گلی ٹھنڈی کھوئی والی گلی کہلاتی تھی اور تھوڑا آگے جا کر سبزی منڈی آ جاتی تھی۔ ایک طرف قلعہ گوجر سنگھ کا چوک اور دوسری جانب حضرت شاہ ابوالعلی کا مزار۔

اسی گلی میں تاجور نجیب آبادی کے رسالہ ''شاہکار'' کا دفتر تھا ان کا ایک بیٹا عرشی میرا ہم عمر اور دوست تھا۔ یہیں اختر شیرانی بھی بیٹھتے تھے اور ابا جی بھی۔ یہ مجھے اس لئے یاد ہے کہ کئی مرتبہ آپا جی نے وہاں سے ابا جی کو بلوانے کے لئے مجھے اس دفتر میں بھیجا۔ اسی طرح وہاں ایک نائی کی دوکان پر بھی بعض اوقات یہ لوگ بیٹھتے۔ میں ایک مرتبہ ابا جی کو نائی کی دکان سے بلانے کے لئے آیا تو اختر شیرانی کہہ رہے تھے:

مرتے ہیں جس سلمیٰ پہ وہ سلمیٰ ہی اور ہے

میں نہیں جانتا یہ مصرعہ کیوں میرے ذہن میں اٹک گیا حالانکہ نہ میں مرنے کا مطلب سمجھتا تھا اور نہ ہی سلمیٰ کا!

اس دور کی بہت سی باتیں واضح طور پر ذہن میں ہیں۔ جیسے مجھے کسی کے گھر کی سیڑھیوں پر سے اکنی مل گئی' گھر جا کر آپا جی کو خوشی خوشی دکھائی تو انہوں نے سمجھایا کہ یوں کسی کے گرے ہوئے پیسے نہ اٹھانے چاہئیں میں جاؤں اور وہیں پر رکھ کر آؤں جہاں سے اکنی اٹھائی تھی۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

میں نے پڑوسن کو جا کر کوئی ایسی بات کہہ دی' جو خاصی نازیبا تھی۔ چنانچہ ابا جی نے ٹھیک ٹھیک پھینٹی لگائی۔

ایک لڑکی مجھے سیڑھیوں کے نیچے بننے والی تکون میں لئے بیٹھی ہے۔۔ ''یہ دیکھو۔''

ہم عمر لڑکی نہایت ہی فضول سی شے دکھا رہی ہے۔

''یہ کیا ہے؟''

''تمہیں نہیں پتہ۔''

''نہیں!''

''۔۔۔ میرے ماں باپ کرتے ہیں۔۔۔۔''

جو وہ سمجھاتی ہے' میرے پلے نہیں پڑتا۔ میں چٹکی بھر ریت ڈال دیتا ہوں۔

میں سکول کے ساتھ چڑیا گھر گیا' مگر سب سے بچھڑ کر راستہ بھول گیا' اور پھر دھکے کھاتا نہ جانے کیسے خود بخود گھر پہنچ جاتا ہوں مگر پہلی سیڑھی پر قدم رکھ کر آپا جی پکارتا ہوں اور پھر بے ہوش ہو جاتا ہوں۔

بازار سے دودھ لاتا ہوں لیکن راستہ میں دودھ گرا دیتا ہوں اور پھر سیڑھیوں میں کھڑا روتا رہتا ہوں کہ دودھ گرا دینے پر پٹائی ہو جائے گی۔

نسیم سے میری لڑائی ہوئی ہے' میں چھوٹی قینچی سے اسے زخمی کر دیتا ہوں اور پھر روتا ہوں کہ اب کیا ہو

گا' مجھے سزا ملے گی' قینچی کی صرف نوک چبھی تھی زخم نہ تھا لیکن میں ہراساں تھا۔

اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو ہماری گلی اور ٹھنڈی کھوئی والی گلی کے درمیان خالی قطعہ پر قبریں تھیں۔ میں ان قبروں پر نظریں جمائے بیٹھا رہتا' میں سوچتا مرنے کے بعد یہ سب اللہ میاں کے پاس چلے گئے' اللہ میاں کیسے ہوں گے۔ لمبا قد' گورا رنگ اور لمبی سفید داڑھی-اس سے زیادہ کی میرے کمزور تخیل میں سکت نہ تھی۔

خوب بارش ہوتی ہے۔ گلی میں پانی کھڑا ہے۔ سب بچوں کے ساتھ مل کر میں بھی اس پانی میں نہاتا ہوں۔ گھر آیا تو ڈانٹ پڑی۔ گندے پانی میں نہانے سے بیمار ہو جاؤ گے۔ اس کے بعد گلی میں جا کر بارش میں نہانے کی حسرت ہی رہی-اب تک!

ابا جی گھر میں ایک رسالہ لاتے ہیں۔ یہ بچوں کا پرچہ ہے۔ نام تو یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ سرورق پر ایک جھنڈے کے گرد بچوں کا دائرہ بنا تھا۔ ادب سے یہ میری اولین شناسائی تھی۔

میرے چچا عبدالرشید کوٹھے پر پتنگ اڑا رہے ہیں۔ میں ڈور کا پنا پکڑے کھڑا ہوں۔ خود بھی گھر والوں کی آنکھ بچا کر گڈیاں اڑا رہا ہوں۔

میں ابا جی اور آپا جی کے ساتھ سینما ہال میں ہوں۔ فلم کا نام تو یاد نہیں' لیکن یہ یاد ہے کہ فلم میں دروازے کھلتے اور بند ہوتے ہیں' سفید لباس میں ایک روح ہے' جوان دروازوں میں سے گزر رہی ہے' ساتھ ایک نوجوان ہے' وہ روح اسے کچھ سمجھا رہی ہے۔ میں سخت خوفزدہ ہوں۔ شاید ڈر کے مارے روتا بھی ہوں۔

''نیلی فراک''

پہلا اور لاڈلا بچہ تھا اس لئے کسی ایسے ویسے سکول میں کیسے داخل کرایا جاتا۔ چنانچہ مجھے انگریزی سکول میں داخل کرایا جاتا ہے۔ اگر میں نام میں غلطی نہیں کر رہا تو اس کا نام سٹینڈرڈ سٹی ہائی سکول تھا اور یہ میکلوڈ روڈ پر تھا۔

کلاس میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے بیٹھتے تھے۔ اودے اودے' نیلے نیلے' پیلے پیلے ربنوں والی لڑکیاں اور نیکروں میں لڑکے۔ لڑکے کیا' احمق! جنہیں ساتھ بیٹھنے والی لڑکی کی افادیت کا اندازہ نہ تھا۔ اس ضمن میں کوئی خاص تاثرات میرے ذہن میں نہیں ہیں۔ کیا میری کسی لڑکے یا لڑکی سے کوئی خاص دوستی تھی؟ - غالباً نہیں! ہاں! یہ یاد ہے کہ ایک ہندو لڑکے کا گھر سکول کے سامنے گلی میں ہے' وہ مجھے اپنے گھر لے جاتا ہے' ایک معمر عورت ہمیں دودھ پلاتی ہے۔

میں خاصا نالائق طالب علم ثابت ہوتا ہوں۔ نہ انگریزی آتی ہے نہ ریاضی۔ مسّوں سے ڈانٹ کھاتا رہتا ہوں۔ ساتھ بیٹھنے والی لڑکی سے لڑتا رہتا ہوں۔ اس کے کپڑوں پر روشنائی پھینک دیتا ہوں۔

اسی سکول میں میں نے وہ پہلی لڑکی دیکھی جو مجھے اچھی لگی' یہ میں آج سمجھتا ہوں کہ وہ مجھے اچھی لگی'

اس عمر میں تو اچھی لگنے کا مطلب بھی معلوم نہ تھا۔ وہ میری کلاس فیلو نہ تھی' جوان لڑکی تھی۔ میں آج بھی آنکھیں بند کروں تو اس کا نیلا فراک اور سینہ سے لگائی کتابیں دیکھ سکتا ہوں۔ اس سے بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا' کہ میں محض ''چھوٹا'' تھا۔ بس اسے دیکھتا اور خوش ہوتا۔ اس کی وجہ سے مجھے نیلا رنگ پسند رہا اور مدتوں تک عیسائی لڑکیوں کے بارے میں عجب طرح کی fixation رہی۔ میرے ابتدائی دور کے بیشتر افسانے عیسائی لڑکیوں کے بارے میں تھے۔ یہ اسی fixation کی وجہ سے تھا۔ کالج کے زمانہ میں ایک عیسائی لڑکی کے چکر میں بھی رہا۔ لیکن یہ الگ قصہ ہے!

بچھو! کونین!!

1939ء میں عالمی جنگ شروع ہو چکی تھی لیکن بچوں کا اس جنگ سے کیا تعلق؟ ابا جی ملٹری اکاؤنٹس میں تھے سو اگلے برس یعنی 1940ء میں انہیں مڈل ایسٹ بھیج دیا گیا اور ہم اپنی پھوپھی رشیدہ کے پاس فورٹ سنڈیمن میں رہنے کے لئے آ گئے۔ پھوپھا MES میں تھے اور ان دنوں وہاں تعینات تھے۔ باپ دور تھا ماں کا لاڈلا' پڑھتا کیسے' سارا سال آوارہ گردی میں گزرا۔

اس زمانہ کا فورٹ سنڈیمن بلوچستان کا چھوٹا سا قصبہ تھا' انگریزی عمل داری کی آخری حد' اس کے بعد آزاد علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔

وہاں کی صرف ایک یاد محفوظ ہے' بصورت بچھو! سیاہ رنگ کے خاصے لمبے بچھو' اتنے عام کہ شریر لڑکے انہیں پکڑ کر دھاگے میں باندھ کر ایک دوسرے کو ڈرایا کرتے۔ ہفتہ میں' ایک آدھ بچھو مار لینا گویا معمولات میں شامل تھا۔ آپا جی نے پہننے سے پہلے جوتی اٹھائی تو اندر سے بچھو نکل آیا۔ میں دیوار کے ساتھ کھڑا دھار مار رہا تھا۔ اوپر نگاہ کی تو سیاہ بچھو زہر بھری مالا اٹھائے چلتا نظر آیا۔ میں بچھو بچھو چلاتا بھاگا۔

دوسری یاد ملیریا کی ہے۔ شدید کپکپی سے بخار چڑھتا اور کونین کی سرخ کڑوی دوا پینی پڑتی۔ میں نے اتنی کونین پی' اتنی کونین پی' کہ کڑواہٹ کے تلخ ذائقہ کا احساس ہی ختم ہو گیا' کونین غٹاغٹ پی جاتا۔ منہ کی کڑواہٹ دور کرنے کو نہ چینی لیتا نہ نمک۔

یہ وہ ابتدائی ''ٹریننگ'' تھی جو اب کام آ رہی ہے۔ یعنی نہ بچھو صفت لوگوں سے ڈر لگتا ہے اور نہ ہی گالیوں کی کڑواہٹ محسوس ہوتی ہے۔

ہاں! یاد آیا' فورٹ سنڈیمن ہی میں میں نے پہلا کیمرہ خریدا' یہ کوڈک کا باکس کیمرہ تھا' قیمت صرف دس روپے' اب تو قیمت سن کر ہنسی آتی ہے مگر اس زمانہ میں دس روپے خاصی معقول رقم تھی۔

میں دن بھر لڑکوں کے ساتھ' پہاڑیوں پر کھیلتا رہتا' کوئی روک ٹوک نہ تھی' اول تو لاہور ہی میں کوئی ایسا عالم فاضل نہ تھا مگر سال بھر کی خالص آوارہ گردی نے تو بالکل ہی چوپٹ کر دیا۔ ہاں! فوٹوگرافی خوب کی' اب

سوچتا ہوں کیا پدی کا شوربہ اور کیا اس کی فوٹوگرافی۔ اتفاق سے اس زمانہ کی اتاری ہوئی تصاویر میں سے ایک آدھ محفوظ رہ گئی ہیں۔

مجھے فوٹوگرافی کا مدتوں شوق رہا۔ آؤٹ ڈور مناظر اور چہروں کے کلوز اپ۔ یہ خاص دلچسپی تھی میری!

معلوم نہیں آج کل کا فورٹ سنڈے مین کیسا ہے اس زمانہ میں تو ہر طرف انگوروں کی بیلیں نظر آتیں' لڑکے سارا دن ان بیلوں پر چھاپے مارتے اور جھولیاں بھر بھر انگور کھاتے۔ دراصل چوری چوری انگور توڑنا کھانے کے لئے کم ہوتا۔ یہ ایک طرح کا کھیل بلکہ ایڈونچر تھی۔ انگور کھٹے ہوتے تو پھینک دیتے مگر انگور کی بیلوں پر دھاوا مارنے سے باز نہ آتے۔

ایک سال بعد اگست 1941ء میں ابا جی مڈل ایسٹ سے واپس آئے تو ان کی پوسٹنگ پونا میں ہوئی۔ کچھ عرصہ ہم زبیدہ پھوپھی کے ہاں بمبئی میں مقیم رہے۔ غالباً بھنڈی بازار کے قریب فلیٹ تھا۔ یہاں ابا جی کا جے جے ہسپتال میں ہرنیا کا پہلا آپریشن ہوا۔ ہسپتال کا نام اس لئے یاد ہے کہ ابا جی کو کھانا دینے میں ہی جاتا تھا۔

ٹھیک ہو جانے کے بعد ایک دن ابا جی نے سارے دن کے لئے ٹیکسی لی اور تمام بمبئی کی سیر کرائی۔

بمبئی میں بھی میں آزاد پھرتا رہا۔ کئی ماہ بعد ابا جی نے پونے میں رہائش کا بندوبست کیا اور ہم بمبئی سے چلنے والی ٹرین ''دکن کوئین'' سے پونے وارد ہوئے۔

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا!

1942ء کا پونے صحیح معنوں میں Exotic شہر تھا۔ ہم وہاں کیمپ (چھاؤنی) میں رہتے تھے۔ سڑک کا نام تو یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ اس سڑک پر ''رین بوناکی'' نام کا ایک سینما تھا' ایک اور سینما ''دل خوش ناکی'' کا نام بھی یاد آ رہا ہے۔ آج کے برعکس اس زمانہ میں سینما کے نام کے ساتھ ''ناکی'' کا یہ مطلب ہوتا کہ یہاں ناطق فلم دکھائی جاتی ہے۔ (یاد رہے کہ 1931ء میں پہلی ناطق فلم ''عالم آرا'' ریلیز ہوئی تھی)۔

رین بوناکی کے سامنے والی سڑک پر ''بھگوان داس چال'' تھی۔ ایک ہی شخص کی ملکیت اس بندگلی میں داخل ہونے پر بائیں ہاتھ کی جانب' دوسرا مکان ہمارا تھا۔

اب میں یاد کرتا ہوں تو اس چال میں مختلف مذاہب کے لوگ یعنی ہندو' سکھ' عیسائی اور مسلم بھی آباد تھے۔ سب کا آپس میں میل جول اور کھانا پینا تھا۔ ہمارے دائیں جانب مکان میں میری عمر کے بچے تھے لیکن عجیب بات کہ کسی کے ہاتھ کی انگلیاں پانچ نہ تھیں یا چار یا پھر چھ۔ ہم انہیں ''چونگے'' اور ''چھنگے'' کہتے تھے۔

سامنے سکھ آباد تھا جس نے ایک ''دھیڑنی'' (مقامی مربہنہ عورت) رکھی تھی' جس کی بعض اوقات رات کو ٹھکائی بھی ہوتی' ان کے ساتھ عیسائی کنبہ تھا۔ ان کا ایک آدمی مر گیا تو ہم بچے بھی ان کے گرجا گھسے' نعش کی آنکھوں پر دو سکے رکھے تھے' سرہانے دو موم بتیاں روشن تھیں۔ تھوڑا آگے ہمارے سکول کے ہیڈ ماسٹر کا گھر تھا۔

ان کی عورتوں کا ہمارے گھر آنا جانا تھا۔ ہیڈ ماسٹر کی جوان بیٹی مجھے بہت اچھی لگتی تھی جبکہ میں اس کے لئے محض شاگرد بچہ تھا۔ گھر کے ساتھ والے مکان میں کئی جوان لڑکیاں تھیں' جن میں سے ایک ہر وقت بآ واز بلند انا للہ وانا الیہ راجعون کا الاپ کرتی رہتی۔ نہ جانے کیوں؟ ایک دو گھر اباجی کے دوستوں کے بھی تھے' تین چار مکان چھوڑ کر ایک ہندو کا گھر تھا۔ پونے میں بعض مانگنے والے سانپ لے کر پھرا کرتے تھے۔ سو یہ ٹکلا سانپوں کو دودھ پلایا کرتا تھا۔

صبح سویرے' نیم اندھیرے' جب انسان نیند اور بیداری کی سرحد پر ڈگمگا رہا ہوتا ہے' کانوں میں آواز پڑتی:

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا' جب لاد چلے گا بنجارہ

بلند پاٹ دار آواز اور اس کے ساتھ عجیب سی جھنکار' ایک دن میں نے اس فقیر کو دن میں دیکھا' اس کے بازو میں لوہے کی پتلی پتلی چوڑیاں تھیں جنہیں وہ چھوٹے سے ڈنڈے سے بجا کر عجیب اُدھم پیدا کرتا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ نظیر اکبر آبادی کے بولوں نے میرے کانوں میں رس گھولا۔ لوہے کی چوڑیاں اور ڈنڈے کی موسیقی اب عنقا ہے کیونکہ اب نظیر کی نظم گا کر صبح جگانے والے فقیر بھی ناپید ہیں لیکن اگر کبھی اسے سننے کا موقع ملے تو اس ''آہنی'' دھن میں عجب والہانہ پن ملے گا۔ میں نے جو اتنی پرانی بات یاد رکھی تو ایک سبب یہ بھی ہے کہ مجھے ہمیشہ سے ہی سُر تال سے دلچسپی رہی ہے۔ آپا جی کی آواز بہت اچھی اور گلا بہت سریلا تھا' سو میرے بھی جینز میں موسیقی سے رغبت شامل ہوگئی' ایک عمر تک میں ٹھیک ٹھاک گاتا بھی رہا۔...... سکول اور کالج کی تقریبات میں گیت گائے ہیں۔

اُس زمانے کے پونے میں قوالی بہت مقبول تھی۔ جس طرح اس زمانہ میں فلمی گانوں کی چھوٹی چھوٹی کتابیں بکتی تھیں۔ اسی طرح مقبول قوالوں کی قوالیوں پر مشتمل کتابیں فروخت ہوتی تھیں' ''کانچ والا'' قوال بہت مشہور اور مقبول تھا۔ وہ ہاتھوں میں کانچ کے دو ٹکڑے رکھ کر انہیں عجیب طرح سے ٹکرا کر' ردھم پیدا کرتا تھا۔ شادی بیاہ خوشی کی تقریبات پر بالعموم طوائفوں کے برعکس قوال بلائے جاتے تھے۔ میں ہر قوالی میں پہنچنے کی کوشش کرتا۔ پھر آ کر ان کی نقل میں ٹین کنستر بجا کر' میں بھی ''قوالی'' کرتا' کانچ والا قوال کی نقل میں میں نے بھی کانچ کے دو ٹکڑے ہتھیلیوں میں لے کر' ٹک ٹک ٹکا ٹک کرنے کی کوشش کی' میں جو آیا جوش میں' تو شیشے ٹوٹ گئے۔ ایک کرچ ہتھیلی میں چبھ گئی' خاصا خون بہا' یوں بطور قوال میرا کیریئر بہت جلد ختم ہوگیا۔

مجھے آج کے پونے کا علم نہیں' لیکن چوتھی دہائی کا exotic پونے عجیب مافوق الفطرت فضا کا حامل تھا۔ جادو' ٹونا عام تھا' جن بھوت وغیرہ عام نہ ہوں مگر ان سے وابستہ واقعات کا تذکرہ عام تھا' تقریباً ہر گھر ہی بھوت بسیرا محسوس ہوتا۔ گلی کی نکڑ پر' سیندور کے دائرہ میں' جلیبی یا کالے ماش رکھے ہوتے' ساتھ ہی تانبہ کا پیسہ۔ ہندو تو اس دائرہ سے بچ کر گزرتے' مسلمان لڑکے جلیبی اٹھا کر کھا لیتے' تانبہ کا پیسہ جیب میں ڈالتے اور سیندور کے دائرہ

کے مرکز میں دھمال مارتے' ہر دسویں گھر میں کوئی جن بھوت بھی آباد تھا اور ہر بیسویں عورت پر سایہ تھا۔ بعض لوگ کسی ایسے ہی آسیب زدہ کمرہ میں رات کو مسلسل روشنی رکھتے۔

سڑک پر وقتاً فوقتاً کسی دیوی دیوتا کا بت جلوس کی صورت میں گزرتا' ہاتھوں میں ناریل تھامے عقیدت مند ساتھ ساتھ یا پجاری گنگا جل میں پتے بھگو کر لوگوں پر چھڑکتا' مرد یا عورت' سڑک پر لیٹ کر سجدے کرتی' آگے آگے!

ہمارے گھر جو گوالن دودھ دینے آتی' گھنی سانولی' لمبے قد اور باریک نقوش والی مرہٹن تھی' مجھے وہ بہت اچھی لگتی' آپا جی میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ سب کے ساتھ بہت جلد گھل مل جاتیں' سب کے دکھ درد میں شریک ہوتیں' عملی مدد کرتیں' چنانچہ گوالن بھی فارغ ہو کر ان کے پاس آ کر گھنٹوں باتیں کیا کرتی۔ آپ میری حیرت کا اندازہ کر سکتے ہیں جب ایک شام یہ گوالن دیوی کے جلوس میں' دیوانہ وار ناچ رہی تھی' اس کے لمبے سیاہ چمکیلے بال بکھرے تھے' آنکھیں بند تھیں کہ کھلی' کچھ کہا نہ جا سکتا تھا' خوفناک شکل والا کالا بھجنگ مرد ہاتھ میں لمبا سا کوڑا لئے تھا۔ جب ناچ میں ذرا سستی آتی تو وہ پرزور آواز سے کوڑا سڑک پر مارتا' ایسی کرخت آواز نکلتی کہ دل دہل جائے' گوالن کے جسم میں گویا نئے سرے سے بجلی بھر جاتی' رقص میں شدت آ جاتی' بھجنوں کے الاپ میں مزید تیزی پیدا ہو جاتی' کچھ دیر بعد بھجنوں کی آواز مدھم پڑ جاتی' رقص میں سستی سی آ جاتی۔

''شڑاپ'' کوڑے کی کرخت آواز سب کو پھر متحرک کر دیتی۔

میں نے گھر آ کر آپا جی کو سب بتایا۔ وہ اگلے دن دودھ لے کر آئی تو آپا جی کے استفسار پر اس نے بتایا کہ اس نے منت مانی تھی اور وہ دیوی کے مندر منت پوری کرنے جا رہی تھی۔

ڈر!

سکول والے ہمیں پک نک کے لئے شہر سے باہر لائے' سامنے ایک پہاڑی پر (غالباً) پاربتی اور چترسنگھی کے مندر تھے کیونکہ ہم بچوں کو سختی سے منع کیا گیا تھا کہ پہاڑی پر نہیں چڑھنا لہٰذا ہمارے لئے پہاڑی پر جانا لازم قرار پایا۔ کھا پی کر اساتذہ آرام کرنے لگے۔ لڑکے ادھر ادھر کھیلنے لگے۔ میں نے ایک دوست کو ساتھ لیا اور پہاڑی کا رخ کیا' خاصی اونچی پہاڑی تھی لیکن ہم نے اپنے جوش میں اوپر جا کر ہی دم لیا۔

دونوں ادھر ادھر گھومتے رہے' کوئی خاص چیز نظر نہ آئی' اور پھر پیتل کا ایک جنگلہ نظر آیا' ہم دونوں دوست جنگلہ پکڑ کر کھڑے ہو گئے' سامنے کوئی خاص چیز دکھائی نہ دے رہی تھی لیکن اس کے باوجود اعصاب پر بوجھ سا محسوس ہو رہا تھا' جیسے نادیدہ وجود ہمیں گھور رہا ہو' جیسے وہاں سے ہٹ جانے کو کہہ رہا ہو' میں نے اپنے دوست کی طرف دیکھا شاید وہ بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوگا' میں نے کہا:

''یہاں کچھ ہے''

''بھاگو!''

اور ہم دونوں سرپٹ بھاگے' اس پہاڑی کے تنگ اور ٹیڑھے میڑھے راستوں پر ہڈی پسلی تڑوائے بغیر ہم کیسے صحیح سلامت نیچے پہنچ گئے' یہ نہیں معلوم۔ ہم نے ماسٹروں اور ساتھیوں کو سارا ماجرا سنایا' گھر آ کر میں مسلسل اسی کا ذکر کرتا رہا' رات کو زور کا تپ چڑھا - یہ بخار کا لرزا کہ خوف کا - وثوق سے کہنا مشکل ہے۔

ایک برعکس مثال۔

میں نے کوئی شرارت کی' ڈانٹ ڈپٹ کے بعد مجھے اوپر کے کمرہ میں بطور سزا بند کر دیا جاتا ہے' اس کمرے میں بھوت بسیرا تو نہ تھا مگر پھر بھی یہ استعمال میں نہ تھا' چنانچہ خالی کمرہ کی ویرانی سے بھی ڈر لگتا اور اسی کمرہ میں مجھے بند کر دیا گیا' میں کچھ دیر تک روتا رہا' اس کے بعد' میری ضدی طبیعت آڑے آئی اور میں خاموشی سے کھڑا رہا۔ جب توقع کے برعکس نہ میں نے شور مچایا' نہ معافی مانگی' نہ دروازہ کھٹکھٹایا نہ رویا چیخا تو گھر والوں نے سوچا کہیں یہ ڈر سے بے ہوش ہی نہ ہو گیا ہو۔ انہوں نے آ کر دروازہ کھولا تو میں خشک آنکھیں لئے' بقائمی ہوش و حواس خالی کمرہ کے وسط میں کھڑا تھا۔ یہ گھر والوں پر میری پہلی فتح تھی!

خوف بطور تخلیقی محرک:

میں نے اپنے متعدد افسانوں میں مافوق الفطرت سے متعلق موضوعات' کردار' واقعات اور اعصاب پر خوف کے شدید اثرات کو موضوع بنایا ہے' اسی طرح میں نے مافوق الفطرت' جن بھوتوں' روحوں اور جادو وغیرہ کو علمی طور پر سمجھنے کے لئے متعدد کتابوں کا مطالعہ بھی کیا ہے' اگر یہ میرے حاکم سیارہ اور نام کے اعداد کی بدولت نہیں تو پھر یقیناً ابتدائی زندگی کے ان واقعات نے مجھ پر خاصے گہرے اثرات چھوڑے ہوں گے' بچپن کے ان واقعات کے اعصابی اثرات' تحت الشعور میں جاگزین رہے اور جب لکھنے کا آغاز ہوا تو انہوں نے تخلیقی محرک کی صورت اختیار کر لی' اسی طرح ان واقعات سے مشروط خوف بھی میری شخصیت پر اثر انداز ہوتا رہا ہے' میرے متعدد افسانوں میں بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر' اسی خوف نے افسانوی دنیا کی تشکیل کی ہے' ظاہر ہے کہ میں نے یہ خوف اپنی ابتدائی اسی لئے سادہ صورت میں محسوس کیا ہوگا جبکہ تخلیقی عمل کی بدولت سادہ خوف نے پیچیدہ نفسی کیفیات کی صورت میں اظہار پایا' یہ لکھتے وقت میں سوچ رہا ہوں کہ خالص جنسی افسانوں سے قطع نظر میرے بیشتر افسانے کسی نہ کسی سطح پر خوف ہی کا مطالعہ ہیں۔ ہر چند کہ ایسے تمام افسانے مافوق الفطرت تھیم یا پراسرار فضا کے حامل ہیں لیکن اس کے باوجود کرداروں کے حوالے سے انسان کی شخصیت میں' خوف کی کارفرمائیوں کا مطالعہ کیا ہے۔ خواہ وہ ''محاذ 1971ء'' ہو یا ''تیرھواں برج'' یا پھر ''نادیدہ'' - میرے افسانوں پر معروف ناقدین نے بہت اچھے اچھے مقالے قلم بند کئے' مگر زیادہ تر جنسی نفسیات ہی کا تجزیاتی مطالعہ کیا مگر ایک ناقد بھی میرے افسانوں میں خوف کے مظاہر تک نہ پہنچ پایا۔

قریبی دوستوں کو بھی یہ علم نہیں کہ میں ''خوفناک'' کہانیوں اور ہورر موویز کا رسیا ہوں۔ میں نے بروم

سٹوکر کے ''ڈریکولا'' کا مطالعہ اس وقت کیا جب کالج میں تھا۔ میں رات گئے ناول پڑھتا رہا اور بقیہ رات مارے ڈر کے جاگتا رہا۔

Rosemary's Baby, Exorcist معروف فلمیں ہیں' میں نے فلم بننے سے پہلے یہ ناول پڑھ رکھے تھے اسی لئے اگر میں نے شیطان کی پوجا کے موضوع پر افسانہ ''اماوس'' قلم بند کیا تو یہ باعث تعجب نہ ہونا چاہئے۔ میری ابتدائی کنڈیشننگ کا یہی تقاضا تھا۔

حضور! عدم آیا ہے:

پونے میں پہلی مرتبہ میں نے عدم اور شراب کا نام سنا!

پونے میں سڑک (نام یاد نہیں) کے کنارے ایک خاتون پیر (غالباً) بابا جان کا چھوٹا سا مزار تھا۔

بابا جان کے مزار پر جو اگر بتیاں جلتی تھیں ان کی راکھ ایک بڑے برتن میں جمع کر لی جاتی 'مشہور یہ تھا کہ اس راکھ میں شفا ہے' چنانچہ مریضوں کے لئے لوگ راکھ کی پڑیاں باندھ کر لے جاتے۔ ہم بچہ لوگ جب بھی مزار کے سامنے سے گزرتے' چٹکی بھر راکھ پھانکنی نہ بھولتے۔

بازار کی پشت پر کھیل کا میدان اور سامنے ایک پرائمری سکول' جسے ایک مسلم انجمن چلاتی تھی۔ یہ انجمن ایک ہائی سکول بھی چلاتی تھی۔ میری ابتدائی تعلیم کو اگر ٹریلر سمجھیں تو میری اصلی تعلیم کی فلم کا مہورت 1942ء میں ہوا جب مجھے اس پرائمری سکول میں دوسری جماعت میں داخل کیا گیا۔

سکول کا پہلا دن بے حد ناخوشگوار ثابت ہوا۔

آپا جی کا لاڈلا پڑھنے جا رہا تھا۔ چنانچہ انہوں نے نئی نیکر اور قمیض پہنا کر' خوب تیل لگا کر بالوں کی مانگ نکالی' مگر میں جو کہ ہیرو بن کر پڑھنے چلا تھا ماسٹر کے ہاتھوں زیرو بن گیا۔ اس لئے کہ اس اسلامی انجمن کے مسلم سکول میں' میں گویا کافر ثابت ہوا کہ مری مانگ نکلی تھی اور میں نے نیکر پہن رکھی تھی۔

''اے تم کرسٹان ہو''

میں کیا جواب دیتا' مجھے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ کرسٹان کون ہوتا ہے۔ سچی بات تو یہ کہ یہ علم بھی نہ تھا کہ مسلمان کون ہوتا ہے۔

ماسٹر کی سخت سست نے یہ انکشاف کیا کہ طلبہ کے لئے پاجامہ اور سر پر ٹوپی لازم تھی' ان دونوں کے بغیر میں گویا سکول میں ننگا ہی چلا آیا تھا۔ گھر آ کر میں خوب رویا کیونکہ ماسٹر نے کہا تھا کہ آج تو پہلا دن ہے' کل ٹوپی کے بغیر آئے تو سکول سے نکال دیئے جاؤ گے۔ اس دن مجھ پر اس حقیقت کا بھی انکشاف ہوا کہ مسلمان ہونے کا کیا مطلب ہے؟

ابا جی دفتر سے آئے تو آپا جی نے انہیں سب بتایا' انہوں نے اسی وقت مجھے ساتھ لیا اور ہم باپ بیٹا

چلے ٹوپی خریدنے۔ ٹوپی تو خرید لی مگر ہوا یہ کہ جب بس پر سوار ہونے لگے تو کسی نے پاکٹ مار لی' یہ مہینے کی ابتدائی تاریخیں تھیں سو مہینہ بھر کی تنخواہ میں ٹوپی پڑی۔ یوں ٹوپی سے میری ایسی نیگیٹو کنڈیشننگ ہوئی کہ ہنوز ہر رنگ' قطع اور نسل کی ٹوپی ناپسند ہے۔

جیب کٹوانے کے بعد ہاتھ میں ٹوپی پکڑے (جو سلیمانی ٹوپی نہ ثابت ہوئی ورنہ دلدر دور ہو جاتے) باپ بیٹا پیدل مارچ کرتے چلے سوئے خانہ!

''قاضی صاحب!''

ابا جی نے مڑ کر دیکھا ''عدم صاحب'' وہ خوشی سے بولے

''کہاں پھر رہے ہیں؟''

ابا جی نے ٹوپی نامہ گوش گزار کیا' عدم صاحب قریبی ایرانی ریستوران میں لے آئے' چائے پلائی۔ میرے محدود ذخیرۂ الفاظ کے مطابق میرے لئے لفظ ''اوم'' نیا اور عجیب سا نام تھا۔ ہر چند کہ اس نام کا حامل شخص خاصا کھلا ڈلا اور بے تکلف نظر آیا۔

کچھ عرصہ بعد ہمارے مکان کے سامنے (دائیں ہاتھ کا پہلا) مکان خالی ہوا تو عدم صاحب وہاں آ گئے (اس وقت مجھے علم نہ تھا یہ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کے اہل خانہ راولپنڈی میں تھے) ابا جی کی عدم صاحب سے عراق میں دوستی ہوئی' جہاں یہ رفیق کار تھے' عدم آتے ہوئے عراق سے (بیاہی یا بن بیاہی) عورت ساتھ لے آئے' بھاری جسم' پکے رنگ اور موٹے نقوش والی' چہرہ پر چیچک کے داغ' اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو ملکیہ اس کا نام تھا' اولاد کوئی نہ تھی' وہ پاسنگ شو کے سگریٹ پیتی تھی' یہ مجھے اس لئے معلوم ہے کہ سگریٹ میں ہی لایا کرتا تھا۔

بھاری آواز والی ملکیہ میموں جیسی اردو بولتی تھی' آپا جی کے ساتھ اس کی بہت جلد دوستی ہو گئی۔ وہ بالعموم سارا دن ہمارے ہاں بسر کرتی' کھانا کبھی ہمارے گھر سے تو کبھی ہوٹل سے۔ رات گئے دونوں دوست جھومتے جھامتے آتے تو دونوں کی بیویاں لڑتیں۔ آپا جی کے بموجب عدم نے ابا جی کو بھی خراب کر دیا۔ بعض اوقات ''اوم کڑوم'' کہہ کر گویا اپنا غصہ ٹھنڈا کرتیں لیکن ملکیہ میں اتنا تحمل نہ تھا' اس کی غصیلی آواز بعض اوقات ساری چال میں گونجتی' بیشتر گھروں کے مرد شراب یا تاڑی سے شغل فرماتے تھے اس لئے چال کی عورتوں کے لئے یہ کوئی بہت اہم مسئلہ نہ تھا۔

ملکیہ زیادہ غصہ میں آتی تو دو چار جڑ بھی دیتی۔ ایک مرتبہ اس نے غصہ میں آ کر سلائی والی مشین دے ماری' مشین عدم صاحب کو لئے ہوئے سیڑھیوں سے گرتی چلی گئی۔ مشین پر نہ جانے کیا بیتی لیکن عدم صاحب کے ڈینٹ اور چپ دیدنی تھے۔ ایک رات تشریف لائے تو خون میں لت پت' نہ جانے کسی سے لڑے یا لہر میں آ کر گرے۔

اپنے گھر کا پرسکون ماحول برباد ہوتا نظر آ رہا تھا۔ اگرچہ ابا جی نے کبھی آپا جی کو یا ہم بہن بھائیوں کو

تنگ نہ کیا لیکن اس کے باوجود گھر کے پرتناؤ ماحول نے ہم بچوں پر بھی اثر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ نسیم اور شمیم مجھ سے چھوٹی تھیں' چھوٹا تو میں بھی تھا لیکن میں بے حد حساس بچہ تھا۔ مجھے تب علم نہ تھا کہ عمر کے لحاظ سے میں کچھ زیادہ ہی متجسس' تیز اور ذہین تھا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ میں عمر بھر ہر طرح (حتیٰ کہ سگریٹ بھی جواب روایتی مفہوم میں نشوں میں شمار نہیں ہوتی) کے نشوں سے جو متنفر رہا تو اس کی بنیادی وجہ پونے کے حالات ہیں۔ تمام عمر شرابی شاعروں کے ساتھ' ان کی محفلوں میں شرکت کی' مگر کبھی پینے کی خواہش نہ ہوئی۔

ایسی حسین محفلوں میں بھی شریک ہوا جہاں دست نازک والی مسکرا کر اگر زہر بھی دے تو مرد خوشی خوشی پی لے' مگر وہاں بھی انکار ہی کیا۔

ایک مرتبہ ایک کافرادا نے دلربائی سے کہا

''سلیم صاحب! آپ کو ہم ایسے پلانے والے نہ ملیں گے۔''

میں نے جواب دیا

''آپ نے ہم ایسے انکار کرنے والے بھی نہ دیکھے ہوں گے۔''

در ایام جوانی (پشاور میں) تلخی ایام کو کم کرنے کے لئے' رومانی فلموں کے ہیرو کی مانند میں نے بھی شراب پی' لیکن قطعاً نشہ نہ ہوا' میرے دوست متعجب ہوئے کہ تیز شراب کا مجھ پر اثر کیوں نہ ہوا' سب نے کہا تم جھوٹے ہو کہ تمہارا پہلا موقع ہے تم تو پرانے پاپی ہو۔ میں نے قسمیں کھا کر کہا کہ یقین دلایا کہ واقعی یہ پہلا موقع ہے اس پر تو انہیں گویا ضد سی ہو گئی کہ تمہیں نشہ سے آؤٹ کرنا ہے۔ طرح طرح کی برانڈ آتیں' مجھ پر آزمائی جاتیں مگر نشہ صفر۔ زیادہ پینے سے بعض اوقات قے بھی ہو جاتی لیکن اثر بالکل نہ ہوتا۔ جب نفسیات کا مطالعہ کیا تو میں سمجھا کہ شراب کے خلاف میری داخلی مزاحمت اتنی قوی تھی کہ اس نے الکحل کو مات دے دی۔

کئی مہینے یہ تماشا ہوتا رہا بالآخر میں اور میرے دوست یہ سمجھ گئے کہ مجھے نشہ نہ ہو گا۔ اب پینتالیس برس ہونے کو آئے مجھے شراب کی طلب محسوس نہ ہوئی' حتیٰ کہ بھارت اور دیگر ممالک میں جا کر بھی جہاں نہ پینے والا نکو بن جاتا ہے۔

سلیمانی ٹوپی!

میں نے سلیمانی ٹوپی اور ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہن کر سکول جانا شروع کر دیا۔ پہلے دن کی بدمزگی سے قطع نظر بحیثیت مجموعی میں وہاں خوش ہی رہا۔

میں لکھ آیا ہوں کہ میں خاصا نالائق تھا لیکن اچانک جیسے ذہن کے بند دریچے کھل گئے۔ ایک بات جو بہت اچھی تھی وہ تھی مسابقت۔ ہر کام کے لئے ہر روز نمبر ملتے تھے۔ یعنی صبح' وقت پر آنا' گھر کا کام کر کے لانا'

سوالات کے درست جوابات دینا وغیرہ' ہر بات اور کام کے لئے نمبر ملتے۔ یوں ہر روز ملنے والے نمبروں کا مہینہ بعد ٹوٹل ہوتا جس کے نمبر سب سے زیادہ ہوتے وہ مہینہ بھر کے لئے مانیٹر بنا دیا جاتا۔ دو تین ماہ بعد میں مانیٹر بنا اور پھر میں نے اور کسی کو مانیٹر نہ بننے دیا۔

تیسری جماعت تک مولانا حالی کی مسدس کے ابتدائی بند ازبر ہو چکے تھے' تقریری مقابلہ میں شریک ہوا اور اول انعام ملا' دو آنے۔ ہم دوستوں نے اس خطیر رقم کی جی بھر کر ''گڑوانی'' کھائی۔ یہ میرا پہلا انعام تھا۔

مرہٹے لڑکے دوپہر کو باجرہ کی روٹی لاتے' یہ کالی روٹی مجھے بڑی عجیب سی لگی' ایک نوالہ توڑا تو یوں محسوس ہوا جیسے سیمنٹ کھا رہا ہوں' نوالہ حلق میں اٹک گیا۔

اسی سکول میں میں نے پہلی مرتبہ قائداعظم کا نام سنا۔ ہال کی دیوار پر موٹے سفید کاغذ (یا پھر گتے) پر لکھا تھا ''قائداعظم محمد علی جناح' زندہ باد''۔ مجھے قائداعظم کا مطلب معلوم نہ تھا' ادھر جناح بھی میرے لئے نامانوس لفظ تھا۔ صرف محمد علی کے بارے میں یہ معلوم تھا کہ یہ ایک نام ہے مگر کس کا؟

تاڑی! عورت!!

میں خاصا شریر لڑکا ثابت ہو رہا تھا' گلی ڈنڈا کھیلتے ہوئے کیچ لینے میں گلی آنکھ پر آ گری' وہ تو نصف انچ سے بچت ہو گئی ورنہ میں رنجیت سنگھ بن چکا ہوتا اور سب کو ایک آنکھ سے دیکھتا۔ کھیل میں میرے ہاتھوں ایک ساتھی طالب علم کی ٹانگ ٹوٹتے بچی' ان ہی دنوں سائیکل چلانی سیکھی' میں اتنا چھوٹا تھا کہ سائیکل پر چڑھنے کے بجائے فریم کے اندر ٹانگیں کر کے سائیکل چلاتا' روز گرتا' چوٹیں لگتیں مگر باز نہ آتا۔

پونے میں پہلی مرتبہ کنول کے پھول دیکھے اور تاڑی کے بے حد اونچے مگر سڈول درخت بھی' جگہ جگہ تاڑی خانے تھے جہاں شوقین مٹی کے آبخورے میں تاڑی پیتے اور کیلے کے پتوں اور بڑ کے درخت کے بنے دونوں میں چاٹ' دہی بھلے' پکوڑے اور ایسی ہی چٹ پٹی چیزیں کھاتے۔ تاڑی کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ سورج نکلنے سے پہلے اسے پیو تو یہ مفرح ہے جبکہ سورج چمکنے سے اس میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ مفرح یا نشہ۔ تاڑی اتنی ہی مقبول اور پسندیدہ تھی جتنی کہ بیڑی۔ بیڑی تو عورتیں بھی پیتی تھیں۔

عورتوں کا ذکر آیا تو منٹو کے افسانہ ''بُو'' کی گھاٹن کو ذہن میں لائیے' سب مرہٹنیں ویسی ہی ہوتی تھیں' مجھے اس وقت عورت کی بطور ''عورت'' سمجھ نہ تھی میرے لئے عورت ماں اور بہن سے زیادہ معانی نہ رکھتی تھی۔ لیکن مرہٹن ان خانوں میں فٹ نہ ہو سکتی تھی' دوہرے جسم' بھاری چھاتیوں' پھیلے کولہوں' پکے رنگ کی مرہٹن ساڑھی کا پلو پشت پر کمر میں اٹکا کر' دوگنی گولائیاں ابھار کر' جس طرح سے چلتی تھی اگر وہ قصہ خوانی میں چلے تو لاتعداد حقوں کی نے ٹیڑھی ہو جائے۔ (ساڑھی کے اس انداز کے لئے غالباً ''کانچ'' کا لفظ استعمال ہوتا تھا)۔ اس پر مستزاد ان کی بے حد چھوٹی چولی' اتنی چھوٹی کہ یہ بھی نہ پوچھنا پڑے۔ چولی کے پیچھے کیا ہے؟

تقریباً ہر عورت کھا تا چونا کھاتی اور بیشتر بیڑی پیتیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ زیادہ تر دوکانداری' کاروبار اور متفرق کام عورتیں ہی کرتیں۔ اس حد تک کہ پوری سبزی مارکیٹ میں سبزی فروخت کرنے والا ایک مرد بھی نظر نہ آئے۔

حضرت علی کا باگھ!

پونے کی سڑکوں پر ہر وقت دیوی دیوتاؤں کی بت اٹھائے جلوس گزرتے رہتے۔
جیسا محرم میں نے پونے میں دیکھا اپنے علاقوں میں ویسا نہ دیکھا' کالے جسم پر پیلا رنگ مل کر شیر کی کھال جیسی دھاریاں بنائی جاتیں' چہرہ پر شیر کے نقوش پینٹ کئے جاتے' ڈھول کی تھاپ پر گلیوں میں پھرنا یہ حضرت علی کا ''باگھ'' تھا' لوگ اسے پیسے دیتے' بعض اوقات کئی ''باگھ'' مل کر تماشے کرتے' پونے کے تعزیئے دو منزلہ۔ کان سے کم بلند نہ ہوتے' خوب ماتم ہوتا اور پھر دس محرم کو پونے کے قریب دو ندیوں کے سنگم پر انہیں ڈبو دیا جاتا۔ ہر سال نئے تعزیئے بنتے تھے اور ایسے زرق برق کہ انسان دیکھتا ہی رہ جائے' یہیں میں نے دہکتے کوئلوں پر ماتم بھی دیکھا۔

ڈالڈا!

گھر گھر میں دیوالی ہے میرے گھر میں اندھیرا۔ یہ فلمی گانا بجاتی ایک وین سڑک پر رکتی ہے' ہم بچے لوگ جمع ہو جاتے ہیں' ایک شخص انگیٹھی نکال کر اس میں کوئلے دہکا رہا ہے۔ گانے بج رہے ہیں' لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اب وہ سرخ کوئلوں پر کڑاہی رکھ کر ایک ڈبہ میں سے گھی نکال کر اس میں ڈالتا ہے گانے بج رہے ہیں اور لوگوں کا دائرہ پھیلتا جا رہا ہے۔ کھولتے گھی میں پکوڑے' مٹھیاں اور اسی طرح کی چیزیں تلی جا رہی تھیں' لوگوں کو پیش کی جا رہی تھیں سب ان کی خستگی کا مزا لے رہے ہیں۔ یہ ڈالڈا متعارف کرانے کی مہم تھی بالکل اسی طرح جیسے اس سے دس بیس برس پہلے لوگوں کو مفت چائے پلائی گئی تھی۔ کاش ہمارے زمانے میں کوکا کولا' چینی کھانے' برگر اور پیزا بھی اسی طرح متعارف کرائے گئے ہوتے۔

فلم!

گھر گھر میں دیوالی ہے میرے گھر میں اندھیرا!
یہ ہٹ سونگ اپنے زمانہ کی سپر ہٹ فلم ''قسمت'' کا تھا' اشوک کمار اور ممتاز شانتی کی اس فلم نے زیادہ چلنے کا جو ریکارڈ 43-1942ء میں قائم کیا تھا اسے ''مغل اعظم'' نے توڑا۔
جیسا کہ میں لکھ آیا ہوں ابا جی لبرل انسان تھے چنانچہ اپنے ساتھ آپا جی کو بھی فلم دکھانے لے جاتے۔

اس زمانہ کی فضا کے لحاظ سے یہ خاصی باغیانہ بات تھی۔ میں بھی ساتھ ہوتا تھا اس لئے میرے لئے فلم اس طرح سے کبھی بھی ٹیبو نہ رہی جیسی کہ بیشتر نوجوانوں کے لئے ہنوز بھی ہے۔ آج یہ پڑھ کر ہنسی آئے گی کہ اس زمانہ میں سینما کا سب سے کم ٹکٹ دو آنے (۱۲ پیسے) جبکہ گیلری کا ۹ آنے (۵۵ پیسے)۔

جنگ کا زمانہ تھا چنانچہ اس مناسبت سے فلم ''قسمت'' کا ایک ترانہ نما گانا بھی بہت مقبول تھا۔

آج ہمالہ کی چوٹی سے پھر ہم نے للکارا ہے
دور ہٹو اے دنیا والو
ہندوستان ہمارا ہے
یہاں ہمارے مندر مسجد سکھوں کا گوردوارہ ہے
دور ہٹو اے دنیا والو
ہندوستان ہمارا ہے

ایڈونچر!

یہ گانا اس زمانہ کے جائنٹ سٹار سرلیش پر پکچرائز ہوا تھا۔ میں بھی یہ گانا گاتا تھا مگر اس میں سر تال کم اور زور شور زیادہ ہوتا تھا۔ پھر مجھ پر فلم ''قسمت'' دیکھنے کی دھن سوار ہوگئی۔ کئی دن کی سعی مسلسل' سودے میں سے دھیلوں اور پائیوں کی کتر بیونت اپنے جیب خرچ میں سے پیسے بچا بچا کر' بالآخر میں دو آنے کی خطیر رقم جمع کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ٹکٹ کا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن ''قسمت'' شہر کے کسی سینما میں چل رہی تھی جبکہ میں کیمپ (چھاؤنی) میں رہتا تھا۔ ادھر راستوں کا بھی علم نہ تھا اور نہ ہی یہ معلوم کہ شہر کے جس سینما میں ''قسمت'' چل رہی ہے اس کا محل وقوع کیا ہے۔ یہ مسئلہ یوں حل ہوا کہ میرے ایک ہم جماعت کے گھر کے پاس سینما تھا۔ میں نے اسے کہا تم مجھے وہاں پہنچا دو' باقی میں سب کچھ کرلوں گا' سو جناب! سکول سے ہم دونوں دوست جو چلے تو پیدل مارچ کرتے ہوئے بالآخر سینما جا پہنچے جہاں بے پناہ ہجوم' میں جو ہرج مرج کھینچتا یہاں تک پہنچا تھا تو واپسی ناممکن تھی۔ لہٰذا لوگوں کی ٹانگوں کے سمندر میں بے خطر کود پڑا اور بہ ہزار خرابی بسیار گوہر مراد حاصل کر ہی لیا۔

دو آنہ کلاس میں چار ٹوٹے پھوٹے بینچ رکھے تھے میں بھی گردن اکڑا کر براجمان ہو گیا۔ فلم دیکھی تو سارے کشٹ کی قیمت وصول ہو گئی' شام کو میں انجان سڑکوں پر چلتا ہوا خود بخود گھر کیسے پہنچ گیا اس کا علم نہیں' واپسی پر جو حسن سلوک ہوا اسے بھی چھوڑیئے۔ اصل بات یہ ہے کہ کم عمری کی یہ ایڈونچر میری شخصیت کے اس پہلو کی مظہر ہے کہ میں نے اگر کچھ کرنے کا ارادہ باندھ لیا تو پھر سود و زیاں اور نتائج وغیرہ کی کبھی پرواہ نہ کی۔ ہر چہ بادا باد! جی میں ٹھان لی تو ٹھان لی' نفع نقصان کا ہرگز نہ سوچا۔

اس حد تک کہ بعض اوقات تو نمرود کی عدم موجودگی میں خود ہی سامان سوختنی مہیا کیا' آگ بھڑکائی اور

پھر اس میں بے خطر کود پڑے - بلا وجہ ہی!

بنیادی طور پر میں impulsive ہوں۔ ایسے افراد بالعموم لمحات کے تابع ہوتے ہیں۔ اسی لئے جذبات و احساسات کی لمبی اور دیرپا منصوبہ بندی نہیں کر سکتے، مزاج کی سیمابیت ہر دم بے چین اور متحرک رکھتی ہے۔ لہٰذا ایسے افراد بالعموم جلے پاؤں کی بلی بنے رہتے ہیں اور میں تو اس معاملہ میں بلی نہیں بلکہ بلا بنا رہا۔ آج کا ڈاکٹر سلیم اختر مت دیکھئے۔ یہ تو مردہ آتش فشاں ہے!

اے گردش ایام!

صاف ستھرا، خوش منظر، exotic پونے مجھے آج بھی ہانٹ کرتا ہے، ظاہر ہے میرے ذہن میں بچپن کی یادوں سے مرصع پونے آباد ہے جس کا اصل پونے سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ تاہم اب بھی جی چاہتا ہے کہ ایک مرتبہ پونے کو دیکھوں۔ کیا بھگوان داس کی چال ہنوز آباد ہے اور دل خوش نا کی بھی اسی نام کی حامل ہے؟ کیا بادا جان کے مزار کے ساتھ وہ پرائمری سکول اب بھی موجود ہے جہاں میں دوسری تیسری اور چوتھی جماعت کا طالب علم رہا۔ کیا شفا کے لئے آج بھی بادا جان کے مزار کی اگربتیوں کی راکھ چاٹی جاتی ہے۔

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو!

تمنا بے تاب–2
(یادداشتیں)

رشید امجد

پنڈی آ کر دو چار دن تو مہمان داری میں گزر گئے۔ چچا اور پھوپھی نے کرشن نگر میں ڈیرا جما لیا تھا' دو ایک دن ان کی طرف رہے۔ اس دوران کشمیر کی صورت حال بگڑتی گئی اور فوری واپسی کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ خالو عبدالخالق نے اوپر والا ایک کمرہ ہمیں دے دیا۔ یہ گھر ایک گوردوارا تھا۔ اس وقت آس پاس کئی شاندار گھر خالی تھے' لیکن خالو کو خیال تھا کہ اس ابتلا میں اکٹھے رہنا بہتر ہے' انہیں کیا معلوم تھا کہ ایک وقت آئے گا جب ایک ایک انچ جگہ کے لئے جھگڑے ہوں گے۔ ساتھ لائے ہوئے قالین بکنے کی بھی کوئی صورت نہ تھی۔ آٹھ دس قالین تھے۔ دو تین رشتہ داروں میں بٹ گئے۔ ایک ماموں لاہور میں ہی رک گئے تھے۔ دوسرے کالج روڈ پر آن بسے۔ ایک ایک قالین ہر گھر میں تقسیم ہو گیا' باقی دو چار اونے پونے بکے' کچھ عرصہ ان سے گزارہ چلتا رہا۔ والد قالینوں کے ڈیزائنر تھے اور فی الحال قالینوں کی فیکٹری قائم ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔ خالو نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ گنج منڈی میں کریانہ کی دوکان کھول لیں۔ بچے کھچے پیسے سے ایک دوکان لی گئی اور والد کریانے کا سامان لے کر وہاں بیٹھ گئے۔

اب سکول میں میرے داخلہ کا مرحلہ آیا۔ مشکل یہ پیش آئی کہ مجھے کشمیری کے علاوہ صرف ٹوٹی پھوٹی اردو نما پنجابی آتی تھی۔ انگریزی واجبی سی تھی اتنی ہی جتنی کے جی ٹو کے بچے کو آنا چاہئے۔ مجھے جس سکول میں لے کر جاتے وہ کہتے پہلے اسے اردو سکھا کر لاؤ۔ اس زمانے میں کشمیری بازار میں ایک طرف گھر اور دوسری طرف لمبی دیوار تھی جو روز سینما سے شروع ہو کر ناولٹی پر ختم ہوتی تھی۔ اس دیوار پر مختلف قسموں کے اشتہار لکھے جاتے تھے۔ والد روزانہ مجھے ساتھ لے جاتے اور ایک طرف سے شروع کر کے اشتہاروں کے ہجے اور تلفظ سکھاتے جاتے گھر میں بھی کشمیری کی بجائے اردو اور پنجابی بولنے لگے۔ خالو عبدالخالق جو نچلی منزل میں رہتے تھے' ان کے گھر والے تو بولتے ہی پنجابی تھے' چنانچہ چند ہی دنوں میں' میں اردو اور پنجابی دونوں زبانوں سے آشنا ہو گیا۔ ہمارا گھر تا تک

پورہ کا آخری گھر تھا' اس کی دیوار سے کھیتوں کا ایک سلسلہ شروع ہوتا تھا جس کے دوسری طرف موہن پورہ تھا' یہیں ایک سکول میں جس کا نام پاکستان گرلز ہائی سکول تھا مجھے تیسری جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ اس کی ہیڈ مسٹریس مبارک بانو تھیں' ان کے خاوند سی ایم اے میں کام کرتے تھے۔ یہ بے اولاد تھے' معلوم نہیں کیسے میں ان کی نظروں میں آ گیا اور وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح پیار کرنے لگے۔ سکول کے بعد اکثر مجھے روک لیتے۔ ان کی رہائش سکول کے اندر ہی تھی۔ کھانا کھلا کر بھیجتے' دیر ہو جاتی تو ان کا نوکر مجھے گھر چھوڑنے آتا۔ بنیادی طور پر تو یہ لڑکیوں کا سکول تھا جس میں لڑکے صرف پانچویں جماعت تک پڑھتے تھے' لیکن میں آٹھویں جماعت تک وہاں پڑھتا رہا۔ چھٹی سے آٹھویں تک میں سکول میں ایک ہی لڑکا تھا' شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے شرمیلے پن کی وجہ سے سب لوگ مجھے لڑکی جیسا ہی سمجھتے تھے اور سچی بات ہے سوائے اپنی استانیوں کے میں نے اپنی کسی کلاس فیلو کے بارے میں کسی بھی حوالے سے کچھ سوچا ہی نہیں۔

اپنی استانیوں سے مجھے ایک اور ہی طرح کا لگاؤ تھا' معلوم نہیں کیوں زندگی بھر مجھے زیادہ عمر کی عورتوں سے عشق رہا ہے۔ عام طور پر جو لوگ ماں کی محبت سے محروم ہوتے ہیں وہ mother fixation کا شکار ہوتے ہیں لیکن میرا معاملہ مختلف ہے۔ میری ماں مجھے ٹوٹ کر پیار کرتی تھی' اتنا زیادہ کہ اس میں کسی دوسرے کی شرکت بھی اسے گوارا نہ تھی' اس possessive love کی وجہ سے میرا ان کا رشتہ love hated کا ہو گیا تھا' لیکن ماں ہمیشہ میرے ساتھ رہی پھر بھی مجھے ماںتگی کی کمی محسوس ہوتی رہی شاید ان بڑی عمر کی عورتوں میں' میں اسی کو تلاش کرتا تھا۔ میری ان استانیوں میں سے دو تین بڑی خوبصورت تھیں۔ میں چپکے چپکے ان کے نام محبت بھرے خط لکھتا' اپنی کاپی میں اور انہیں چھپا کر رکھتا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ یہ خط ایک میڈم کے ہاتھ آ گیا۔ یہ خط تھا بھی اسی کے نام۔ میرا ڈر کے مارے برا حال تھا' وہ خط پڑھ کر ہنس پڑیں اور میرے گال کو تھپتھپا کر بولیں آئندہ نہ کرنا۔ آئندہ میں نے کاپی میں تو خط نہ لکھا لیکن لکھ کر پھاڑ دیتا۔ بہت دن گزر جاتے تو میں خود ہی کسی خط کا جواب اپنے نام لکھتا' کئی دن اس کے مزے لیتا اور پھر خاموشی سے اسے پھاڑ دیتا۔ انہی چھوٹی موٹی خوشیوں میں زینہ زینہ چڑھتا میں آٹھویں میں آ گیا۔ اب اس سکول میں میرا رہنا ممکن نہ تھا' چنانچہ مبارک بانو کے نہ چاہنے کے باوجود مجھے سکول چھوڑنا پڑا۔ چند دن مشن ہائی سکول میں رہا جو فوارا چوک میں تھا' لیکن امی کو وہاں کا ماحول پسند نہ آیا چنانچہ انہوں نے مجھے ڈینیز ہائی سکول میں داخل کرا دیا۔ ڈینیز ہائی سکول صدر میں تھا اور اس کا شمار شہر کے بہترین اداروں میں ہوتا تھا۔ میں نے 1955ء میں وہیں سے میٹرک کیا۔ ڈینیز ہائی سکول میں میرے دوستوں میں نثار اور ابراہیم بہت قریب تھے' دونوں گوالمنڈی میں رہتے تھے۔

والد قالینوں کے رنگوں' نقشوں اور ان کی باریک بینیوں سے تو واقف تھے لیکن کریانہ فروشی کے گر نہیں آتے تھے۔ ان کے لئے دکان پر بیٹھنا خاصا مشکل تھا۔ تاہم دکان سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی جس سے گھر کا خرچہ چل جاتا۔ اپنی سہولت کے لئے انہوں نے ایک شخص کو ملازم رکھ لیا۔ اس شخص نے آہستہ آہستہ سارا کام سنبھال

لیا۔ والد کے معمولات میں فرق آ گیا' وہ دیر سے دکان پر جاتے' کچھ دیر بیٹھتے' پھر دوپہر کا کھانا کھانے گھر آ جاتے اور لمبا قیلولہ کرنے کے بعد واپس جاتے' خاموشی اور آہستگی سے نقصان ہونے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ آڑھتیوں کی اتنی رقم چڑھ گئی کہ دکان اور اس کا سامان بیچ کر ادائیگی ہوئی۔ والد فارغ ہو گئے' اس دوران خالو عبدالخالق فوت ہو گئے۔ وہ مروت والے اور آنچ کھانے والے شخص تھے' ان کی موجودگی میں کبھی احساس نہ ہوا کہ اس مکان میں دو کنبے رہتے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد آہستہ آہستہ حالات خراب ہونے لگے۔ نذیر احمد کے بچوں کی تعداد بڑھی تو جگہ کی قلت کا احساس ہونے لگا۔ ہمارے گھر میں بھی ایک نیا مہمان آ گیا' میری بہن عشرت' اس بار یہ نام امی نے رکھا کہ اب والد کے جوتشی پنڈت موجود نہ تھے۔ انہوں نے اپنے طور پر بڑی کوشش کی کہ کسی طرح علیا چاچا کو کوائف بھیج کر جنم پتری بنوائی جائے لیکن رابطہ نہ ہو سکا۔ کاروبار کے نقصان نے گھر میں تلخی کی فضا پیدا کر دی تھی اور میں نے پہلی بار امی اور والد کے درمیان کھچاؤ کی فضا محسوس کی' جس کا نتیجہ آئے دن کی تلخ گفتگو کی صورت میں ظاہر ہونے لگا۔ ہمارے گھر کے سامنے لدھیانے سے ایک خاندان آ کر آباد ہوا تھا' یہ سنار تھے' ان کا ایک لڑکا محبوب میرا ہم عمر تھا' مشن سکول میں پڑھتا تھا' شام کو کچھ دیر کے لئے اس سے گپ شپ ہو جاتی۔ ہمارا کھیل پٹھو گرم تھا' کچھ لڑکے جمع ہو جاتے تو ہم گلی میں جو سڑک جتنی چوڑی تھی' پٹھو گرم کر لیتے' مجھے یہیں تک جانے کی اجازت تھی' امی کی محبت نے مجھے قیدی کی طرح زنجیریں پہنائی ہوئی تھیں۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی مجھے آنکھوں سے اوجھل کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو سکول تک میرے ساتھ جاتیں اور سارا عرصہ کلاس روم کے باہر بیٹھی رہتیں۔ شام کو اس کھیل کے دوران بھی وہ سیڑھیوں پر بیٹھی مجھے دیکھتی رہتیں' کھیلنے کوئی نہ آتا تو میں اپنے گھر کی سیڑھیوں پر بیٹھا رہتا۔ اس گھر کی صورت یہ تھی کہ اوپر والے حصے کے لئے باہر سے بھی ایک سیڑھی جاتی تھی۔ دراصل یہ گوردوارہ تھا۔ نچلے حصے میں شاید کسی کی رہائش ہو گی۔ اوپر ایک چھوٹا کمرہ' اس کے آگے چھوٹا سا برآمدہ اور پھر پورے گھر پر ایک بڑا ہال کمرہ تھا جس میں سنگ مرمر کا ایک چبوترہ تھا' جس پر گنبد بھی تھا۔ جوگندر پال جب پنڈی آئے تو میرے یہاں ہی قیام کیا' ان کا بستر اسی ہال میں تھا۔ چھوٹے کمرے کے اوپر ایک اور چھوٹا کمرہ تھا اور اتنا ہی برآمدہ' ہال کی چھت اس کے برابر آتی تھی۔ جب ہم پنڈی آئے تو ہمیں یہی دو کمرے دیئے گئے۔ میں پہلی بار ہال میں داخل ہوا تو ایک عجب قسم کی پراسرار خاموشی نے مجھے اپنی بغل میں دبا لیا۔ ہال میں چاروں طرف فینسی روشنیاں اور چار پانچ فانوس تھے' سارے فرش پر کتابیں تھیں' میں نے دیکھا' عجب طرح کی زبان تھی' بعد میں معلوم ہوا کہ گرمکھی میں ہیں۔ بہت دنوں تک ہال کی یہی حالت رہی' پھر کتابوں کو سمیٹ کر دیواروں کے ساتھ لگا دیا گیا۔ ان کتابوں کو نیچے والوں نے زیادہ اور ہم نے ذرا کم ردی میں بیچا۔ اوپر والے چھوٹے کمرے میں ہم نے اپنا سامان رکھ دیا۔ نیچے والا سونے کا اور برآمدہ باورچی خانہ بن گیا۔ عبدالخالق کی زندگی میں ان کی کشادہ دلی کی وجہ سے جگہ کی تنگی کا احساس نہ ہوا' لیکن ان کے مرتے ہی خالہ کا رویہ بدل گیا' کچھ ان کی ضرورت' انہوں نے سب سے اوپر والا کمرہ خالی کرانا چاہا' امی نہ مانی ان کا کہنا تھا کہ سامان ہال میں

نہیں رکھا جا سکتا' بس اس سے ایک ایسی تلخی نے جنم لیا' جو ہمارے اس گھر کو چھوڑ کر گلستان کالونی میں آنے تک موجود رہی بلکہ کبھی تو اتنا بڑھ جاتی کہ روزانہ کی گفتگو بھی ختم ہو جاتی۔

سرینگر سے آنے کے بعد میری زندگی میں جو کمی آئی تھی وہ علیا چاچا کی تھی۔ شروع شروع میں تو میں انہیں یاد کر کے روتا رہتا تھا' رات کو مجھے نیند نہ آئی۔ امی کے پاس مشتری ہوتی' میں والد کے ساتھ سوتا' مجھے لگتا میں محبت کے سائبان سے محروم ہو گیا ہوں' بار بار علیا چاچا کا ذکر کرتا کہ وہ کب آئیں گے' امی کبھی تسلیاں دیتیں' کبھی میرے بار بار پوچھنے پر چڑ جاتیں اور ڈانٹ پڑتی' زیادہ ضد کرتا تو ایک آدھ تھپڑ بھی پڑ جاتا' اس دوران کشمیر کے حالات بہت خراب ہو گئے باقاعدہ لڑائی شروع ہو گئی اور پھر پنڈی سرینگر روڈ چکوٹھی کے مقام پر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ کشمیر ادھر رہ گیا' مسئلہ ہمارے پاس آ گیا۔ کچھ بے یقینی' کچھ ڈر اور کچھ اکلوتا ہونے کی وجہ سے امی کی گرفت مجھ پر بڑی سخت تھی' وہ جتنی محبت مجھ سے کرتی تھی اتنا ہی ان کا ملکیتی رویہ بڑھتا جاتا جس کی وجہ سے مجھے کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ مالی حالات کی وجہ سے والد گھر سے لاتعلق سے ہوتے جا رہے تھے' گھر میں امی' سکول میں استانیاں' بڑی استانی مبارک بانو کی شفقت بھی ضرورت سے زیادہ' چاروں طرف لڑکیاں' میری شخصیت دب کر رہ گئی۔ میں اپنی ذات کے اندر گھستا گیا' میری آزادی گھر کی سیڑھیوں تک محدود تھی۔ جہاں بیٹھے بیٹھے اداسی سے آنے جانے والوں کو دیکھتا رہتا۔ 1948ء کے ستمبر کی ایک شام میں اداسی کی بکل میں لپٹا سیڑھیوں پر بیٹھا تھا کہ دو شخص باتیں کرتے گزرے۔ معلوم ہوا کہ قائداعظم مر گئے ہیں۔ میں نے رونا شروع کر دیا' مجھے اب تک معلوم نہیں ہو سکا کہ اس رونے کے پیچھے کیا جذبہ تھا۔ بس میں بے اختیار روئے جا رہا تھا' ایک عورت پاس سے گزری' مجھے روتے دیکھ کر رک گئی' پاس آئی اور بولی بچے کیا بات ہے کیوں رو رہے ہو؟

میں نے ہچکی بندھی آواز میں کہا'' قائداعظم مر گئے ہیں'' اسے شاید مری بات سمجھ نہ آئی' کچھ دیر تک دیکھتی رہی اور پھر بولی...... ''تمہارے کیا لگتے تھے؟''

میں کچھ نہ بولا' بولتا بھی کیا' بس روتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد آواز پڑی' آنسو پونچھتا ہوا اوپر گیا...... ''امی قائداعظم مر گئے''۔ ''ہاں مجھے معلوم ہے'' انہوں نے بغیر کسی تاثر کے کہا...... ''چلو سکول کا کام کرو۔'' قائداعظم کی رحلت کے بعد سیاسی نظام کی ابتری کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ آج تک جاری ہے' قائداعظم نے 22 اگست 1947ء کو سرحد میں ڈاکٹر خان کی اسمبلی کو برطرف کر دیا' لیکن بعد والوں نے اسے معمول بنا لیا۔ قائداعظم کے بعد خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل بنے' وہ طبعاً شریف اور ڈھیلے آدمی تھے۔ اس لئے اختیار کی مرکزیت لیاقت علی خان کے ہاتھ میں آ گئی۔ لیاقت علی خان نے نئے سیاسی نظام کی جو اخلاقیات مرتب کیں وہ ہمیشہ کے لئے ہمارا مقدر بن گئیں۔ یہ وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے مہاجر مقامی کا جھگڑا کھڑا کیا اور یوں علاقائی عصبیت کی بنیاد رکھی۔ 1949ء میں پنجاب میں نواب ممدوٹ کی وزارت کو برطرف کر کے سیاسی شطرنج کی سمت متعین کر دی۔ لیاقت علی خان ہی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مسلم لیگ میں وزیراعظم اور صدر کے عہدے کو ایک کر کے وزارت عظمیٰ کے ساتھ مسلم

لیگ پر ذاتی گرفت مضبوط کر لی۔ لیاقت علی خان کے دور وزارت میں بدلیاتی الیکشن ہوئے۔ کشمیری بازار میں تحصیل کے دفتر میں عورتوں کا پولنگ بوتھ تھا۔ امی اپنا ووٹ ڈالنے گئیں تو مجھے ساتھ لے گئیں۔ اندر ایک ہنگامہ تھا۔ امی نے مجھے باہر کھڑا کر دیا اور ووٹ ڈالنے اندر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد واپس آئیں اور بتایا کہ ان کا ووٹ تو پہلے ہی ڈالا جا چکا ہے اور اندر قصائی گلی کی طوائفوں کا قبضہ ہے۔ مسلم لیگ نے طوائفیں اور غنڈے جمع کر کے پولنگ بوتھوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ دس بجے کے لگ بھگ الیکشن کے بائیکاٹ کا اعلان ہو گیا اور ساری مخالف جماعتوں نے زبردست نعرے بازی کے بعد جلوس نکالا۔ جلوس فوارہ چوک میں پہنچ کر جلسہ کی صورت اختیار کر گیا۔ امی مجھے لے کر گھر آ گئیں۔ اس پہلے الیکشن میں مسلم لیگ نے جس دھاندلی کی بنیاد رکھی وہ روایت ابھی تک قائم ہے۔ مسلم لیگ نے ملک ضرور بنایا لیکن اس کی بربادی کی بنیاد بھی اسی جماعت نے رکھی اور اس کی بنائی ہوئی روایتوں کا مزہ ہم ابھی تک چکھ رہے ہیں۔ اس جماعت کو 14 اگست کی رات کو جو فیصلے کرنا چاہئے تھے وہ آج تک نہ ہو سکے۔

ایک عرصہ تک یہ تاثر رہا ہے کہ جنرل گریسی نے جو پہلے کمانڈر انچیف تھے قائداعظم کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کشمیر میں مداخلت سے انکار کر دیا تھا۔ حال ہی میں سکندر مرزا کے بیٹی کی یادداشتیں چھپی ہیں جن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ جنرل گریسی نے کشمیر پر قبضہ کرنے کے لئے ایک منصوبہ بنایا تھا۔ یہ منصوبہ انہوں نے سکندر مرزا کے ذریعے جو اس وقت سیکرٹری تھے لیاقت علی خاں کو پیش کیا تا کہ وہ قائداعظم سے اس کی منظوری لیں لیکن لیاقت علی خان نے اس منصوبہ کو دبا لیا۔ اسلم بیگ جن دنوں آرمی چیف تھے 1948ء کی جنگ کشمیر کے حوالے سے تین سیمینار ہوئے' جن کا مقصد ان غلطیوں اور خامیوں کا اندازہ لگانا تھا جو اس جنگ میں سرزد ہوئیں۔ یہ تو ظاہری مقصد تھا ممکن ہے پس پردہ کچھ اور باتیں بھی ہوں۔ بہرحال یہ سیمینار آئی ایس پی آر کے زیراہتمام ہوئے۔ میں ان میں سے دو میں شریک ہوا۔ دوسرے سیمینار میں جو مظفر آباد میں ہوا' میرے ساتھ ایوب مرزا اور جلیل عالی بھی تھے۔ سیمینار میں غلام عباس کے سیکرٹری نے سٹیج پر آ کر بتایا کہ غلام عباس جنگ میں شدت چاہتے تھے' وہ اس سلسلے میں قائداعظم سے ملے اور انہوں نے قائداعظم کو قائل کر لیا کہ پاکستانی فوج کو کشمیر میں براہ راست مداخلت کر کے سرینگر پر قبضہ کر لینا چاہئے۔ میٹنگ میں طے ہوا کہ آئندہ چوبیس گھنٹوں میں اس پر عمل کیا جائے گا' لیکن اڑتالیس گھنٹوں بعد بھی جب کوئی پیش رفت نہ ہوئی تو غلام عباس نے دوبارہ رابطہ کیا' معلوم ہوا کہ قائداعظم نے تو احکامات صادر کر دیئے تھے' لیکن درمیان میں کسی نے انہیں دبا لیا' یہاں تک کہ بھارتی فوجیں سرینگر کے اڈے پر اتر گئیں۔ یہ ''درمیانی سلسلے'' پاکستان بننے کے فوراً بعد ہی وجود میں آ گئے تھے۔

لیاقت علی خان کی کشمیر پالیسیوں سے اختلاف کرتے ہوئے جنرل اکبر کی سرکردگی میں چند فوجی افسروں نے جو لائحہ عمل اختیار کرنے کی کوشش کی وہ ''پنڈی سازش کیس'' کے نام سے مشہور ہے۔ اسی سال یعنی پنڈی کیس کے فوراً بعد ترقی پسند تحریک اور انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندیاں عائد کر کے بنیادی انسانی حقوق کی

خلاف ورزی کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اسی دوران اگرچہ لیاقت علی خان نے نہرو کو مکا دکھا کر اپنے خلاف لگائے گئے ان الزامات کو کہ ان کا جھکاؤ بھارت کی طرف ہے' رد کرنے کی کوشش کی لیکن یہ مکا ہوا ہی میں لہراتا رہ گیا۔
16 اکتوبر 1951ء کو لیاقت باغ میں جو اس وقت تک کمپنی باغ کہلاتا تھا وہ جلسہ ہوا جس میں لیاقت علی خان سید اکبر کی گولی کا نشانہ بن گئے۔ میری عمر اس وقت گیارہ سال اور چھوٹی بہن مشتری کی پانچ سال تھی۔ ہم دونوں بہن بھائی گھر سے نکلے تو ہمارے پاؤں میں اسفنج کی چپلیں تھیں۔ لوگ جوق در جوق کمپنی باغ کی طرف جا رہے تھے۔ لگتا تھا ایک میلہ سا ہے۔ ہم دونوں بھی لوگوں کے ساتھ ساتھ کمپنی باغ پہنچ گئے۔ جلسہ ابھی شروع نہیں ہوا تھا' ہم دونوں بہن بھائی آہستہ آہستہ چلتے سٹیج کے قریب آ گئے۔ دوسری یا تیسری قطار میں پھنس پھنسا کر بیٹھ گئے۔ لیاقت علی ابھی نہیں آئے تھے اور دوسرے مقررین کی تقریریں جاری تھیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ جلسہ گاہ میں آ گئے' سٹیج سے اعلان ہوا کہ اب وہ تقریر کریں گے۔ مائیک پر آ کر ابھی انہوں نے برادران ملت ہی کہا تھا' ملت کی ت ابھی ان کی زبان پر ہی تھی کہ سب سے اگلی قطار سے ایک شخص کھڑا ہوا تڑ تڑ کی دو یا تین آوازیں آئیں۔ جلسہ میں بھگدڑ مچ گئی۔ کمپنی باغ کے میدان کے وسط میں جگہ نیچی ہے اور دونوں کنارے اونچے ہیں۔ ہم نیچے والے حصے میں تھے۔ بھگدڑ مچی تو ہم بھی بھاگے' لیکن کنارے کے ساتھ لگ کر گر گئے۔ لوگ ہمارے اوپر سے گزرنے لگے۔ یوں لگا ہمارا دم گھٹ رہا ہے' بس اتنا یاد ہے کہ ایک پٹھان ہمارے اوپر جھک گیا اور چیختے ہوئے بولا......''او خنزیر کے بچو! ان معصوم بچوں کو مت کچلو'' معلوم نہیں کیسے اس نے ہم دونوں بہن بھائیوں کو وہاں سے نکال کر اوپر کیا۔ پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ ہم فوارہ چوک کی طرف بھاگے۔ لیاقت روڈ پر ایک عجب افراتفری تھی۔ اس دوران میں نے ایمبولینس کا سائرن سنا جو مری روڈ کی طرف مڑ رہی تھی' شاید لیاقت علی کو سی ایم ایچ لے جایا جا رہا تھا۔ فوارہ چوک تک دوڑتے دوڑتے ہمارا برا حال ہو گیا۔ پاؤں ننگے' چپلیں میدان ہی میں رہ گئی تھیں' برے حالوں گھر پہنچے تو امی نے آڑے ہاتھوں لیا۔' بہن کو تو کیا کہنا تھا ساری ڈانٹ مجھے پڑی۔ تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ لیاقت علی خان شہید ہو گئے ہیں۔

لیاقت علی خان کے بعد خواجہ ناظم الدین وزیراعظم بنے۔ وہ طبعاً کمزور شخص تھے۔ وزیر خزانہ غلام محمد نے گورنر جنرل کا منصب سنبھال لیا۔ 19 اپریل 1953ء کو انہوں نے ناظم الدین کو استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا اور کچھ عرصہ بعد 24 اکتوبر 1954ء کو قومی اسمبلی برطرف کر دی۔ اس سے پہلے 29 مئی 1954ء کو مشرقی پاکستان اسمبلی کو گورنر کے ماتحت کر کے سکندر مرزا کو گورنر بنا دیا گیا۔ مولوی تمیز الدین نے جو اس وقت قومی اسمبلی کے سپیکر تھے عدالت میں غلام محمد کے حکم کو چیلنج کیا لیکن جسٹس منیر نے نظریہ ضرورت کی اصطلاح تلاش کر کے یہ اپیل خارج کر دی جبکہ ہائیکورٹ کے جسٹس کارنیلس اسے منظور کر چکے تھے۔ نظریہ ضرورت کی اس اصطلاح نے بعد میں ہر مارشل لاء کو قانونی جواز دینے کی راہ ہموار کر دی۔ غلام محمد نے لیاقت علی خان کے آمرانہ نظام کو مزید آمرانہ اور شخصی بنا دیا۔ یہ شخص تو تلا تھا' اسی دوران اس پر فالج کا حملہ ہو گیا جس کی وجہ سے زبان میں مزید لکنت آ گئی۔ اس

کی بات صرف دو شخص سمجھتے تھے ایک اس کی جرمن گورنس' دوسرے قدرت اللہ شہاب جو اس کے سیکرٹری تھے۔ اب یہ بات بہت سارے لوگوں نے لکھی ہے کہ ایوب خان جو کمانڈر انچیف بن چکے تھے' جو چاہتے تھے وہ کہلوا لیتے یعنی ان کی منشا و مرضی کے مطابق جرمن گورنس اور شہاب کہتے کہ گورنر جنرل یہ چاہتے ہیں یا یہ ان کا حکم ہے۔ امریکی مداخلت شروع ہو چکی تھی اور سی آئی اے کی تائید سے ایوب خان مارشل لاء لگانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ شاید اس عمل میں کچھ دیر لگتی لیکن خان عبدالقیوم خان کے جلوس نے سیاسی شاطروں کو چوکنا کر دیا۔ ان کے والہانہ استقبال سے مستقبل کا سیاسی نقشہ واضح ہو گیا چنانچہ 1958ء میں پہلا مارشل لاء پاکستان کا مقدر ہوا۔ میں اس وقت اٹھارہ سال کا تھا۔

اس مارشل لاء کے بارے میں لوگوں کو کچھ پتہ نہ تھا' شاید بہت سوں کو اس کا مفہوم بھی معلوم نہیں تھا۔ لوگ آئے دن کی بدلتی حکومتوں سے بددل تھے چنانچہ یہ سمجھا گیا کہ مارشل لاء ان کے مسائل حل کر دے گا۔ اس زمانے میں اکثر چیزیں راشن سے ملتی تھیں اور عموماً بلیک ہوتی تھیں۔ مارشل لاء نے ذخیرہ اندوزی پر زد لگائی۔ دکانوں پر لائنیں لگ گئیں۔ راجہ بازار میں ایک لمبی قطار میں کھڑے ہو کر میں نے بھی ایک الارم والی گھڑی خریدی جو کئی سال ہمارے پاس رہی۔ امی نے بھی قطار میں کھڑے ہو کر ایک ریشمی سوٹ لیا۔ پاکستانی بہت سیدھے ہیں۔ وقتی طور پر ملاوٹ کے خاتمے' ذخیرہ اندوزی میں کمی ہی پر خوش ہو گئے' ملاوٹ کرنے والوں نے خوف سے لئی کے کنارے نقلی چیزوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ ان میں خاص طور پر مرچیں' ہلدی اور چائے شامل تھی۔

اس دوران بلکہ اس سے بہت پہلے ہمارے گھر کے حالات بہت خراب ہو گئے تھے دوکان بند ہو گئی۔ امی کے چھوٹے زیور بیچ کر گزارہ ہوتا۔ ہر دفعہ زیور بکتے ہوئے ان کی اور والد کی لڑائی ہوتی۔ کئی کئی دن گھر کی فضا میں عجب طرح کا بوجھل پن پر پھیلائے بیٹھا رہتا۔ یہ لڑائیاں تو اب روز کا معمول تھیں۔ اس دوران میری ایک اور بہن شاہین پیدا ہو گئی۔ اب ہماری صورت یہ تھی کہ والد اور امی کے علاوہ میں اور تین بہنیں گویا چھ افراد اور آمدنی کا ذریعہ ایک بھی نہیں۔ امی کے مزاج کی تلخی روز بروز بڑھتی گئی۔ اس دوران میں ایک دفعہ غیر متوقع طور پر علیا چاچا نے سرینگر سے کسی ذریعے سے کچھ رقم بھجوا دی' وقتی سہارا تو مل گیا لیکن ان پیسوں کے ختم ہوتے ہی پھر کسی زیور کے بکنے کی باری آ گئی۔ اب کسی نہ کسی طرح سال چھ ماہ میں علیا چاچا کا خط آ جاتا' وہ مجھے ملنے اور دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ میرے ذہن میں اب ان کا ہیولہ دھندلا پڑنے لگا تھا۔ جیسے جیسے امی اور والد کے تعلقات میں کشیدگی بڑھ رہی تھی' امی کی گرفت مجھ پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی' شاید ان کے لاشعور میں یہ تھا کہ اب میں ہی ان کا ایک سہارا ہوں۔ والد نے ہال میں سونا شروع کر دیا تھا' امی اور ان میں کئی کئی دن بات نہ ہوتی۔ مجھے وہ ساتھ والی چارپائی پر سلاتیں اور رات کو کئی بار ہاتھ لگا کر دیکھتیں کہ میں موجود ہوں یا نہیں۔

اسی دوران معلوم ہوا کہ مظفر آباد میں قالینوں کی ایک سرکاری فیکٹری قائم کی جا رہی ہے۔ معراج الدین جو اس فیکٹری کے نامزد منیجر تھے والد کو سرینگر سے جانتے تھے' وہ تلاش کرتے ہوئے ہمارے گھر آئے اور

والد کو ساتھ لے گئے۔ ہم نے پہلی بار ان کی جدائی کو محسوس کیا۔ گھر میں تنگی کی فضا کم ہوگئی۔ والد مظفر آباد سے ہر مہینے کچھ نہ کچھ بھیج دیتے لیکن یہ سلسلہ زیادہ عرصہ نہ چلا' دو چار سالوں میں ہی فیکٹری کے کیشیئر نے ایک لمبا غبن کیا' اور بھاگ گیا۔ اس کے بعد دو ایک سال فیکٹری اور چلی لیکن اتنے گھاٹے میں کہ ملازمین کو مہینوں تنخواہ نہ ملتی۔ گھر میں وہی صورت پیدا ہوگئی۔ امی کا دکھ غصہ کی صورت میں ہم پر برستا۔ انہوں نے بڑے اچھے دن دیکھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ماں باپ کی سب سے چھوٹی بیٹی تھیں۔ اس لئے گھر کا سارا کنٹرول ان کے ہاتھ میں تھا۔ نانا خاصے خوشحال تھے۔ شادی ہو کر سری نگر آئیں تو کوئی مداخلت کرنے والا نہیں تھا۔ پیسے کی ریل پیل تھی' اب ایک ایک پیسے کو ترستی تھیں۔ گھر کے حالات' امی کی تختی کی وجہ سے میرا دل پڑھائی سے اچاٹ ہوگیا اور میں ایک دن گھر سے بھاگ کر مظفر آباد کی بس میں بیٹھ گیا۔

گھر سے بھاگنے کی بڑی اور ایک ہی وجہ گھر کے حالات تھے۔ چیزیں بیچ بیچ کر کب تک گزارا ہوتا۔ زیور تقریباً سارا بک گیا تھا۔ مجھے جیب خرچ کے لئے کچھ نہیں ملتا تھا۔ ڈینیز ہائی سکول گھر سے چار پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ پیدل جانا اور پیدل آنا' آدھی چھٹی کے وقت میرے ہم جماعت کنٹین کا رخ کرتے تو میں حسرت سے انہیں دیکھتا۔ برن ہال کے زمانے میں' امی صبح زبردستی میرے بستے میں مٹھائیاں اور طرح طرح کی چیزیں رکھ دیتیں۔ میں ایک آدھ شے لیتا اور باقی اسی طرح واپس آجاتیں' اب یہ حال تھا کہ سکول کے دوران پانی کے سوا مکھی تک منہ میں نہ جاتی۔ معلوم نہیں کیسے' مجھے گھر کے برتن چوری کر کے بیچنے کی عادت پڑ گئی۔ اس زمانے میں گھروں میں پیتل اور تانبے کے برتن استعمال ہوتے تھے۔ میں کوئی پلیٹ' کبھی چمچ کبھی کوئی اور چھوٹی موٹی چیز چھپا لیتا۔ صرافہ بازار کے آخر میں برتنوں کی دکانیں تھیں' وہ تول کر یہ چیزیں خرید لیتے۔

امی کو کسی طرح پتہ چل گیا۔ انہوں نے مجھے اتنا مارا کہ جسم پر نیل پڑ گئے۔ پھر خود بھی رونے لگیں۔ ساری رات مجھے تھپتھپاتی رہیں اور روتی رہیں' ان کے تصورات کا تاج محل یوں برباد ہو رہا تھا معلوم نہیں انہوں نے میرے لئے کیا کیا سوچ رکھا تھا اور میں ..... میں ایک معمولی چور بن گیا تھا۔ وقتی طور پر میں ماں کے آنسوؤں سے بڑا متاثر ہوا اور میں نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی یہ کام نہیں کروں گا' لیکن اپنے ہم جماعتوں کو خرچ کرتے دیکھ کر میں اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکا۔ امی نے چھوٹی چھوٹی چیزیں چھپا کر رکھنا شروع کر دیں' میں بالکل ہی بے بس ہوگیا' اس بے بسی نے میرے اندر ایک شدید ردعمل پیدا کیا۔ میں نے ایک بڑا سا پتیلا اٹھا لیا۔ ہمارے گھر کے پچھواڑے کھیت تھے۔ میں نے پتیلا ایک کپڑے میں باندھا اور اوپر سے نیچے پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں چپکے سے نیچے اترا اور پتیلا لے کر کھیتوں میں سے ہوتا ہوا صرافہ بازار پہنچا۔ مجھے یاد ہے اس زمانے میں اس پتیلے کے دس روپے ملے جو بڑی رقم تھی۔ رات تو خیریت سے گزر گئی۔ صبح امی کو کسی ضرورت کے لئے پتیلے کی تلاش ہوئی۔ میرا رنگ اڑ گیا انہیں ایک لمحے میں احساس ہوگیا کہ یہ کام میں نے کیا ہے وہ مجھ پر جھپٹیں۔ میں بازو چھڑا کر سیڑھیوں کی طرف بھاگا اور سیدھا مظفر آباد والی بس میں جا بیٹھا۔ مظفر آباد چھوٹی سی جگہ تھی۔ تھوڑی دیر میں' میں

قالینوں کی فیکٹری میں جا پہنچا۔ والد مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے' لیکن انہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا نہیں۔ کہنے لگا...... ''کھانا کھایا ہے؟''

میں نے کہا...... ''نہیں۔''

انہوں نے بازار سے کھانا منگوایا۔ دو تین دن ایسے محسوس ہوا جیسے جنت میں آ گیا ہوں۔ پھر انہوں نے فیکٹری کے ایک ملازم کے ساتھ مجھے پنڈی واپس بھجوا دیا۔ گھر پہنچا تو امی نے خلاف معمول کچھ نہ کہا۔ مجھے دیکھ کر رونے لگیں' اس وقت میں ان کے رونے کی وجہ نہیں سمجھتا تھا بلکہ الٹا غصہ آتا تھا' لیکن اب جب میں ان کی عمر میں پہنچ گیا ہوں مجھے اس رونے کے معنی بھی سمجھ آ رہے ہیں اور اس دکھ کا احساس بھی ہو رہا ہے جس سے وہ گزر رہی تھیں۔ چند دن بعد پھر وہی صورت پیدا ہو گئی۔ امی کے پاس تھا کیا جو مجھے دیتیں اور میرا یہ حال کہ فلمیں دیکھنا چاہتا' نئی نئی کاپیاں اور پنسلیں لینا چاہتا' سکول کنٹین میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ سموسے کھانا چاہتا مگر...... ''پھر وہی کام شروع ہو گیا۔'' پکڑا جاتا' مار پڑتی' میں بھی روتا تکلیف کے مارے اور امی روتیں' ان کا دکھ ان کے اندر تھا۔ ایک ہی بیٹا جوان کی کل کائنات تھا' برباد ہوا جا رہا تھا۔ وہ پڑھی لکھی نہ تھیں' نفسیات سے واقف نہ تھیں۔ ان کے نزدیک برائی کو طاقت سے روکنا ہی ایک علاج تھا اور میرے اندر اس طاقت کے خلا ایک بغاوت پیدا ہو رہی تھی ایک نہ ختم ہونے والی نفرت جنم لے رہی تھی۔

اس طرح کے کچھ چھوٹے چھوٹے دریچے تھے جن سے زندگی کے مختلف منظر کبھی کبھار دکھائی دے جاتے ورنہ اندر باہر وہی ایک موسم تھا' دکھ اور مصیبت کا' مظفر آباد کی فیکٹری بند ہو گئی۔ والد واپس آ گئے گھر کی تلخیوں میں اضافہ ہو گیا۔ والد کو حقہ پینے کی عادت تھی' دو آنے روز تمباکو کے لئے درکار تھے۔ امی سے جب بھی مانگتے تکرار ہوتی کہ ان کے نزدیک یہ کھلی عیاشی تھی۔ مجھے بہت برا لگتا اور والد پر ترس آتا لیکن میں کیا کر سکتا تھا۔ تنگ آ کر والد نے لاہور جانے کا ارادہ کر لیا' وہاں قالینوں کا کاروبار پنپ رہا تھا۔ والد لاہور جانے کی تیار کر رہے تھے کہ ایک غیر متوقع بات ہوئی۔ ایک شام گھر کی فضا ابر آلود تھی کہ علیا چاچا آ گئے۔ امی کو یہ فکر کہ سری نگر کا گھر کس کے سپرد کر آئے لیکن علیا چاچا نے ایک ہی جواب دیا کہ میں آپ سب کے بغیر وہاں نہیں رہ سکتا تھا اس لئے سب کچھ اسی طرح چھوڑ آیا ہوں۔ امی سخت ناراض ہوئیں لیکن والد نے کہا تم نے بالکل ٹھیک کیا ہے۔ علیا چاچا پھر گھر کے فرد بن گئے۔ چند دنوں بعد والد لاہور چلے گئے علیا چاچا نے کچھ دیر ملازمت تلاش کرنے کی کوشش کی۔ ان کی طالب نویسی کی بھی یہاں کوئی گنجائش نہ تھی۔ ملازمت کی بھی کوئی صورت نہ تھی' ہمارے محلے میں ایک چودھری صاحب رہتے تھے۔ ان کے ٹرک چلتے تھے۔ انہیں ایک ایسے با اعتبار کلینر کی ضرورت تھی جو انہیں ڈرائیور کی کارکردگی سے باخبر رکھے' علیا چاچا کلینر بن گئے۔ ہفتہ ہفتہ بھر ٹرک کے ساتھ رہتے' ایک آدھ دن پنڈی میں گزرتا تو گھر آتے اور ٹرک میں جو سامان لادا جاتا اس میں سے گھر کے لئے کچھ نہ کچھ نکال لاتے۔ موسمی میوے انہوں نے ہمیں خوب کھلائے۔ پہلی تنخواہ ملی تو سیدھے آ کر امی کے ہاتھ پر رکھی' یوں گھر کی گاڑی پھر آہستہ آہستہ

چل پڑی اور قدرے سکون ہو گیا۔

لاہور میں والد نے بہت برا وقت گزارا۔ ایک بار انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ کئی کئی دن فاقہ کرتے۔ انارکلی کے باہر لاہوری سرکلر روڈ پر دائیں طرف ایک ہوٹل ہے۔ جہاں پنجابی شاعر بیٹھتے تھے۔ یہاں ان کے کئی شاگرد بن گئے۔ جو ان سے پنجابی شاعری میں اصلاح لیتے تھے۔ ان میں ایک ساگر تھے جو ڈاک خانے میں ملازم تھے۔ یہ سارے لوگ شام کو اکٹھے ہوتے تو والد کو دو تین پیالے چائے مل جاتی' مہینوں انہوں نے صرف اسی چائے پر گزارا کیا' کہتے تھے کبھی ایک بنڈل مل جاتا تو عیاشی ہو جاتی لاہور میں ان کی ایک بہن بھی رہتی تھی۔ میرے ماموں اور دو خالاؤں کے گھر بھی تھے لیکن ان کی غیرت نے ایک وقت کے لئے بھی کسی کے گھر جانا گوارا نہ کیا۔ اسی دوران شاہدرہ میں قالین سازی کا ایک کارخانہ قائم ہو گیا۔ انہیں وہاں ڈیزائنر کی جگہ مل گئی اور وہ کارخانے کے قریب ہی شاہدرہ میں منتقل ہو گئے۔ مجھے معلوم نہیں یہاں ان کی تنخواہ کتنی تھی لیکن گھر وہ کبھی کبھار ہی کچھ بھیجتے۔ امی لاہور جاتیں تو ہم لوگ ماموں یا خالہ کے یہاں ہی قیام کرتے۔ امی کچھ دیر کے لئے شاہدرہ آتیں جہاں والد ایک کوارٹر میں رہ رہے تھے۔ دونوں کے تعلقات میں نامحسوس دوری پیدا ہو گئی تھی۔

علیا چاچا کی وجہ سے فاقوں کی نوبت تو ٹل گئی لیکن امی حالات سے سمجھوتہ نہ کر سکیں۔ ان کے مزاج میں ایک عجب طرح کی تلخی آ گئی تھی۔ میرے ساتھ تو جو ہوتا' علیا چاچا بھی اس کی زد سے باہر نہ تھے۔ وہ انہیں بھی بری طرح ڈانٹتیں۔ میرا کہیں آنا جانا بالکل بند کر دیا گیا تھا۔ صرف سیڑھیوں میں بیٹھنے کی اجازت تھی انہی دنوں پانی کی قلت ہو گئی۔ گھروں کے کنوؤں میں پانی کم ہونے لگا۔ کنواں نچلے حصے میں تھا جس پر دو ہینڈ پمپ لگے ہوئے تھے۔ ایک نیچے ایک اوپر' نیچے پانی کھینچا جاتا تو اوپر آنا بند ہو جاتا۔ نیچے والوں سے تعلقات بہت خراب تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح ہم اوپر والا حصہ خالی کر دیں تو وہ پورے گھر پر قابض ہو جائیں۔

پینے کے پانی کا مسئلہ تھا۔ ہمارے گھر سے دو چار گھر آگے سرکاری نل تھا جہاں سے سبھی پانی بھرتے تھے۔ وہاں سے تین چار بالٹیاں لانے کی ذمہ داری میری بھی ہو گئی۔ آس پاس کے گھروں کے کئی لڑکے اور لڑکیاں وہاں سے پانی بھرتے تھے۔ ساتھ والی گلی میں ایک تحصیل دار رہتے تھے ان کی لڑکی بھی پانی بھرنے آتی تھی۔ معلوم نہیں کیسے ہم دونوں میں ایک خاموش رابطہ قائم ہو گیا جو تادیر چلتا رہا۔ ایک دن میں نے ایک خط لکھا اور بالٹی اٹھاتے اٹھاتے اس کے ہاتھ میں رتھما دیا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا' لیکن کسی طرح امی کو معلوم ہو گیا۔ اس بار انہوں نے ڈنڈے سے میری مرمت کی۔ باہر جانا بند ہو گیا' پانی لینے وہ خود جانے لگیں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے تحصیل دار کے گھر جا کر لڑکی کو ڈانٹا اور اس بے چاری کا نکلنا بھی بند کرا دیا۔ ایک طرف ان کی سختی کا یہ حال تھا کہ مجھے نظر اٹھانے کی ہمت نہ تھی اور دوسری طرف یہ کہ ہانڈی میں سے سب سے پہلے میرے لئے سالن نکالا جاتا۔ کسی کو انڈا نہ ملتا تھا لیکن ہفتہ میں دو ایک بار مجھے ضرور مل جاتا۔ علیا چاچا کی قلیل تنخواہ میں بمشکل دو وقت کی روٹی چلتی' شروع میں ہمارے حصے میں بجلی بھی نہ تھی نیچے والوں نے اپنا میٹر الگ کروا کے ہماری بجلی کٹوا دی تھی ہم

لالٹین جلاتے تھے' علیا چاچا نے کچھ پیسے بچا کر میٹر لگوایا تو گھر میں جیسے سورج اتر آیا۔ امی کی possive محبت میں شدت آتی جا رہی تھی اور میرے مزاج کا چڑچڑا پن اتنا ہی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ پڑھائی سے میری دلچسپی واجبی سی رہ گئی تھی۔ میں ایک بار پھر گھر سے بھاگ کر بغیر ٹکٹ ٹرین میں بیٹھا اور شاہدرہ پہنچ گیا۔ والد نے حسب معمول کچھ نہ کہا۔ دو چار دن خوب کھلایا پلایا پھر کسی کے ساتھ واپس پنڈی بھجوا دیا۔ میٹرک کے امتحان سر پر آ گئے۔ میں نے بے دلی سے پرچے دیئے اور تھرڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ صرف ایک نمبر سے سیکنڈ ڈویژن رہ گئی۔ اس دوران کشمیریوں کے کلیموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ علیا چاچا نے اپنا کلیم داخل کیا لیکن والد نے کلیم داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح وہ یہاں کے شہری بن جائیں گے۔ انہیں آخر دم تک یہی آس رہی کہ وہ کسی نہ کسی دن ضرور واپس جائیں گے۔

فسٹ ایئر میں مجھے گورنمنٹ کالج اصغر مال میں داخلہ مل گیا۔ امی کا فلسفہ یہ تھا کہ بچے کو ایک پیسہ بھی جیب خرچ کے لئے نہیں دینا چاہئے۔ لیکن دوسری طرف وہ پیسہ پیسہ بچا کر میرے لئے کھانے پینے کی اچھی سے اچھی اور میری پسند کی چیز خرید لیتیں۔ سب سے پہلے میں کھانا کھاتا' علیا چاچا گھر میں ہوتے تو پھر ان کا نمبر آتا۔ اس کے بعد بہنیں اور جو بچ جاتا اس پر خود گزارا کرتیں۔ میں نے انہیں اکثر روٹی سے پتیلی صاف کرتے ہی دیکھا۔ معلوم نہیں وہ شروع ہی سے ایسی تھیں یا حالات نے انہیں اتنا سنک کر دیا تھا کہ انہیں ہر چیز کا منفی پہلو ہی نظر آتا' ایک شک مستقلاً ان کے مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ میں پیدل کالج جاتا تھا اور کنٹین کو دور سے دیکھتا تھا۔ امی کی شدت پسندی کے ردعمل میں میرا اکھڑ پن بھی بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ایک بار دو ماہ کی فیس اکٹھی جمع کرانا تھی۔ امی نے انگوٹھی بیچ کر پیسے اکٹھے کیے۔ میں نے فیس کالج میں جمع کرانے کی بجائے اسے ادھر ادھر خرچ کر دیا۔ دو ایک مہینے اسی طرح گزر گئے۔ اس کے بعد میرا نام کٹ گیا۔ کچھ عرصہ معاملہ یوں چھپا رہا کہ میں روزانہ کالج کے لئے گھر سے نکلتا اور ادھر ادھر مارا مارا پھر کر وقت پر گھر آ جاتا۔ آخر کب تک' امی کو معلوم ہو گیا۔ بہت روئی پیٹی مگر اتنے مہینوں کی اکٹھی فیس جمع کرانے کی کوئی سبیل نہ بنی۔ میرے تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

ایک دن کسی بات پر امی نے مجھے خوب مارا میں بازو چھڑا کر نیچے بھاگ آیا اور لیاقت باغ میں آ کر ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ایک شخص میرے قریب آیا اور بولا......"نوکری کرو گے۔"

میں نے کہا......"جی۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کا گھر لیاقت باغ کے سامنے ہی تھا۔ گھر جا کر پہلے تو اس نے مجھے روٹی کھلائی پھر کہنے لگا......"ہمیں بھینس کی دیکھ بھال کے لئے ایک ملازم کی ضرورت ہے' یہ کام کر لو گے۔"

میں نے کہا......"کر لوں گا۔"

بھینس کی دیکھ بھال میرے بس میں کہاں تھی۔ دو ہی دن میں میرا حشر ہو گیا۔ اس دوران امی بھی ڈھونڈتے ڈھونڈتے آ پہنچیں اور مجھے ساتھ لے گئیں۔ چند دن بے کاری میں گزرے۔ پھر ہمارے ایک عزیز نے

جو گنج منڈی میں کریانہ کی دکان کرتے تھے مجھے پاس کی ایک دکان پر تیس روپے ماہوار پر منشی رکھوا دیا۔ یہاں میں نے ڈیڑھ سال کام کیا۔ میرا کام کیش بل بنانا' حساب رکھنا اور شام کو ادھار اکٹھا کرنا تھا' ہاتھ میں پیسے آئے تو دنیا بدل گئی۔ میں ہر ہفتے ایڈوانس لے لیتا۔ مہینہ کے آخر میں کچھ بھی نہ بچتا۔ ای روتی جھنجھتی' یہ شاید کوئی انتقامی جذبہ تھا جوان کی بے پناہ محبت کا ردعمل تھا' ایک علیا چاچا تھے وہ ٹرک پر کلینزی کر رہے تھے اور مہینے کے مہینے اپنی ساری تنخواہ امی کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیتے تھے۔ ان کی عظمت کا احساس اس وقت مجھے کہاں تھا؟

اسی دوران ہمارے ایک دور کے عزیز پی ڈبلیو ڈی کی ایک برانچ میں ایس ڈی او بن کر آ گئے اس برانچ کا کام یہ تھا کہ ہندوؤں کی اوقاف کے تحت جو گھر آتے تھے۔ ان کی مرمت کرائی جاتی۔ یہاں ورک چارج یعنی دیہاڑی داروں کی ضرورت تھی۔ انہوں نے مجھے بھی ایک اوورسیئر کے ساتھ لگا دیا۔ میرا کام ٹھیکہ دار کے کام کی نگرانی کرنا اور یہ دیکھنا تھا کہ مصالحہ صحیح تناسب سے استعمال ہوتا ہے کہ نہیں۔ ہمارا دفتر پلازہ سینما کے پچھواڑے میں تھا۔ یہیں میری ملاقات پہلی بار منشا یاد سے ہوئی۔

میں ایک دن دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک پینڈو جس کے ہاتھ میں ٹین کا بکسہ تھا اندر داخل ہوا۔ یہ منشا یاد تھا۔ اس نے سول انجینئرنگ کی تھی۔ لیکن دفتر میں اوورسیئر کی جگہ نہ تھی اس لئے اسے ورکس انسپکٹر کے طور پر پنڈی بھیجا گیا تھا۔ میں نے اسے بٹھایا' چائے منگوائی۔ معلوم ہوا کہ پنڈی میں اس کا کوئی آشنا نہیں۔ دو چار دن کے لئے دفتر ہی میں بندوبست ہو گیا۔ اس دوران اس سے بات چیت چل نکلی۔ اس نے بتایا کہ وہ افسانے بھی لکھتا ہے' میں نے پوچھا..... ''یہ افسانہ کیا ہوتا ہے'' اس نے مجھے اپنی ایک کہانی جو شمع میں چھپی تھی پڑھنے کو دی۔ اس زمانے میں شمع میں انعامی مقابلہ چل رہا تھا۔ منشا کی ایک کہانی کو سو روپے انعام ملا۔ شام کو وہ دوڑا دوڑا میرے گھر آیا۔ ہم راجہ بازار گئے' چائے اور مٹھائی پر جشن منایا گیا۔ منشا نے مجھے رسالہ دیا کہ اس کہانی کو پڑھنا۔ میں نے اسے کہا یار یہ تم کیا لکھتے ہو۔ جاسوسی کہانیاں لکھا کرو' اس زمانے میں مجھے جاسوسی ناول پڑھنے کا جنون تھا۔ منشی تیرتھ رام فیروز پوری کے ترجمے بڑے مقبول تھے۔ محلوں میں آنہ لائبریریاں قائم تھیں' اس کے علاوہ ٹرنک بازار میں جو اب اقبال روڈ بن گیا ہے کتاب گھر کے نام سے ایک بڑی لائبریری تھی' جہاں شام کو شہر بھر کے پڑھے لکھے لوگ کتاب کی تلاش میں آتے تھے۔ یہ زمانہ کتاب شناسی کا تھا' ٹی وی ابھی معاشرے میں داخل نہیں ہوا تھا۔ لے دے کے ایک ریڈیو تھا' جس کے فرمائشی پروگرام اور ڈرامے بڑے مقبول تھے۔ دفتر اور سکول عام طور پر ایک ڈیڑھ بجے تک بند ہو جاتے تھے۔ لوگ گھروں میں جا کر کھانا کھاتے' آرام کرتے اور شام کو شہر کا شہر بنک روڈ پر نکل آتا۔ بنک روڈ پر کینٹے ہی کیفے یا کتابوں کی دکانیں تھیں۔ سیاست ابھی گفتگو کا موضوع نہیں بنی تھی' کیفوں میں سماجی مسائل' ادبی اور فنی معاملات پر گفتگو ہوتی۔ سات آٹھ بجے گھروں کو واپسی ہوتی تو نو دس بجے تک جاگنے کے لئے کتاب یا رسالہ ضروری تھا۔ پڑھنے والے لوگوں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو مہینے میں دو ایک کتابیں نہ خریدتا ہو۔ کئی لوگ ایسے تھے جو دکانوں پر کھڑے کھڑے ہی کتاب پڑھ لیتے۔ طریقہ کار یہ تھا کہ جتنے صفحے پڑھے

وہاں نشان لگا گئے۔ اگلے دن گھنٹہ آدھا گھنٹہ وہیں کھڑے ہو کر اگلے صفحات پڑھ ڈالے۔ سلیم خان گمی جوان دنوں ریڈیو پاکستان میں پروڈیوسر تھے اکثر اسی طرح کتب بینی کرتے۔ لندن بک ڈپو چوک میں تھا جہاں اب یونائیٹڈ بیکری بن گئی ہے۔ گمی کی عادت تھی کہ دفتر سے نکل کر وہاں آتے کوئی کتاب اٹھاتے اور کسی کونے میں کھڑے ہو جاتے۔ لندن بک ڈپو والے دوپہر کو ایک بجے سے تین بجے تک کھانے کا وقفہ کرتے تھے۔ ایک بار یوں ہوا کہ گمی کسی کونے میں دبکے ہوئے تھے۔ سیلزمینوں نے سرسری نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور بند کر کے چلے گئے کچھ دیر بعد گمی کو خیال آیا کہ کھانے کا وقفہ ہونے والا ہے' نکلے تو باہر کا دروازہ بند۔ دو گھنٹے اندر بیٹھے رہے۔ تین بجے منیجر نے دروازہ کھولا تو گمی کو اندر دیکھ کر حیران رہ گیا۔

ذکر ہو رہا تھا کتاب بینی کا تو مجھے اس زمانے میں جاسوسی ناولوں کا گویا ٹھرک تھا۔ منشا یاد کی کہانیاں مجھے کیا پسند آتیں منشا جب بھی کوئی کہانی لکھتا مجھے تلاش کر کے سناتا اور میں جان چھڑاتا۔ منشا یاد جس گھر کی بیٹھک میں رہتا تھا۔ اس کا تنازع چل رہا تھا' عدالت سے فیصلہ دوسرے شخص کے حق میں ہو گیا۔ اس نے پولیس کے ذریعے گھر خالی کرالیا۔ شام کو میں منشا سے ملنے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ گلی میں اپنے ٹرنک پر بیٹھا ہوا ہے۔ پاس چارپائی کھڑی ہے۔

میں نے پوچھا...... ''کیا ہوا؟''

کہنے لگا...... ''پولیس نے مکان خالی کرالیا۔ میرا سامان بھی نکال کر باہر رکھ دیا...... اب کیا کروں؟''

ہم نے سامان تانگے میں لادا اور میں منشا کو اپنے گھر لے آیا۔ منشا اس سے پہلے بھی کئی بار ہمارے گھر چکا تھا۔ امی اسے بیٹوں کی طرح ہی پسند کرتی تھیں۔ منشا چار پانچ دن ہمارے گھر رہا۔ پھر قریب ہی موہن پورہ میں اس نے ایک کوارٹر لے لیا۔ شام کو ہماری باقاعدگی سے ملاقات ہوتی۔ میری کوشش ہوتی کہ افسانے پر کوئی گفتگو نہ ہو اور منشا اپنی تازہ کہانی سنانے پر تلا ہوتا۔ اس گرم سرد میں اس کی ٹرانسفر مری ہو گئی اور وقتی طور پر ہمارا رابطہ ٹوٹ گیا۔

جاسوسی ناول پڑھنے کے ساتھ ساتھ میری ایک اور خصوصی دلچسپی عجیب وغریب روحانی مشقیں کرنا تھی۔ اس کا ماحول گھر میں موجود تھا۔ امی کو روحانیت سے خاص انس تھا۔ وہ اکثر رات کو وظیفے کرتیں اور اکثر ہمیں عجیب وغریب خواب سناتیں' اسراریت تو سری نگر ہی سے میرے ساتھ آئی تھی وہاں میں امی اور علیا چاچا کے ساتھ مزاروں پر جاتا تھا۔ جہاں امی دیا جلاتی' درود پڑھتی ان مزاروں کی' جو اکثر کھوؤں اور غاروں میں تھے' فضا بہت ہی پراسرار تھی' پھر سری نگر میں ہمارے گھر کا درمیانہ حصہ جہاں امی کے مطابق جرمن متو رہتا تھا' اپنے اندر ایک عجب اسرار رکھتا تھا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پنڈی آ کر ہمارا قیام ایک گوردوارے میں ہوا۔ ہمیں جو حصہ رہنے کے لئے ملا اس میں وہ ہال بھی شامل تھا جس میں گنبد اور سنگ مرمر کا ایک چبوترا تھا۔ یہاں بھی اسراریت تھی۔ پورا گھر ہی خصوصاً اوپر والا حصہ بہت پراسرار تھا۔ امی کہتی تھیں' اوپر والے کمرے میں کوئی رہتا ہے۔ نہ نظر آنے والی کوئی

ہستی۔ اس سارے ماحول نے مجھے عجب طرح کی کیفیات سے دوچار کر دیا۔ میں کسی نامعلوم کو جاننا چاہتا تھا۔ غیر معمولی قوتیں حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسی زمانے میں کسی مجتبائی کتاب میں پڑھا کہ اگر روزانہ کچھ دیر چاند پر نظر جمائی جائے تو آنکھوں میں ایک پراسرار قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ پرانے پریس کلب کے پیچھے سنسان جگہ اور نیچے لئی تھی۔ لاریوں کے اڈے ابھی وہاں منتقل نہیں ہوئے تھے۔ میں روز رات کو وہاں جاتا اور چاند کی نظری بندی کرتا۔ کہتے ہیں کہ کوئی چیز طاری کر لی جائے تو وہ واقعی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایک رات یوں ہوا کہ مجھے لگا میں چاند کے اندر پہنچ گیا ہوں میرے چاروں طرف چاند موجود ہے۔ ایک عجیب فرحت بخش احساس تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے میں ڈر گیا۔ منہ سے چیخ نکل گئی۔ میں تیزی سے بھاگا۔ پاؤں پھسلا تو لئی کے کنارے تک گھسٹتا آیا۔ جوتی وہیں رہ گئی۔ ننگے پاؤں سانسوں سانس گھر پہنچا۔ امی کا میرے ساتھ کچھ ایسا تعلق تھا کہ بعض اوقات بغیر لفظ ادا کئے وہ سب کچھ سمجھ جاتی تھیں۔ میں ان کے سامنے جھوٹ بول ہی نہیں سکتا تھا۔ انہوں نے مجھے ڈانٹا پھر کچھ پڑھ کر پانی دم کیا اور مجھے پلا کر کہا کہ آئندہ اس طرح نہ کرنا۔ ایک اور مجتبائی کتاب میں پڑھا کہ اگر ایک خاص عرصہ تک سورج کو دیکھا جائے تو دیکھنے والے کی آنکھ میں سورج کی توانائی آ جاتی ہے وہ جس چیز کو چاہے نظروں سے جلا سکتا ہے۔ میں نے یہ عمل بھی شروع کر دیا۔ چار پانچ دن بعد ہی آنکھیں سوج گئیں اور درد سے چیخیں نکلنے لگیں۔ امی نے اس بار بھی بڑا ڈانٹا اور کئی دن تک وظیفے پڑھ پڑھ کر پھونکیں مارتی رہیں۔

والد لاہور ہی میں تھے، علیا چاچا نے وہاں جا کر بڑا اصرار کیا کہ وہ بھی کلیم داخل کر دیں مگر وہ نہ مانے، ان کا استدلال ایک ہی تھا کہ میں نے یہاں رہنا ہی نہیں، واپس جانا ہے۔ امی کو ان کا یہ رویہ بھی ناپسند تھا۔ میں نے لکھنا تو ابھی شروع نہیں کیا تھا لیکن پڑھنے کا شوق جنون کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ امی کو میرا کتابیں پڑھنا پسند نہیں تھا۔ والد کی زندگی کے رویوں کی وجہ سے وہ ادب و شعر کے بارے میں بہت ہی منفی خیالات رکھتی تھیں۔ جس وقت ہم پنڈی آئے تھے نانک پورہ میں ایک سے ایک شاندار گھر خالی پڑا تھا لیکن والد نے ایک کمرے میں رہنے کو ترجیح دی ان کا کہنا تھا کہ رہنے کے لئے ایک ہی کمرہ کافی ہوتا ہے۔ وہ مزاجاً ہی نہیں عملاً بھی درویش تھے۔ ان کی یہ درویشی امی کو پسند نہیں تھی۔ مزاجاً تو وہ بھی فقیر منش تھیں۔ علیا چاچا کا کلیم منظور ہو گیا اور انہوں نے اس کے بدلے نمک منڈی میں ایک دکان لے لی۔ ٹرک کی کلینری سے نجات مل گئی۔ دکان ملنے سے ہمارے گھر کے حالات بدل گئے۔ لیکن والد کے بارے میں امی کی رائے اور خراب ہو گئی۔ اسی دوران پنڈی میں نعمان جان نے قالینوں کی فیکٹری قائم کی۔ والد کو چیف ڈیزائنر کے طور پر بلایا گیا۔ وہ لاہور چھوڑ کر پنڈی آ گئے۔ علیا چاچا کے ایک دوست، جن کا نام بھی محمد علی تھا، 501 سینٹرل ورکشاپ میں کام کرتے تھے، انہوں نے اپنے کسی افسر سے کہہ سُن کر مجھے وہاں بطور ایل ڈی سی ملازم کرا دیا۔ گھر کے حالات اب یکسر بدل گئے تھے۔ لیکن امی اور والد کے درمیان جو ایک بال آ گیا تھا وہ نہ نکلا ان کے تعلقات ورکنگ ریلیشن شپ تک محدود ہو گئے تھے، ایک وجہ اور بھی تھی، میری ایک پھوپھی فاطمہ اور چچا فاروق کرشن نگر میں رہتے تھے۔ چچا تو بچوں کو چھوڑ کر لاہور میں تھے۔ دادی بھی ان

لوگوں کے ساتھ رہتی تھیں۔ والد اکثر والدہ اور بہن کو ملنے وہاں جاتے۔ عموماً اکیلے ہی جاتے واپسی پر ان کا موڈ بہت خراب ہوتا' امی کا خیال تھا کہ فاطمہ پھوپھو ان کی کان بھرتی ہیں۔ وہ جواباً والد سے اور اکھڑے لہجے میں بات کرتیں' چنانچہ دونوں کے تعلقات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ والد کو لقمان جان کی فیکٹری میں کام کرتے ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ وہ شدید بیمار پڑ گئے دمے کے تو وہ پرانے مریض تھے۔ اس بار پھیپھڑوں پر بھی حملہ ہوا۔ ٹی بی ہسپتال جہاں وہ علاج کرانا چاہتے تھے۔ کرشن نگر کے قریب تھا۔ دو چار دن وہ ہسپتال گئے معلوم نہیں کیسے' کسی کے اکسانے پر یا انہیں از خود خیال آیا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ علاج کے دوران وہ بہن کے گھر ہی رہیں گے روز آنے جانے میں تکلیف ہوتی ہے۔ امی کو اس فیصلے سے ظاہر ہے بڑا دکھ ہوا لیکن انا کی وہ بھی پکی تھیں کہا...... ''جاتے ہو تو جاؤ مجھے کیا'' علیا چاچا نے سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے چارے کو دونوں سے ڈانٹ پڑی۔ بہت ہی افسردگی' اداسی اور ٹینشن میں والد اپنا مختصر سا سامان لے کر بہن کے گھر منتقل ہو گئے۔ ہم دوسرے تیسرے دن انہیں دیکھنے جاتے ان کی حالت سنبھلنے کی بجائے بگڑتی ہی گئی۔ لیکن ایسی بھی صورت نہ تھی کہ وہ اچانک ہمیں چھوڑ جائیں گے۔ 4 جون 1960ء کی صبح میں حسب معمول ورکشاپ گیا۔ کوئی دس بجے کے لگ بھگ فون آیا کہ وہ فوت ہو گئے ہیں۔ میں گھر آیا' امی اور ہمارے دوسرے رشتہ دار' ماموں' نیچے والی خالہ' ان کے بیٹے نذیر احمد سب میرے منتظر تھے۔ ہم کرشن نگر پہنچے۔ ہماری حیثیت وہاں اجنبی سی تھی۔ امی بتاتی تھیں کہ دادی اور پھوپھو نے انہیں منہ ہی نہیں لگایا۔ شام کو جنازہ ہوا اور والد کو عید گاہ کے قبرستان میں سپرد خاک کر کے ہم باہر و باہر سے ہی اپنے گھر لوٹ آئے۔ جنازہ اٹھتے ہی امی اور ان کی رشتہ دار خواتین جو نانک پورہ سے ساتھ گئی تھیں باہر نکل آئیں' کسی نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ نانک پورہ آ کر ہم نے اپنی پھوڑی بچھائی۔ ددھیال سے ہمارا تعلق ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔

501 ورکشاپ میں میری ملازمت یکم جنوری 1959ء کو شروع ہوئی۔ ابتدا میں مجھے ایک ذیلی دفتر میں جو گولڑہ موڑ کے پاس تھا بھیجا گیا۔ یہ سردیوں کا موسم تھا۔ اس زمانے میں شروع کے تین مہینے بارشوں اور شدید سردی کے مہینے ہوتے تھے۔ برساتیاں تو کسی کسی کے پاس ہوتی تھیں۔ زیادہ تر چادریں لپیٹ کر ہی بارشوں میں پھرتے تھے۔ علیا چاچا نے مجھے ایک پرانی سائیکل لے دی۔ اس زمانے میں گاڑیاں تو کسی کسی کے پاس ہوتی تھیں۔ کرنل رینک تک کے لوگ سائیکل استعمال کرتے تھے۔ موٹر سائیکل بھی خال خال ہی تھے۔ گھر سے دفتر پہنچتے گھنٹہ لگ جاتا تھا۔ دفتر صبح ساڑھے سات بجے شروع ہوتا اور تین بجے چھٹی ہوتی۔ اس زمانے میں یونین کا تصور ہی نہیں تھا۔ سنا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے یونین بنانے کی کوشش کی گئی لیکن سختی سے کچل دی گئی۔ ایک ویلفیئر سیکشن تھا' ماجد الباقری اس وقت وہاں ویلفیئر آفیسر تھے۔ لیکن اس وقت میری ان سے شناسائی نہ ہوئی۔ ایک سال بعد کوشش کر کے میری ٹرانسفر مین ورکشاپ چکلالہ میں ہو گئی۔ پبلک ٹرانسپورٹ یہاں بھی نہیں تھی چنانچہ وہی سائیکل کا سفر جاری رہا۔ یہاں میری تقرری پرچیز سیکشن میں ٹائم کیپر کے طور پر ہوئی' میرا کام ورکرز کی حاضری لگانا اور

ان کی چھٹیوں کا حساب رکھتا تھا۔ یہ سارا کام گھنٹہ دو گھنٹہ میں ختم ہو جاتا۔ میں روزانہ ایک جاسوسی ناول ساتھ لے جاتا اور فارغ وقت میں پڑھتا رہتا۔ اسی سیکشن میں ایک اور شخص بھی کتابیں ساتھ لاتا' عموماً ابن صفی کی کتابیں۔ اس کا نام اعجاز حسین تھا۔ آہستہ آہستہ ہماری گفتگو شروع ہو گئی۔ کبھی کبھار' کتابوں کا تبادلہ بھی ہونے لگا۔ اس نے بتایا کہ وہ اعجاز راہی کے نام سے افسانے لکھتا ہے۔ منشا یاد کی وجہ سے میں افسانے کے نام سے واقف تھا۔ ایک دن اعجاز راہی نے مجھے اپنی ایک کہانی پڑھنے کو دی۔ کہانی پڑھ کر میں نے اسے کہا' ایسی کہانی تو میں بھی لکھ سکتا ہوں۔ اس نے کہا تو لکھو' چند دن گزر گئے۔ اس نے پھر یاد کرایا بلکہ اصرار کیا کہ میں کہانی لکھوں' میں نے ایسے ہی غیر سنجیدگی سے ایک کہانی لکھ کر اسے دی۔ اعجاز راہی نے کہانی کی بڑی تعریف کی اور کہا تم تو افسانہ نگار ہو۔ دو ایک دن بعد شام کو اعجاز راہی کچھ لوگوں کو لے کر میرے گھر آیا...... یہ نثار ناسک' علیم درانی' سبط احمد اور سلیم الظفر تھے۔ میرا تعارف کروایا۔ ہم کشمیری بازار کے ایک چائے خانے میں جا بیٹھے۔ معلوم ہوا کہ یہ سارے لوگ نئے لکھنے والے ہیں۔ میں ان کی برادری میں شامل ہو گیا۔

یہ سارے لوگ شام کو پنڈی ہوٹل میں بیٹھتے تھے جو راجہ بازار کے آخر میں تھا۔ نثار ناسک ان کا سرخیل تھا۔ میں نے بھی وہاں جانا شروع کر دیا۔ نثار ناسک کا خیال تھا کہ نئے لکھنے والوں کو اپنی ایک انجمن بنانا چاہئے۔ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس اس وقت تک معطل تھے۔ 1958ء کے مارشل لاء کے فوراً بعد حلقہ کے اجلاس بند کروا دیئے گئے تھے۔ بڑی بحث کے بعد تجویز ہوا کہ انجمن کا نام ''بزم میر'' رکھا جائے۔ نثار ناسک اس کے سیکرٹری اور سلیم الظفر جوائنٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ میرا اور اعجاز راہی کا نام مجلس عاملہ میں شامل کیا گیا۔ بزم میر کے اجلاس موچی بازار کے ایک ہوٹل میں ہونے لگے۔ اس دوران میں نے دو تین اور کہانیاں لکھیں اور اختر رشید ناز کے نام سے فلمی پرچوں میں بھیج دیں۔ رومان اس زمانے میں اچھا فلمی رسالہ تھا۔ اگلے مہینے میری کہانی چھپ گئی اور میں اپنے حلقہ احباب کی رائے میں باضابطہ افسانہ نگار بن گیا۔ اسی دوران میں نے ایک کہانی لکھی جس کا عنوان سنگم تھا۔ بزم میر کے جلسوں میں کچھ بزرگ بھی آنے لگے ان میں غلام رسول طارق بھی تھے جو نثار ناسک کے استاد تھے۔ میں نے یہ کہانی بزم کے جلسہ میں پڑھی۔ جلسہ ختم ہوا تو غلام رسول طارق مجھے ایک طرف لے گئے اور پوچھا......

''یہ کہانی تم نے خود لکھی ہے''

میں نے کہا......''جی''

بولے......اگر واقعی تم نے لکھی ہے تو بہت خوب' تم میں لکھنے کی بڑی صلاحیت ہے لیکن تربیت کی ضرورت ہے۔

میں کچھ نہ بولا۔

کہنے لگے......''کسی دن فرصت ہو تو میرے پاس آنا...... میں دوپہر کا کھانا بوہڑ ہوٹل میں کھاتا

ہوں۔"

غلام رسول طارق فرنٹیئر پریس میں منیجر تھے جو میسی گیٹ میں واقع تھا۔ وہ اپنا گھر سے لایا ہوا کھانا بوہڑ ہوٹل جا کر کھاتے۔ میں ایک دن ان کے پاس پہنچ گیا۔

کہنے لگے...... "کل وہ افسانہ ساتھ لے کر آنا۔"

دوسرے دن میں افسانہ ساتھ لے گیا۔ انہوں نے دو ایک جگہ جملے درست کرائے پھر بولے ...... "کسی اچھے رسالے کو بھیج دو۔"

میں نے کہا...... "بہتر۔"

بولے...... "کس کو بھیجو گے۔"

میں نے فوراً کہا...... "رومان کو بھیج دیتا ہوں۔"

سخت ناراض ہوئے کہنے لگے...... "اب ان فلمی پرچوں سے باہر نکلو میرا خیال ہے اسے ادب لطیف کو بھیج دو۔"

"ادب لطیف" میں نے حیرت سے کہا۔

ادب لطیف اس زمانے میں نقوش کے بعد سب سے اہم رسالہ سمجھا جاتا تھا۔ مرزا ادیب اس کے مدیر تھے۔

بولے...... "بالکل' ادب لطیف کو بھیج دو...... اور ہاں یہ تمہارا نام کیا ہے...... اختر رشید ناز' یہ ناز واز اب نہیں چلتا کوئی ڈھنگ کا نام رکھو۔"

کافی نام زیرِ غور آئے آخر رشید امجد طے ہوا۔

دوسرے دن میں نے یہ کہانی رشید امجد کے نام سے میرزا ادیب کو بھجوا دی۔ مجھے ذرہ بھر بھی خوش فہمی نہ تھی کہ میرزا صاحب جواب دیں گے۔ میں نے کہانی کے نیچے "چینی کہانی سے ماخوذ" لکھ دیا کہ اس زمانے میں ترجمے فوراً چھپ جاتے تھے۔

تیسرے ہی دن میرزا صاحب کا خط آ گیا۔ انہوں نے کہانی کی بڑی تعریف کی اور لکھا ہے کہ زیرِ ترتیب شمارے میں شائع ہو رہی ہے۔ میں نے صرف غلام رسول طارق کو یہ خط دکھایا۔

کہنے لگے...... "اس کا تذکرہ کسی سے نہ کرنا' جب تک کہانی چھپ نہ جائے تمہارے آس پاس بڑے حاسد موجود ہیں۔"

اگلے مہینے ادب لطیف آ گیا۔ یہ ستمبر 1960ء کا شمارہ تھا۔ اس میں کہانی شامل تھی۔ میرزا صاحب نے اداریہ میں خصوصیت سے میرا ذکر کیا تھا کہ اگرچہ کہانی کا مرکزی خیال ماخوذ ہے لیکن اندازِ تحریر ایک اچھے افسانہ نگار کی آمد کا پتہ دیتا ہے۔

اس دوران میں نے ایک اور کہانی لکھی۔ استاد غلام رسول طارق نے مشورہ دیا کہ اسے داستان گو میں بھیجوں۔ داستان گو کچھ عرصہ بند رہنے کے بعد پھر شروع ہو گیا تھا۔ اشفاق احمد مدیر تھے۔ انہوں نے بھی کہانی اگلے پرچے میں چھاپ دی۔ ان دونوں کہانیوں نے مجھے یک دم ایک معتبر افسانہ نگار بنا دیا۔

میرے اس آغاز کا سہرا استاد غلام رسول طارق کے سر ہے۔ وہ خود شاعر تھے' کبھی کبھی افسانے بھی لکھتے تھے۔ مشرقی تنقید کا بہت عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ زبان کے معاملے میں ان کی گرفت بڑی سخت تھی۔ میں نے ان سے جملہ لکھنا سیکھا' افسانے کو سمجھا' میں اپنی ہر کہانی انہیں دکھاتا تھا۔ وہ کہانی سنتے' پھر مجھ سے لے کر پھاڑ دیتے اور کہتے۔ اب اس کہانی کو درمیان سے شروع کر کے دوبارہ لکھو۔

اگلے دن میں لکھ کر لے جاتا۔ وہ یہ مسودہ بھی پھر دیتے اور کہتے اب کہانی کو آخر سے شروع کر کے فلش بیک میں لکھو۔ یوں انہوں نے مجھے لکھنے کی ایسی مشق کرائی جو آج بھی میرا اثاثہ ہے۔ جملے کے بارے میں وہ بڑے حساس تھے۔ اگر دو تین جملوں کے آخر میں متواتر تھا یا تھی آ جاتا تو میز پر طبلہ بجانا شروع کر دیتے ''تھا تھیا...... تھا''...... ''تھا تھیا...... تھا''

رشید امجد کے نام سے میرا آغاز بہت اچھا' بلکہ توقع کے خلاف تھا۔ اختر رشید کا سفر ختم ہوا۔ یہ نام والد نے اپنے جوتشی پنڈت کے حساب کتاب اور پوتھی کے مطابق رکھا تھا۔ جوتشی پنڈت کا خیال تھا کہ یہ نام میری شخصیت کے مطابق ہے لیکن اختر رشید بھی گمان کا مغلوب رہا۔ وہ بھی دو شخصیتوں کے حصار میں تھا۔ ایک اندر' ایک باہر اور اس کے ارد گرد بھی ایک اسرار تھا' تخیل کی لذتوں میں گم۔ یہ تخیل بھی عجب نعمت ہے۔ یوں تو آدمی کو جذبہ احساس اور شعور کی نعمتیں بھی ملی ہیں لیکن ان نعمتوں میں دوسرے حیوان بھی شریک ہیں۔ جذبہ سب میں موجود ہے کم یا زیادہ' جانور بھی اپنے بچوں سے پیار کرتے ہیں۔ ان کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں۔ اور شعور بھی کم ہی سہی' ان میں موجود ہے۔ احساس بھی ان کے یہاں ہے لیکن تخیل کی نعمت صرف آدمی کے حصے میں آئی ہے' اختر رشید اس تخیل کا اسیر تھا۔ رشید امجد بھی زندگی بھر اس کا اسیر رہا۔ ساری زندگی ایک ان دیکھے کی تلاش' اپنی شناخت میرا مسئلہ رہی ہے۔ اگر غلام رسول طارق نہ ملتے تو شاید اختر رشید نا زفلمی پرچوں میں گم ہو کر رہ جاتا' لیکن رشید امجد نے اپنے سفر کا آغاز بہتر اور پر وقار انداز سے کیا۔

o......o......o

تہِ دِل

o

خورشید رضوی

اے تہِ دل
رونمائی سے تری ڈرتا ہوں میں

تو کنواں ہے اور میں یوسف ہوں
کچھ مایوس، کچھ مانوس
تیرے بطن میں
تیرے سوتوں سے کہیں زہراب رِستا ہے
کہیں آبِ حیات

اے تہِ دل
تجھ میں ہے کتنی طہارت
تجھ میں ہے کیسی نجاست
تجھ میں ہیں کتنے گماں، کتنے یقیں
کتنے تضاد
اے تہِ دل رونمائی سے تری ڈرتا ہوں میں

اے تہِ دل
تجھ میں ہے کتنی طہارت
اہلِ ظاہر جس کی تابانی کے آگے خیرہ چشم

اہلِ فتویٰ جس کے آئینے کے آگے رُوسیاہ
جو طہارت، چوبِ منبر کو بنائے چوبِ دار
اے تہِ دل اُس طہارت سے بہت ڈرتا ہوں میں

اے تہِ دل
تجھ میں ہے کیسی نجاست
جس کا اک قطرہ
سمندر کو بھی آلودہ کرے
اہلِ ظاہر کی صدائے آفریں کے باوجود
جس کی آمیزش سے لگتا ہے مجھے
حُسنِ عمل، کارِ گُناہ
اے تہِ دل، اُس نجاست سے بہت ڈرتا ہوں میں

اے تہِ دل
اے بلائے جاودانی
اے سیہ ناگوں کے بل
میرے سینے میں گڑی میری صلیب
اے معمائے عجیب

رنگِ زمانہ

بخش لائلپوری

وہی موسم وہی رنگِ زمانہ وہی سر پر ستم کا شامیانہ
وہی لہجوں میں ہے زہرِ ہلاکت وہی طرزِ تکلم شاطرانہ
وہی فرہاد کی تیشہ زنی ہے وہی برہم مزاجِ خسروانہ
وہی فاقہ کشوں کی منزلیں ہیں وہی ہجرت برائے آب و دانہ
وہی تادیب ہے محنت کشوں پر وہی لٹتا مشقت کا خزانہ
وہی صیاد کا دامِ ہوس ہے وہی بجلی کی زد میں آشیانہ
وہی پامالیٔ روشن خیالی وہی فکر و نظر پر تازیانہ
وہی جمہوریت کا شور لب پر وہی طور و طریق آمرانہ
وہی بوسیدہ طروں کی نمائش وہی جاگیرداری کا فسانہ
وہی دہشت وہی دہشت نوازی وہی جور و تشدد کافرانہ
وہی منشورِ انسانی پہ شب خوں وہی نت وارداتِ غاصبانہ
وہی رسوائی لوح و قلم ہے وہی زر کی ہوس کا شاخسانہ
وہی عہدِ غلامی کی حکایت وہی طوقِ اطاعت کا بہانہ
وہی اہلِ رعونت کی ستائش وہی حرفِ خوشامد عاجزانہ
وہی کالم نویسوں کی جہالت وہی طرزِ نگارش مجرمانہ
وہی بے مغز تحریروں کے دفتر وہی ہر اک خطاب جاہلانہ
وہی آتش میرے اشعار میں ہے وہی رنگِ تغزل باغیانہ
زمانے کا چلن جو تھا وہی ہے ابھی بدلا نہیں رنگِ زمانہ

کشمیری مجاہدوں کی رجز خوانی

O

خالد اقبال یاسر

لہو کی ہولیوں سے دشمنوں کا جی نہیں بھرا
کہ بے کسوں پہ بربریتوں میں ہر حلیف نے
حصولِ حق کی خونچکاں لڑائی میں
ہمارے ہر روایتی حریف نے
کیا ہے ان کو باخبر
ہماری راکھ میں چھپا
کہیں نہ ہو کوئی شرر
کہ اک جواں میں بھی اگر
نہیں ہے موت کا بھی ڈر
انہیں بھرے جہان میں
کہیں نہیں کوئی مفر
بہت ہے شپروں کی روح قبض کرنے کے لئے
عقاب کا بس ایک پر

زمین غیر بھی نہیں
وفا بغیر بھی نہیں
ان اودی اودی وادیوں سے
نیلے نیلے پربتوں سے
پر بہار وسعتوں سے
اونچی نیچی گھاٹیوں سے

ظلم کے لئے اگر
اٹھایا جو کسی نے سر
تو اس کی خیر بھی نہیں

سکوں کی پائمالیوں
ہماری سخت حالیوں کی انتہا بھی ہے کہیں
جلا کے راکھ کر دیا
ہمارے ہر مکان کو دکان کو مچان کو
ہماری آن بان کے ہر اک جلی نشان کو
مگر نہیں ہٹا سکا
ہدف پہ ان کے دھیان کو
ہمارے ہر جوان ہاتھ میں کھنچی کمان کو

جفا و جبر کے سبب
ہماری روح اک طرف
بدن غلام بھی نہیں
ہماری تیغ آبدار
اب نیام بھی نہیں
ہمارے درمیان کوئی
بے مقام بھی نہیں
تمام ساتھ ساتھ ہیں
صلائے عام بھی نہیں
سحر خیال ہی سہی
مگر یہی خیال اب
خیالِ خام بھی نہیں

خواب سہانا ہو سکتا ہے

O

ناصر زیدی

آدھی رات کی تنہائی ہے
چاروں جانب ہُو کا عالم
تم ہو اور تمہاری ساتھی
میری اب تک کی تحریریں
غزلیں -- نظمیں!

ان تحریروں سے بھی اگرچہ
آدھی رات کی تنہائی کا
خوف یقیناً کھو سکتا ہے
لیکن اس اندھیاری رُت میں
گہری چُپ کے سناٹے میں
ان تحریروں کا خالق بھی گر
ناصر بن کر ساتھ رہے تو
ماضی کا اور مستقبل کا
اور پھر دورِ حاضر کا بھی
خواب سہانا ہو سکتا ہے!

زیاں کار

o

نجیبہ عارف

ہم کب تک لفظوں کے طوطے مینا تخلیق کریں گے
کب تک صرف تخیل کی پرواز پہ قانع اور مسرور رہیں گے
کب تک صرف سخن کی زیب و زینت میں مصروف رہیں گے
کب تک اپنی اپنی ذات کے کُنجِ تنہائی میں بیٹھ کے اپنے اپنے خواب بنیں گے
اور کسی کے درد پہ اپنے دل کا در نہ کھولیں گے
کاغذ کی کشتی میں بیٹھے لوگ ہیں-- کب تک سو لیں گے؟؟؟

....

اس سے تو بہتر ہے مل کر ایک دعا ہی کر لیں!!!

ہیروشیما!

o

جواز جعفری

ہیروشیما
تباہی کے بعد تیری مٹی میں کھلنے والا پہلا پھول
میرے نتھنوں میں بستر لگائے
مجھے موت پر زندگی کے غالب آنے کی کہانی سناتا ہے!
وہ کیسے لوگ تھے جن کے پاس کئی نسلوں تک
اپنے بچوں کو دینے کے لئے
تابکاری کے سوا کچھ نہ تھا!
میں جنگ کی تباہ کاریوں پر لکھنے کی بجائے
جنگ کے خلاف لکھتا ہوں!
مجھے اپنے ہنستے بستے شہروں سے محبت ہے
جن پر قبرستانوں کے توسیعی منصوبے قہقہے لگاتے ہیں
مجھے ان جسموں سے محبت ہے
جن کے پاؤں اچانک کٹ کر دور جا گریں گے
اور ٹانگوں میں محض چلنے کی آرزو رینگتی رہ جائے گی!

ہیروشیما!
تجھ پر موت برسانے والا یقیناً اندھا ہوگا
اس کی پیشانی کے کھیت میں کبھی کسی دوشیزہ نے قہقہہ نہیں بویا ہوگا
حیرت ہے وہ اس جرم کے بعد
اتنا عرصہ زندہ کیسے رہا؟

ہیروشیما!
میں تیری بدولت
سرحدوں کے پار بسنے والوں سے محبت کرنے کے قابل ہوا!
میری نظمیں
تیری کوکھ پر لگنے والے زخموں کا مرہم ہیں!

یو این او

O

جواز جعفری

تیری آغوش
میرے لئے وا ہونا بھول گئی
میں بھوکا پیاسا -- تیری چھاتیوں کے بیچ پڑا
تیرے بندِ قبا کا طواف کرتے ہاتھوں کو تکتا رہا!
تیری ممتا
تیرے لہو کی شاخ سے جھڑ گئی
تو تیری ہڈیوں میں سوئی
داشتہ نے انگڑائی لی!

یو این او
تیری جوانی -- مُٹھی سے گرتی ریت
اور تیری کوکھ میں گناہ سانس لیتا ہے!
تیری قراردادوں کے حروف
جنوبی ایشیا کے بچوں کی آنکھوں سے ڈھل گئے
اور تیرے ڈبیٹنگ کلب کے تقریری مقابلوں پر
سماعتیں اپنے کیواڑ
بند کر چکیں!

یو این او
تو نے اپنی جانب دیکھنے والی
امید بھری آنکھوں میں
ہمیشہ دکھ کاشت کئے!

خوبصورت داشتہ
تیرے مقدر میں
صرف آنسو ہیں!

غالب کے دو شعر

(غالب کا بلند ترین تصور سیر و سیاحت)

سید مشکور حسین یاد

(1)

یہ ایک غزل کے مقطع سے پہلا شعر ہے

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

اس غزل کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ یہ غزل لکھنؤ میں غالب نے اس وقت کہی تھی جب وہ لکھنؤ سے آتے ہوئے کلکتہ اپنی پنشن کے لئے جا رہے تھے۔ لکھنؤ میں کوئی طرحی مشاعرہ تھا بقول غلام رسول مہر اس مشاعرہ کے لئے یہ غزل کہی گئی" ورنہ غالب اس ضمن میں خود کوئی غزل لکھنے کے لئے تیار نہ ہوتے۔" معلوم نہیں مہر صاحب نے یہ کیسے فرما دیا جبکہ غالب نے کیا عمدہ غزل کہی ہے۔ اور زیرِ بحث شعر میں تو غالب نے سیر و سیاحت کا بہت ہی جدید قسم کا تصور دیا ہے بلکہ جدید سے بھی جدید کہ آج کل اہل دانش کے پاس اس طرح کا تصور کہاں سے آ سکتا ہے جیسا کہ اس شعر میں دیا گیا ہے۔ سیر و سیاحت کو ابھی تک محض ایک سیر سپاٹا سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی اور کوئی اہمیت ہمارے آج کے سفر نامہ نگاروں نے سیر و سیاحت کو دی بھی ہے تو وہ بھی اس ملک میں گھومنے پھرنے اور اس کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے سے زیادہ نہیں۔ جبکہ غالب کا تصور سیر و سیاحت' قرآن کے تصور سیر و سیاحت سے ہم آہنگ ہے۔ سیر و سیاحت کے ضمن میں قرآن میں ارشاد ہوتا ہے قل سیروا فی الارض۔" اے رسول لوگوں سے کہو کہ وہ خدا کی زمین میں گھومیں پھریں اور اس کے مشاہدہ سے اپنی دانش و حکمت میں اضافہ کریں۔"

اب غالب کے شعر کی طرف آیئے غالب کہہ رہے ہیں کہ اگر وہ لکھنؤ آئے ہیں تو یہاں مستقل طور پر ٹھہرنے کے لئے نہیں آئے جیسا کہ اس زمانے میں عام طور پر شاعر لوگ اپنی قسمت آزمانے کے لئے دلّی وغیرہ

سے لکھنؤ آیا کرتے تھے۔ گویا غالب سیر و سیاحت کو خالص مشاہدہ اور اکتساب علم و حکمت کی چیز سمجھتے ہیں۔ کسی حصول زر یا غم روزگار کا علاج کرنے کے لئے نہیں۔ حالانکہ ہم اور آپ جانتے ہیں کہ غالب کا یہ سفر خالصتاً کاروباری قسم کا تھا۔ لیکن غالب کا خلوص اپنے موضوع سے دیکھئے کہ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ غالب یہ سفر سیر و سیاحت کے لئے کر رہے ہیں تو پھر غالب کا نظریہ سیر و سیاحت بھی اچھی طرح سماعت فرمالیں۔ غالب اپنے تصور سیر و سیاحت کو بیان کرنے سے قبل ایک اور مزید ار وضاحت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ جو سفر' سیر و سیاحت کے لئے ہوتا ہے اس کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ شعر کا آغاز ہی ان تین الفاظ کی ترکیب سے ہوتا ہے جو ہمارے ذہن کو سیر و سیاحت کے لامتناہی تصور سے آشنا کرتے ہیں۔ اور وہ تین الفاظ یہ ہیں ''مقطع سلسلۂ شوق'' یعنی شوق کے سلسلہ کا اختتام لیکن لطف کی بات یہ ہے ایک تو سفر کو سلسلۂ شوق کہا ہے کوئی بور قسم کی چیز نہیں کہا' دوسرے مقطع کا لفظ ہے غزل کے مقطع کی طرف ہمارے ذہن کو منتقل کر رہا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہم سیر و سیاحت کے لئے سفر کو ختم بھی کرتے ہیں تو یہ خاتمہ ایسا ہی ہے جیسے کسی غزل کا مقطع غزل کے خاتمے یا مکمل ہونے کا اعلان کرتا ہے۔ یعنی فی الحال یہ غزل ختم ہوئی لیکن اس کا امکان ابھی تو صد فی صد موجود ہے کہ اس غزل کے بعد دوسری غزل شروع ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر ہم کسی مقام پر پہنچ کر اپنے سفر کے ختم ہونے کا اعلان بھی کرتے ہیں تو ضروری نہیں کہ اب ہمارے کسی دوسرے سفر کا آغاز نہیں ہوگا۔

دیکھ لیجئے غالب نے کہنے کو لکھنؤ شہر کے بارے میں یہ مصرع بظاہر بڑی سادگی کے ساتھ کہہ دیا ''مقطع سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر'' لیکن اس روا روی میں اپنے تصور سیر و سیاحت کو کس خوبصورتی سے بیان کر دیا ہے۔ اس بلاغت و فصاحت کی داد دینا بھی ضروری ہے اور پھر یہ پہلا مصرع تو غالب کے تصور سیاحت کی بھی ایک ہلکی سی جھلک ہے۔ دوسرے مصرع پر ہم غور کریں گے تب ہمیں پتا چلے گا کہ غالب کا یہ تصور سیر و سیاحت کس قدر عمدہ اور ارفع و اعلیٰ ہے۔

ہاں تو دوسرا مصرع یہ ہے۔-- ''عزم سیر نجف و طوف حرم ہے ہم کو'' -- لفظ سیر اسی دوسرے مصرع کا کلیدی لفظ نہیں ہے' بلکہ پورے شعر کا کلیدی لفظ ہے اور اسی لفظ کے باعث غالب کا تصور سیر و سیاحت' ہمیں اپنی بلندیوں کی طرف بھی لے جا رہا ہے اور یوں عام سیر سپاٹے کے تصور سے ہمیں بلند کر رہا ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں عرض کیا گیا ہے کہ قرآن پاک میں لفظ سیر بہت وسیع اور بلند معنی رکھتا ہے۔ اگر ہمیں سیر کا حکم دیا گیا ہے تو اس کا صاف اور واضح مطلب ہے کہ ہم جس جگہ جائیں وہاں سے تاریخی' تہذیبی' معاشرتی غرض ہر طرح کی بصیرت حاصل کریں۔ اچھی طرح مشاہدہ کے گونا گوں پہلوؤں سے مستفید ہوں تا کہ زندگی کے بارے میں کہیں کوئی سائیٹفک نظریہ قائم کرنے میں مدد ملے۔ شعر زیر بحث کا پہلا مصرع اگر ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ سیر کرنے کے لئے صرف لکھنؤ شہر کافی نہیں۔ کرۂ ارض پر اور بہت سے شہر ہیں جہاں کی سیر ہمیں کرنی چاہئے۔ اور اس طرح اگر پوری دنیا کی سیر بھی کرتے ہیں تو یہ ہماری سلسلۂ شوق کی ایک کڑی نہیں ہے۔ لیکن غالب کہتا ہے ہم اپنے اس سلسلۂ

شوق کو اس کرۂ ارض تک ہی محدود نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے سامنے بقول اقبالؔ ''ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں'' اور اس کے لئے ہم محض ہواؤں میں تیر تکے چلانے کے قائل نہیں۔ دنیا بھر کی سیر کرنے کے لئے کسی ایسے دروازے پر پہنچنے کی ضرورت ہے جہاں سے ہمیں علم وحکمت کے بے بہا خزانے حاصل ہوسکیں۔ چنانچہ اس کے لئے غالب دوسرے مصرع میں اعلان کر رہا ہے ''عزم سیر نجف وطوف حرم ہے ہم کو'' یعنی ایک حدیث مبارکہ کے مطابق میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔'' لہٰذا نجف کی سیر اور کعبے کے طواف کا ہم ارادہ رکھتے ہیں۔ اس مصرع میں جس طرح لفظ عزم ارادہ کی پختگی کو ظاہر کر رہا ہے وہ صاحبان علم ونظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ پہلی نظر میں تو احساس ہوتا ہے کہ غالب یہ کیا کہہ رہا ہے کہ ہم نجف کی سیر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ گویا نجف کوئی معمولی مقام ہے جہاں کی سیر کا یہ حضرت ارادہ فرما رہے ہیں لیکن ذرا غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے لفظ سیر تو یہاں قرآنی مفہوم میں استعمال ہوا ہے اور یہ لفظ سیر زیارت کے لفظ سے کہیں زیادہ عمدہ مفاہیم کا حامل ہے۔ لفظ زیارت زیادہ تر ذاتی اور شخصی مفاہیم سے تعلق رکھتا ہے جبکہ سیر کا لفظ انسان کے آفاقی مطالب سے بھرپور ہے۔ گویا نجف کی سیر کے عزم کا مطلب یہ ہوا کہ معروف حدیث کے مطابق ہم شہر علم کے دروازے میں داخل ہو کر سیر کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اب یہ تو ہماری ہمت اور ہمارے حوصلہ پر موقوف ہے کہ شہر علم کے دروازے میں داخل ہو کر کہاں تک اور کیا کچھ حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ شہر علم کے دروازے میں داخل ہو کر ہم پورے شہر علم کی سیر کا شرف بھی حاصل کر سکتے ہیں اور کچھ نہیں تو ہم اپنے قلب ونظر کو طرح طرح کی بلندیاں اور وسعتیں تو ضرور بخش سکتے ہیں۔ یعنی مثالی قسم کی سیر وسیاحت کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنا ہمارے لئے عین ممکن ہے اس میں کچھ زیادہ محنت مشقت کی ضرورت نہیں ہوتی۔

غالب نے جس طرح شعر زیر بحث کے پہلے مصرع میں ہمیں سیر وسیاحت کے ضمن میں یہ آزادی بخشی ہے کہ ہم دنیا کے جتنے چاہے شہروں اور ملکوں کی سیر کریں ہمارے اپنے حالات پر منحصر ہے وہاں شعر زیر بحث کی دوسرے مصرع میں ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ اپنی اس سیر وسیاحت کو ایک مجموعی صورت دینا بھی بہت ضروری ہے۔ یہ کیا ہوا کہ دنیا بھر کی سیر کی اور دنیا بھر کے ملکوں اور شہروں کو دیکھا لیکن ان سب ملکوں اور شہروں کو دنیا کی ایک بڑے شہر کی صورت میں نہ دیکھ سکے اور سب شہروں سب ملکوں کو ان کی اپنی اپنی جگہ رکھ کر دیکھتے رہے جیسے انسان کے وحدت معاشرہ سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی سیر وسیاحت کا یہ ایک بلند ترین تصور ہے جس سے غالب ہمیں شعر زیر بحث کے دوسرے مصرع میں متعارف کرا رہا ہے۔ جس طرح پہلے مصرع میں غالب ہمیں ایک طرح دنیا بھر کے شہروں اور ملکوں کی سیر وسیاحت کے لئے ترغیب دلا رہا ہے اسی طرح دوسرے مصرع میں وہ یہ بھی کہہ رہا ہے کہ ان ملکوں اور شہروں کی سیر وسیاحت اور مشاہدہ ہی کافی نہیں ان مشاہدات کو شہر علم کے دروازے سے گزارنا بھی ضروری ہے۔ ان مشاہدات کو اعلیٰ علمی طور طریقوں کی کسوٹی سے گزارنا بھی اپنی سیر وسیاحت کو کسی نتیجے پر پہنچانے

کے مترادف ہے۔ گویا انسان پہلے آنکھیں کھول کر دنیا بھر کی سیر کرے اس کے بعد اپنے اعلیٰ راہنماؤں یعنی امام و پیغمبر اور عالمانہ معیارات سے بھی انہیں دیکھے گویا سیر و سیاحت کے مشاہدات کو مزید منازل سفر سے گزارنے کا اہل بنائے۔ لیکن غالب کے اس تصور سیر و سیاحت کے بلند ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ غالب اپنی سیر و سیاحت کے مشاہدات کو صرف امام اور رسول یعنی روح عصر پر آ کر ختم نہیں کرتا اس کا کہنا ہے کہ نجف کی سیر کے بعد ان مشاہدات کو حقیقت عظمیٰ کے سامنے بھی پیش کرتا ہے تو عجب وجد کے عالم میں خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے۔طوف حرم سے غالب کی مراد اس شعر میں یہ ہے کہ انسان اپنی تمام عمر کے حاصل کو حقیقت عظمیٰ کے حضور میں لے آئے تا کہ اس میں برکت پیدا ہو اور انسان کا یہ سفر جاری بھی رہے کہ طوف حرم کے بعد مرکزیت جو پیدا ہوگی اس کی وحدت کی تو کوئی مثال ہی نہیں ہے۔ یہی چیز آدمی کو بے مثال بنا دیتی ہے۔ دیکھ لیجئے غالب نے انسان کی سیر و سیاحت کے عمل کو طبیعات سے گزار کر مابعد الطبیعات تک پہنچایا ہے جہاں جا کر اس کی بلندیوں کی کوئی انتہا نہیں رہ جاتی۔ مگر ان مشاہدات کے لئے جمالیات کے بے شمار دروازے بھی تو کھل جاتے ہیں۔

انسان کا سفر جمال

(2)

غالب نے غزل کی مقطع میں تو کمال ہی کر دیا ہے۔ پہلے مقطع سن لیجئے

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب
جادۂ رہ کششِ کاف کرم ہے ہم کو

انسان کا سفر جمال لامتناہی ہے اور اس سفر کا باعث انسان کی توقع ہے جو خالصتاً اس کی ذات سے تعلق رکھتی ہے۔ توقع آپ کو کہیں باہر سے خریدنی نہیں پڑتی بس اپنے اردگرد کی دنیا پر ایک بھرپور نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ جیسے ہی آپ نظر ڈالتے ہیں آپ کو پتا چلتا ہے کہ اردگرد کی دنیا تو آپ کو خوش آمدید کہنے کے لئے نجانے کب سے تیار ہے۔ آپ کی ذات سے باہر جو کچھ آمادگی سے لبریز ہے۔ خارج کی ساری کشش اس آمادگی میں پوشیدہ ہی نہیں بہت آشکار بھی ہے۔ آمادگی کا ظاہر اور باطن بھی ہوتا ہے لیکن آمادگی کی کوئی انتہا نہیں ہوتی۔ بس وہ تو آپ کو اکساتی رہتی ہے آگے ہی آگے بڑھنے کے لئے۔

غالب اپنے اس شعر میں یہی تو کہہ رہا ہے ایک توقع جو خارج کی آمادگی سے پیدا ہوتی ہے ہمیں کسی نامعلوم منزل کی طرف لئے جا رہی ہے۔ یعنی ہمارے سفر جمال کی کوئی انتہا نہیں۔کوئی انتہا نہیں کا مفہوم محض ایک لفظ ''کہیں'' سے برآمد ہی نہیں ہو رہا فوارے کی طرح پھوٹ رہا ہے۔ اور کہیں کے لفظ ہی سے ہمیں یہ پتا بھی چل رہا ہے کہ ہمارا یہ سفر بور قسم کا ہرگز نہیں ہوگا اسے تو حسن و جمال کی کیفیات سے لبریز ہونا چاہئے۔ اور پھر توقع کا کہیں لئے چلے جانا مجبوری کا لئے چلے جانا نہیں ہے۔ یہ جانا تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی حسین دوشیزہ آپ کا ہاتھ

اپنے ہاتھ میں لے کر آپ کو کہیں لئے چلی جا رہی ہو۔ لطف کی بات یہ ہے کہ توقع کی یہ دوشیزہ جی ہاں حسین دوشیزہ ایسی نعمت ہے جو ہر انسان کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی ہے۔ اب یہ ایک الگ سوال ہے کہ کوئی اس حسینہ کی طرف توجہ ہی نہ دے۔ توجہ نہ دینے کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوتی کہ یہ نعمت قدرت کی طرف سے مفت جو انسان کو مل گئی ہے اس لئے یہ بھی تو انسانی نفسیات کا ایک بڑا ستم ظریف پہلو ہے کہ آدمی ان انعامات اور عطیات سے فائدہ نہیں اٹھاتا جو اسے قدرت کی طرف سے عطا کئے جاتے ہیں۔ عموماً وہ اپنی نادانی یا عدم توجہی کے باعث ان انعامات کی اہمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کرتا۔

اگر آپ توقع کی اہمیت کو سمجھ لیں تو یہ آپ کو عمر بھر اپنے ساتھ محو سفر رکھ سکتی ہے۔ اور یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ توقع کی رفاقت ہمیشہ حسن و جمال کے ساتھی ہوتی۔ توقع کے حسن و جمال کو کبھی زوال نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ توقع کو آپ کبھی تنگ نظری سے نہ دیکھیں۔ توقع کا سارا حسن اسے وسیع تناظر میں دیکھنے پر منی ہے۔ ممکن ہے اس وقت آپ کا ذہن غالب کے اس مشہور شعر کی طرف جا رہا ہو۔

جب توقع ہی اٹھ گئی غالب
کیا کسی سے گلا کرے کوئی

جی ہاں اس شعر میں غالب یہی بتانا چاہتا ہے کہ اگر آپ توقع کو کسی ایک شخص یا چند اشخاص تک محدود کریں گے تو پھر اس کا بہت بڑا امکان ہے کہ یہ جلد آپ کا ساتھ چھوڑ دے۔ آپ توقع کو جس قدر زیادہ ڈھیل دیں گے۔ اسی قدر زیادہ آسمانوں میں اونچی اڑے گی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے سامنے آئی ہوئی چھوٹی اور غیر اہم توقعات کو یہ کاٹتی بھی چلی جائے گی۔ البتہ آپ کو ایسی صورت حال میں اس بات کا ضرور خیال رکھنا ہوگا کہ آپ اپنی توقع کو اتنی زیادہ ڈھیل نہ دے ڈالیں کہ وہ آپ کی نظروں ہی سے اوجھل ہو جائے۔ جمالیات کا ایک بنیادی اصول یہ بھی تو ہے کہ شئے جمال آپ کی نظروں کے سامنے رہے۔ یا پھر آپ اگر یہ دیکھ رہے ہیں کہ آپ کے پاس اپنی توقع کو ڈھیل دینے کے لئے بے تحاشہ ڈور موجود ہے اور آپ اپنی توقع کو سات آسمانوں تک اڑا سکتے ہیں تو پھر یہ ضروری ہے کہ آپ کی بصارت مع آپ کی بصیرت کے پوری طرح قائم و دائم رہے۔ بہر حال توقع کا آپ کی نظروں کے سامنے رہنا ہی ہمارے مسئلے کا حل ہے۔ نظروں کے سامنے رہنے والی توقع آپ کو ہمیشہ فعال رکھتی ہے۔ اور پر جمال بھی۔

اسی مفہوم کے پیش نظر غالب شعر زیر بحث کے دوسرے مصرع میں کہہ رہا ہے۔ ''جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو'' ۔ اگر دوشیزۂ توقع آپ کا ہاتھ تھامے آپ کو کہیں لئے چلی جا رہی ہے تو آپ کے سامنے راستہ بھی ایک کھلے میدان کی طرح موجود ہے جس میں آپ نہایت آسانی کے ساتھ اپنے قدموں سے جادہ بنا سکتے ہیں۔ اور یہ جادہ ایسا ہی ہوگا جیسے لفظ کرم کے کاف کی کشش ہوتی ہے کہ آپ اسے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق کھینچتے چلے جایئے یہ کھنچتی چلی جائے گی۔ گویا توقع آپ کے لئے قدرت کی طرف سے ایک بہت

بڑی مہربانی عنایت رہ کرم کی صورت رکھتی ہے۔ جس میں آپ کے لئے حسن و جمال کی بے بہا دولت بھی موجود ہے۔ حرکت کی بے شمار توانائیاں بھی آپ کا خیر مقدم کر رہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آپ پر امید رہئے اور اس پر امید رہنے کے ساتھ آنکھیں بھی کھلی رکھئے پھر آپ کے لئے اس دنیا میں کیا کچھ نہیں جو حاضر و موجود نہ ہوگا۔ توقع میں آدمی کے ہاتھ پاؤں بھی پھولنے کے بہت سے امکانات ہوتے ہیں۔ لہٰذا اس خطرے سے بچنے کا علاج بھی غالب اپنے اس شعر میں آپ کو بتا رہا ہے۔ اور وہ علاج یہ ہے کہ توقع کو آپ ایک بے نیازی کے ساتھ اپنی رفاقت کا اعزاز بخشیں۔ حسینہ توقع سے مرعوب ہونے کے بجائے اس کے ساتھ آپ کو ایک مردانہ وار شجاعت کا رویہ اختیار کرنا ہوگا۔

لئے جاتی ہیں کہیں ایک توقع غالب۔ اس مصرع سے جہاں آپ کو یہ پتا چلا ہے کہ توقع ایک حسینہ کی طرح آپ کا ہاتھ پکڑے آپ کو ایک نامعلوم جگہ لئے چلی جا رہی ہے وہاں آپ کو یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ آپ توقع کے بالکل قبضے میں نہیں آ گئے ہیں بلکہ اسے ایک سہارا بنا کر اپنی مرضی سے آگے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔

آپ نے غالب کے جمالیاتی شعور کا کمال دیکھا کہ اس نے راستے کی پگڈنڈی (جادۂ رہ) کو جسے آپ کے قدموں کے نشانات بناتے ہیں۔ اسے کرم کے کاف کی کشش کہا ہے۔ یعنی آدمی کے پاؤں بھی کرم اور مہربانی کا درجہ رکھتے ہیں۔ یعنی آدمی کو اپنے ہاتھوں ہی کا نہیں اپنے پاؤں کا بھی شکر گزار ہونا چاہئے کہ وہ اسے حرکت میں رکھتے ہیں۔ مگر یہ شکر یہ وقت کے کسی خاص حصے کے لئے نہیں ہمیشہ کے لئے ہونا چاہئے کہ آدمی کو ان کی بدولت زندگی کی رونق اور چہل پہل نصیب ہوتی ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ کے پاؤں صرف پہلے سے چلتی ہوئی پگڈنڈی پر ہی چلتے ہیں۔ نہیں نہیں غالب کے شعر میں یہ اشارہ ہی نہیں اشارے بھی ہمیں مل رہے ہیں کہ آدمی کو اپنے پاؤں کا اس لئے بھی مسلسل سپاس گزار رہنا چاہئے کہ وہ اپنے پاؤں کے طفیل نئے سے نئے راستوں پر بھی گامزن ہوتا ہے۔ جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو کا صاف اور واضح مطلب یہ بھی ہے کہ کرم کے کاف کی کشش مسلسل کھینچتی چلی جا رہی ہے۔ مسلسل نئے سے نئے راستے دریافت ہوتے چلے جا رہے ہیں اور آدمی ہے کہ مسلسل سپاس گزاری کے عالم سے گزر رہا ہے اور یہ سپاس گزاری کا عالم کسی بھی عالم مجال سے کم نہیں۔ کرم کے کاف کی کشش بھی کھینچتی چلی جا رہی ہے گویا انسان کے موقلم شوق اپنی مسلسل حرکت تخلیق میں ہے۔

البتہ غالب نے اسی مصرع میں ایک شرط بھی عائد کی ہے۔ یعنی جادۂ رہ کو دیکھنے کی شرط اپنے سے باہر اور خارج کو اس طرح دیکھنے کی شرط جس طرح ایک نقاش اپنے سامنے رکھے ہوئے کاغذ کو دیکھتا ہے اور مسلسل اس پر کچھ نہ کچھ بناتا چلا جاتا ہے۔ میں غالب کا یہ مصرع پھر لکھ رہا ہوں غور فرمائیے ردیف ''ہم کو'' میری بات کی تصدیق کر رہی ہے۔ ''جادۂ رہ کشش کاف کرم ہے ہم کو''۔ یعنی دنیا کے لوگوں کے لئے عام راستہ اور اس پر بنی ہوئی پگڈنڈی عام نظر آتی ہوگی لیکن ہمیں تو یہ کرم کے کاف کی کشش کے طور پر نظر آ رہی ہے۔ گویا استعارہ اس مصرع میں قیامت کا تخلیقی کام سرانجام دے رہا ہے اور ایک تسلسل کے ساتھ اور پھر جیسا کہ میں نے ابتدا میں

عرض کیا تھا یہ تمام برکت اور اعجاز آپ کی نگاہ کا ہے کہ جو آپ نے اپنے اردگرد دیکھا جس کو دیکھ کر آپ کے دل میں توقع نے جنم لیا۔ اور توقع کی پیدائش کے ساتھ ہی گویا آپکو محسوس یہ ہوا تمام دنیا ہمارے عمل پیرا ہونے کے انتظار میں ہے۔ گویا آپ اپنے اردگرد نظر ڈال کر دیکھیں تو آپکو ایک فضائے لطف وکرم ملتی ہے جو اپنی آغوش میں لینے کے لئے ہر طرح تیار و حاضر ہے۔ اور پھر مزید لطف کی بات یہ ہے کہ یہ فضائے جود و کرم جامد ساکن اور اپنی جگہ ٹھہری ہوئی نہیں ہے یہ تو مسلسل حرکت میں بھی ہے۔

اردو سائنس بورڈ کی مطبوعہ

اردو میں انفارمیشن ٹیکنالوجی پر کتابیں

اردو سائنس بورڈ پاکستان کا واحد ادارہ ہے، جس نے دیگر سائنسی اور فنی موضوعات کے علاوہ عصر حاضر کے اہم ترین موضوع "انفارمیشن ٹیکنالوجی" پر اردو میں بنیادی کتابیں شائع کی ہیں اور یہ عام قارئین اور طلبہ میں بے حد مقبول ہیں۔ ہر بڑے شہر کے اہم بک سٹال کے علاوہ دفتر سے براہ راست بھی دستیاب ہیں۔

کمپیوٹر کورس (حصہ اول)	کمپیوٹر کورس (حصہ دوم)	ابتدائی کمپیوٹر گرافکس
ابتدائی کمپیوٹر ہارڈویئر	کمپیوٹر کی بیسک پروگرامنگ	فورٹران
آیئے ڈاس سیکھیں	کمپیوٹر ڈکشنری	انٹرنیٹ ڈکشنری
ماڈل کمپیوٹر بنایئے	سیٹ لائٹ ٹی وی مواصلاتی نظام	کمپیوٹر سائنس

اردو سائنس بورڈ، 299۔ اپر مال، لاہور فون، فیکس: 5758674 فون: 5758475

ادبی تراجم کے مسائل

ڈاکٹر محمد بشیر گورایا

ساؤتھ ایشین ایسوسی ایشن آف ریجنل کوآپریشن (SAARC) بنگلہ دیش کے سابق مرحوم صدر ضیاء الرحمٰن کے اس احساس کا نتیجہ ہے کہ جنوبی ایشیا میں ناخواندگی' افلاس اور اقتصادی عدم مساوات کے خاتمے کے لئے مشترکہ اور مربوط کوششوں کی ضرورت ہے۔

جنوبی ایشیا معدنی وسائل اور ذہنی صلاحیتوں کی دولت سے مالا مال ممالک کا خطہ ہے اور اگر اس بے پناہ دولت کو باہمی کوشش و کاوش کے نتیجے میں بروئے کار لایا جائے تو افلاس و ناخواندگی کا جو عفریت اس علاقے کے عوام کے مستقبل کو ہڑپ کرنے کے لئے آگے بڑھ رہا ہے اس کا بھرپور مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

بنگلہ دیش کے مذکورہ صدر نے اسی احساس و تاثر کے ساتھ علاقے کے ممالک کو اکٹھا ہونے اور خطۂ جنوبی ایشیا کے مسائل کو حل کرنے کے لئے مشترکہ جدوجہد اور سعی پیہم پر آمادہ و تیار کیا۔ بدقسمتی سے اس خطے کی جغرافیائی تقسیم اس انداز سے ہوئی ہے کہ عدم اعتماد و تعاون کی بجائے یہاں شک و شبے اور خوف و ہراس کی فضا ہمہ وقت سایہ فگن رہتی ہے۔ چنانچہ مذکورہ مرحوم صدر کی ابتدائی مساعی کو شکوک کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ علاقے کے چھوٹے ممالک بھارت کے رقبے اور آبادی کی برتری سے ہمیشہ خوف کھاتے رہے ہیں۔ اس کی تاریخی وجوہات بھی ہیں اور کچھ تلخ تجربات کا بھی عمل دخل ہے۔ بھارت نے ایک عرصے سے منی سپر پاور کا روپ دھار رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردگرد کے چھوٹے ممالک میں شکوک و شبہات کی فضا زیادہ گھمبیر ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ شروع میں بھارت بھی صدر ضیاء الرحمٰن کی کوششوں کو اسی انداز میں دیکھتا رہا۔

بھارت کا خیال تھا کہ خطے کے چھوٹے ممالک اس کے خلاف ایک متحدہ محاذ بنانے کی کوشش میں مصروف ہیں' کیونکہ علاقے کے تمام ممالک کی دوستی اور تعلقات کے معیار ہمیشہ سے مختلف چلے آرہے ہیں اور خطے سے باہر ان کے حلیفوں اور حریفوں کا دائرہ بھی بڑی حد تک ایک دوسرے سے جدا ہے۔ اس بنا پر کافی عرصے تک پرخلوص کوشش کامیابی سے ہمکنار نہ ہوسکی۔ ہر ملکی قیادت اس بات پر مصر تھی کہ جب تک علاقائی تنازعات اور سیاسی اختلافات کا مثبت اور پائیدار حل سامنے نہیں آتا۔ محض اقتصادی' ادبی و ثقافتی' معاشرتی اور تکنیکی شعبوں میں

تعاون کی ہر کوشش عبث ہوگی۔
اعلیٰ سطحی رابطوں اور جنوبی ایشیا کے حقیقت پسند راہنماؤں کے میل جول کے نتیجے میں بالآخر ایک ایسی غیر سیاسی تنظیم کے قیام پر آمادگی کا اظہار ہوا' جو تجارت' صنعت' سائنس' ٹیکنالوجی' ادب وثقافت اور سماجی شعبوں میں تعاون کے امکانات کا جائزہ لے کر انہیں عملی شکل دینے کی کوشش کرے' ابھی اس تعاون کے امکانات اور اسے عملی شکل دینے کے طریقے پر بحث وتمحیص کا مرحلہ بھی نہیں آیا تھا کہ بنگلہ دیش کے مذکورہ صدر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تاہم بنگلہ دیش کی قیادت نے روابط کا سلسلہ ٹوٹنے نہ دیا اور بتدریج اس کی جانب پیش رفت جاری رکھی۔ پہلے مرحلے پر علاقے کے تمام ممالک کو یہ یقین دلایا گیا کہ اس تنظیم کے قیام سے کسی ملک کی خارجہ پالیسی ہرگز متاثر نہیں ہوگی۔ سیاسی تنازعات کی بنا پر رکن ممالک ایک دوسرے کے خلاف خفیہ اور کھلی سازشوں کی راہ اختیار کر کے کسی ایک ملک کو الگ تھلگ کرنے کی کوشش نہیں کریں گے اور نہ کوئی ملک اپنے آپ کو بے بس وتنہا محسوس کرے گا۔ اسی طرح یہ یقین دہانی بھی کروائی گئی کہ کوئی ملک اس تنظیم کو اپنا آلہ کار بنا کر دوسروں پر اپنے فیصلے نہیں ٹھونسے گا۔
چنانچہ مسلسل جدوجہد اور سفارتی روابط کے بعد 1985ء میں پہلی سارک کانفرنس ڈھاکہ میں منعقد ہوئی۔ جس میں سارک کے بنیادی ڈھانچے اور مقاصد کا اعلان کیا گیا۔ اعلان ڈھاکہ میں رکن ممالک نے ایک دوسرے کی داخلی اور خارجی خود مختاری اور اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے' سالمیت کے تحفظ کو یقینی بنانے اور مشترکہ وسائل کو علاقے کی تعمیر وترقی اور خوشحالی کے لئے بروئے کار لانے کا عہد کیا۔ علاوہ ازیں علاقے کے عوام کو غربت' ناخواندگی' اقتصادی محرومیوں اور ناانصافیوں سے نجات دلانے کی نوید سنائی گئی۔ اس موقع پر علاقے کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے کے لئے ہر سال سربراہ کانفرنس کا انعقاد اور سفارتی و وزارتی سطح پر رابطوں کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ رکن ممالک کے مابین تجارت' صنعت' ادب وثقافت' سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبوں میں تعاون بڑھانے کے لئے وفود کے تبادلے' سیمینار اور تقریبات کے انعقاد اور علمی وادبی سرگرمیوں کے فروغ پر بھی زور دیا گیا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ سربراہ کانفرنس باری باری رکن ممالک میں منعقد ہوا کرے گی۔ اس موقع پر نہ صرف سیاسی تنازعات کو اٹھانے سے گریز کیا گیا' بلکہ یہ بھی فیصلہ ہوا کہ کسی نئے ملک کی رکنیت کا مسئلہ اتفاق رائے سے طے کیا جائے گا تاکہ کوئی ملک اپنی برتری قائم کرنے کی راہ ہموار نہ کر سکے۔
اس وقت تک کئی سربراہ کانفرنسیں منعقد ہو چکی ہیں۔ اتفاق سے بنگلور اور نیپال کی کانفرنسیں ایسے موقع پر منعقد ہوئیں جب علاقائی مسائل میں کافی حد تک شدت آ چکی تھی۔ مگر ان کانفرنسوں کے ذریعے حالات کو معمول پر لانے کے لئے بہت مدد ملی کیونکہ سارک کا دائرہ کار غیر سیاسی امور تک محدود ہے۔ اس لئے رکن ممالک غیر سیاسی شعبوں میں ایک دوسرے سے تعاون میں کسی ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہیں۔ لیکن جو عملی مشکلات موجود ہیں' ان کے حل کے لئے بھی زمینی حقائق کا صدق دل سے تسلیم کرنا' اعتماد کی فضا اور خوشدلانہ دوستی درکار ہے۔

اس عرصے میں صنعت و تجارت' ادب و ثقافت کے شعبوں میں مثبت سرگرمیوں کو جلا ملی ہے اور رکن ممالک کے مابین وفود کے تبادلوں کی رفتار تسلی بخش رہی ہے۔ اہل علم و ہنر کو ایک دوسرے کی تحقیقات' تخلیقات اور ذہنی کاوشوں سے استفادہ کرنے کی مزید کوشش کرنے کی ضرورت ہے۔ طویل عرصے تک اختلافات اور غلط فہمیوں کی جو فضا پہلے سے پائی جاتی ہے اس کے باعث فراخدلانہ تعاون کا وہ مظاہرہ نہیں ہو سکا جو سارک کا نصب العین ہے۔ علاقے کے عوام کو بخوبی احساس ہے کہ جب تک حقائق کو دل و جان سے قبول کر کے تنازعات' ناخواندگی' غربت اور بیماری کے خاتمے کے لئے تمام ممالک نیک نیتی کے ساتھ اپنے وسائل کو مشترکہ اور مربوط حکمت عملی کا حصہ بنا کر آگے نہیں بڑھتے خوشحالی اور تعمیر و ترقی کی منزل حاصل نہیں کی جا سکتی۔

اب تک مشترکہ فلم سازی اور محدود پیمانے پر درآمد و برآمد کے جو منصوبے شروع ہوئے ہیں ان سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ رکن ممالک کے عوام ایک دوسری کے تجربات سے فائدہ اٹھانے کی مخلصانہ خواہش رکھتے ہیں۔ اگر اختلافی مسائل کو بھی اسی جذبے اور احساس کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ زبوں حال خطہ امن و خوشحالی کا عظیم گہوارہ نہ بن سکے۔

اس وقت تمام ممالک تجارتی و صنعتی اور تکنیکی شعبوں میں جنوبی ایشیا کے باہر کے ممالک سے روابط قائم رکھنے اور ان کی شرائط پر اپنے قومی منصوبوں کو پروان چڑھانے پر مجبور ہیں۔ یہی حال ادب و ثقافت اور سماجی ترجیحات کا ہے حالانکہ درآمد و برآمد' سائنس و ٹیکنالوجی اور ادبی و ثقافتی دوائر میں سارک کے رکن ممالک کی ترجیحات اور ضروریات بڑی حد تک ایک دوسرے سے مماثلت رکھتی ہیں۔

ہمارے بڑے مسائل ایک جیسے ہیں۔ ہم سب غربت و ناخواندگی اور سماجی ناانصافیوں کے ڈسے ہوئے ہیں۔ بڑی طاقتوں کی کشمکش میں بھی اس علاقے کے قریباً سارے ممالک کی حیثیت ثانوی ہے ہم اگرچہ مذہب اور سیاست کے الگ الگ خانوں میں تقسیم ہیں مگر ہمارے عوام بلاشبہ صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ گہرے سماجی رشتوں میں منسلک چلے آ رہے ہیں۔ اس بنا پر سارک کے ممالک کی اقتصادی' سماجی' ادبی' ثقافتی اور تکنیکی ترقی کے لئے ایسے جامع منصوبوں کی ضرورت ہے جو سارے ممالک کے عوام کو بیک وقت ایک دوسری کے شانہ بشانہ ترقی کی منازل کی طرف لے جا سکیں۔ دانشوروں کا فرض ہے کہ قلم کے ذریعے علاقے میں قیام امن کے لئے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور علاقے کے عوام کی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کو مشترکہ مسائل کے خاتمے کی طرف راغب کرنے کے لئے اپنا فرض ادا کرتے رہیں۔ اس ضمن میں اب تک جو کوششیں ہوئی ہیں وہ ناکافی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان' نیپال' بنگلہ دیش اور سری لنکا کے مابین مشترکہ فلم سازی اور پاک بھارت ادبی و ثقافتی وفود کے تبادلوں کے باوجود چربہ سازی جاری ہے کیونکہ تخلیقات کی اجازت سے اشاعت کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ دانشوارنہ سطح پر روابط کا دائرہ بھی محض شاعروں اور ادیبوں کی ملاقاتوں تک محدود رہا ہے۔ جن علمی و ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ کا عندیہ ظاہر کیا گیا تھا وہ بھی ابھی تک مشاعروں اور ادبی محفلوں سے آگے نہیں بڑھ سکا یا

زیادہ سے زیادہ فنکاروں کی آمد و رفت تک محدود ہے سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبے میں اگرچہ ہم کسی قابل ذکر مقام کے حامل نہیں مگر جہاں تک ہم ترقی کر سکے ہیں اس سے ایک دوسرے کو مستفید کرنا ضروری ہے تاکہ جدید زندگی کی ضروریات حاصل کرنے اور عوام کو اطمینان بخش مستقبل کی طرف پیش رفت کا خاطر خواہ گمان ہو سکے۔

تاریخی یادگاروں قابل دید مناظر اور مقدس مقامات کی سیاحت و زیارت کا دائرہ سماجی تعلقات کے فروغ اور باہمی افہام و تفہیم میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ کیونکہ اس سلسلے میں رکن ممالک کے عوام کی دلچسپیاں کافی زیادہ ہیں اور انہیں ایک مثبت جہت بھی دی جا سکتی ہے۔ مگر بنیادی تنازعات کے باعث پابندیوں اور بھاری سفری اخراجات کی بنا پر ابھی تک اس کے خاطر خواہ فوائد سامنے نہیں آ سکے۔ یہ حقیقت ہے کہ تعلقات کے فروغ میں لسانی روابط اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مگر ناخواندگی اور علیحدہ لسانی تشخصات کے سبب لسانی روابط کی کوئی بنیاد فراہم نہیں ہو سکی۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ اگر ہم بالفرض ناخواندگی کے خاتمے میں کامیاب بھی ہو جائیں تو ہر ملک میں ناخواندگی کے خاتمے کے لئے جو کوششیں ہو رہی ہیں وہ ایک دوسرے سے اس قدر الگ اور ان کا رخ اس قدر متضاد و مخالف ہے کہ تمام ممالک میں خواندگی میں اضافے کے باوجود ان لسانی روابط کا کوئی امکان نہیں جو مختلف اقوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ پاکستان میں اردو کا فروغ اور بھارت میں اردو کی بیخ کنی اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اس بنا پر تجویز کیا جاتا ہے کہ سارک کے رکن اپنی اولین ترجیح کے طور پر اپنے ہاں دوسرے ممالک کی زبانوں کی تعلیم اور فروغ کے لئے یونیورسٹیوں کی سطح پر اور بڑے بڑے شہروں میں سارک سنٹرز کے نام سے ایسے مراکز اور ادارے قائم کریں جہاں دلچسپی رکھنے والے افراد کو بغیر کسی اخراجات کے نہ صرف مطلوبہ زبان سیکھنے اور اس ملک کی ادبی و ثقافتی روایات و اقدار سے آگاہ رہنے کا موقع مل سکے۔ بلکہ دوسروں کا رخ بھی دوستی کی اس شاہراہ کی طرف موڑ سکیں۔ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر پاکستان میں ہندی' بنگلہ' سہالی اور اسی طرح دیگر زبانیں سیکھنے اور سکھانے کا بندوبست ہو اور بھارت میں اردو' بنگلہ اور دوسری علاقائی زبانوں کی ترویج و ترقی کا کام ہو رہا ہو تو عوام 'بُعدِ ابلاغ' کے سبب ایک دوسرے کے بارے میں جن شکوک و شبہات کا شکار ہیں' ان سے بڑی حد تک چھٹکارا پا کر انہیں آپس میں قریب لانے کا موقع مل سکتا ہے۔ اس صورت میں ذہنی تخلیقات اور ثقافتی سرگرمیوں کا دائرہ بھی وسیع ہو سکتا ہے۔ فنون لطیفہ کے ساتھ ساتھ دوسرے شعبوں میں بھی بہتر ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے۔ سارک کے ممالک اور تنظیم کے کام کو اس سلسلے میں مناسب اقدامات سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔

تسلیم حقائق کے بعد دراصل زبان فہمی ہی مشکل ترین مرحلہ ہے۔ جس کے حل ہو جانے کے بعد دوستی اور خیر سگالی کے سلسلے میں اٹھنے والا ہر قدم آسان ہو جاتا ہے۔ ادب کی ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقلی جو بظاہر مشکل اور دشوار نظر آتی ہے زبان سیکھ جانے کے بعد انتہائی سہل ہو جاتی ہے۔ دوستی کا یہ سفیر جسے مہذب دنیا میں ادب کے نام سے پکارا جاتا ہے درحقیقت انسانی زندگی کے تجربات و مشاہدات' جذبات و احساسات اور

معاشرتی وتہذیبی اقدار کا موثر اور دلکش پیرائے میں بیان کرنے والا ترجمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک ملک کا ادب دوسرے ملک میں جاتا ہے تو عوام ایک دوسری سے روشناس ہوتے ہیں اور جب وہ ایک دوسرے کے رہن سہن' افعال واعمال اور عادات واطوار کی مشترکہ قدروں سے آگاہ ہوتے ہیں خوشی' غم' حیرت یا غیض وغضب کے موقعوں پر انہیں لہجے کے آہنگ میں مماثلت کا پتہ چلتا ہے تو وہ ایک دوسرے کے اس قدر قریب آجاتے ہیں کہ اختلافات وتنازعات ختم کرنے کے لئے ہٹ دھرمی کی بجائے افہام وتفہیم کے جذبے سے کام لینے لگتے ہیں۔

اجنبیت کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ محبت' دوستی اور دردمندی کے روشن چہرے نمودار ہوتے ہیں۔ سارک ممالک جن کا اصل مشن بھی یہی ہے کہ اس کے ممبر ملکوں میں تعاون بڑھے' اس کے عوام اور اس کی حکومتیں مل جل کر بھوک' افلاس اور ناخواندگی کے خلاف علم جہاد بلند کر کے ان کے خاتمے کے لئے کمربستہ ہو جائیں۔ انہیں چاہئے کہ دوستی کے اس سفیر کی خدمات حاصل کریں۔ مگر اس کی خدمات حاصل کرنے سے پیشتر انہیں ادب کی منتقلی کے واحد ذریعہ یعنی ترجمے کے مسائل کو ترجیحی بنیادوں پر حل کرنا ہوگا۔ جس کے بغیر ادب کی منتقلی کے سلسلے میں ہر کوشش بے سود ہوگی۔ امید کی جاسکتی ہے کہ مجوزہ سارک سنٹرز اس سلسلے میں بہت ہی ممد ومعاون ثابت ہوں گے کیونکہ ان سنٹروں سے زبان سیکھنے والے افراد کی ایک ایسی ٹیم سارک تنظیم کو میسر آئے گی جو ادبی تخلیقات کے ترجمے کے کام کو بآسانی آگے لے جاسکے گی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہوگی کہ ان افراد کو فکر معاش سے بے نیاز کر دیا جائے تا کہ وہ اس کام کو دلجمعی اور خوشدلی کے ساتھ اس طرح انجام دیں کہ لوگوں کو اس میں اصل کا مزہ آئے۔ اس میں درج دوسروں کی واردات وکیفیات میں انہیں اپنی زندگی کا عکس نظر آئے۔ جس کے نتیجے میں دردمندی کا ایک ایسا احساس ان میں جنم لے جو انہیں محبت کے ایسے مقام پر لے آئے جہاں وہ دوسروں کے درد کو اپنا درد سمجھنے لگیں۔ چونکہ ہر زبان کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے جسے سمجھے بغیر ترجمے کی حقیقی منزل کو نہیں پایا جاسکتا۔ اس لئے سارک سنٹرز سے ابھرنے والے مترجموں کے لئے یہ بھی انتہائی ضروری ہوگا کہ وہ کسی بھی ادب پارے کے ترجمے سے پہلے زبان فہمی کے ساتھ اس زبان کے مزاج کا شعور بھی حاصل کریں جس کے ذریعے وہ ترجمے کا کام انجام دینا چاہتے ہیں۔ جیسے انگریزی الفاظ میں 'See You' کا مفہوم اردو میں ''دیکھوں گا تمہیں'' سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ زبان کے مزاج سے ناواقف مترجم کو ٹرانسلیشن اصل منزل سے میلوں دور لے جاتی ہے۔ ترجمے کی راہ میں حائل اس منزل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے سارک تنظیم کے ممبر ممالک کو اس بات کا خصوصی انتظام کرنا ہوگا کہ وہ اپنے مترجموں کو متعلقہ ممالک میں بھیجیں اور انہیں وہاں کچھ عرصے قیام کا موقع دیں تا کہ وہ وہاں کے لوگوں سے مل جل کر ان کی زبان کے مزاج سے آگاہی حاصل کرسکیں۔ صرف اسی ایک صورت میں صحیح ترجمہ قارئین تک پہنچ سکے گا۔ جس کے نتیجے میں مطلوبہ نتائج کے حصول کی امید کی جاسکے گی۔

ترجمے کے لئے ادبی تخلیقات کا انتخاب بھی ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے صرف نظر سارک کے بلند پایہ

عزائم کی تکمیل کی راہ میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوگا۔ اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ غیر منتخب ادب غیر معیاری ہونے کے سبب اپنی افادیت کھو بیٹھے اور قارئین کی دلچسپیوں کا مرکز بننے سے قاصر رہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر تنظیم کو اس بات کا اہتمام بھی کرنا ہوگا کہ ادبی تخلیقات کے انتخاب کے لئے اس کے پاس ماہرین کی کمیٹی ہو جس میں ہر ممبر کے دو دو یا تین تین ادبی ماہر ہوں۔ جو سارک کے مقاصد کو سامنے رکھ کر ادب کا انتخاب کریں۔ درحقیقت' حقیقی ادب بھی وہی ہے جو عوام کے ذہنوں سے جہالت' تنگ نظری اور تعصب دور کر کے ان میں محبت خیر سگالی' رواداری' اعلیٰ ظرفی اور بھلائی پیدا کرے۔

ٹھوس بنیادوں پر قائم ہونے والے سارک سنٹرز کے علاوہ سارک کے ممبر ملکوں میں موجود ان کے اپنے ادبی و ثقافتی ادارے بھی ادبی تراجم کے اس محنت طلب کام کو نہ صرف بخوبی انجام دے سکتے ہیں بلکہ سارک مشن کو یقین و اعتماد کی فضا میں آگے بڑھانے اور تیز کرنے میں ایک تاریخی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اخبارات بھی مختلف ممالک اور ان کے عوام کو قریب تر لانے کا موثر ذریعہ ہیں۔ اس لئے سارک کی تنظیم اخبارات و جرائد کا تعاون حاصل کر کے ان کی روزمرہ یا ہفتہ وار ادبی اشاعت میں سارک ممالک کے ادبی تراجم کے لئے جگہ مخصوص کروا سکتی ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی اپنی اپنی حکومتوں کی وساطت سے ایسے پروگرام وضع کر سکتے ہیں جن کے ذریعے سارک ممالک میں ہونے والی ادبی کاوشوں کے تراجم عوام کے سامنے دلکش انداز میں پیش کئے جا سکیں۔

زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے جرائد و رسائل اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سارک ممالک کے معتبر جرائد کے صفحات اس کام کے لئے مختص کرائے جا سکتے ہیں اور ''سارک'' اپنے زیر اہتمام جریدے کے اجراء کے ذریعے ممبر ملکوں کے عوام کو ان ملکوں کی زبانیں بھی سکھا سکتا ہے۔ ان کی ادبی سرگرمیوں سے باخبر رکھنے کے ساتھ' ادب پاروں کے ترجمے پیش کر کے انہیں ایک دوسرے کے قریب بھی لا سکتا ہے۔ مزید برآں یہ جریدہ عوام میں غیر ملکی ادب کے مطالعے کا ذوق بیدار کر کے اسے اپنی زبان میں منتقل کرنے کی طرف بھی راغب کر سکتا ہے۔ اس طرح جریدے کی اشاعت سے نمو پانے والا یہ عمل ادب پاروں کے تراجم کے مسئلے کا بہترین حل ثابت ہو سکتا ہے۔

سارک سنٹرز کی طرز پر یونیورسٹیوں میں بھی ''سارک'' کے ممبر ملکوں کی زبانیں سیکھنے سکھانے اور ایک دوسری زبان میں ادب کی منتقلی کے کام کو ''سارک لینگوئجز'' کے نام سے شعبے قائم کر کے استوار کیا جا سکتا ہے۔ طلباء کو اس شعبے کی طرف راغب کرنے کے لئے ضروری ہوگا کہ ایسے طلباء کو جو اس شعبے میں شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کریں سارک کے ملکوں کی سیر کروائی جائے اور ان کے لئے سارک وظائف کا اہتمام کیا جائے۔

ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ زبان سیکھ جانے کے بعد ذخیرۂ الفاظ کی کمی ایک ایسا مسئلہ ہے جو انسان کی ہر عملی کوشش کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ جسے دور کرنے کے لئے ''لغت'' کے وجود کو ضروری گردانا گیا ہے۔ سارک کے کام کو آگے بڑھانے کے لئے بھی ایک ایسی لغت کا وجود بے حد ضروری ہے جس میں تمام ممبر

ملکوں کی سرکاری زبانوں کے مترادفات موجود ہوں۔ سارک ممالک کی تعداد سات ہے اس لئے "ہفت زبانی لغت" کے نام سے اس کی تیاری اور اجراء کا کام' ساتوں ملکوں کے زبان و ادب کے ماہرین کی سرکردگی میں پایہ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے۔ زبان فہمی اور تراجم کے ذریعے ادب کی منتقلی کے لئے بلاشبہ یہ ایک عظیم کام ہوگا۔

عطاالحق قاسمی کی شگفتہ تصانیف

پڑھنے والوں کو جس کے ہر نئے ایڈیشن کا انتظار رہتا ہے

بارہ سنگھے | ڈھول ڈھپا | گوروں کے دیس میں
عطائیے | حبس معمول | آپ بھی شرمسار ہو
خندِ مکرّر | شوقِ آوارگی | مزید گنجے فرشتے
بازیچۂ اعمال | دلی دور است | دنیا خوبصورت ہے
کالم تمام | روزنِ دیوار سے

دعا پبلیکیشنز C/25 'لوئر مال' لاہور

سفر ناموں کی تاریخ و تدوین

ڈاکٹر عصمت ناز

سفر ازل سے انسان کا مقدر رہا ہے خواہ یہ سفر زندگی کا ہو' خواہشات کا ہو یا رزق کی تلاش کا' نت نئی جگہیں دیکھنے کا ہو یا مختلف علاقوں کی تہذیب و ثقافت سے آشنائی کا...... انسان نے جنت سے زمین کا سفر طے کیا اور پھر تب سے مسلسل سفر میں ہے۔ قرآن کریم میں اس سفر کو بیان کر کے گویا اللہ تعالیٰ کی ذات نے انسان کے اس سفر کا حال بیان کر دیا ہے اور شاید یہی سفر ناموں کی تاریخ کا معتبر آغاز ہے۔

اسکے بعد پیغمبروں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی سفر کئے اور اپنے سفر کے احوال وہ اپنے ساتھیوں اور حواریوں سے بیان کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ کبھی یہ سفر ضرورت کے تحت تھے' کبھی تبلیغ کی خاطر اور کبھی اللہ کا نام بلند کرنے کی کوشش میں وہاں کے مقامی لوگوں نے جب انتہائی تنگ کیا تو سفر مجبوری بن گیا۔ اور کبھی ایک بادشاہ کے دربار سے دوسرے بادشاہ تک رسائی کا سفر' کبھی موسیٰ کا بچپنے کا دریا میں سفر کبھی ملکہ سبا کا سلیمانؑ کے دربار میں سفر' کبھی نوح علیہ السلام کا کشتی میں سفر' کبھی ہاجرہ اور اسماعیلؑ کا سفر اور پھر پیغمبر آخرالزمان کے ماننے والوں کا ہجرت کا سفر حبشہ اور پھر خود آپ کا سفر ہجرت جو مدینہ کی طرف ہوا اور آپؐ نے مختلف علاقوں میں جو سفر کئے وہ آپؐ اور آپؐ کے صحابہ کرام کی زبانی جب لوگوں تک پہنچے تو اپنی دیگر نوعیتوں کے علاوہ وہ سفر ناموں کی حیثیت بھی رکھتے تھے۔

علاوہ ازیں تجارت کی غرض سے سفر اور پھر سفر معراج بھی آپؐ کی پہچان ہیں۔ یعنی سفر سنت انبیاء رہا اور پھر اولیاء اور صالحین نے بھی اس روایت کو زندہ رکھا۔ خلفائے راشدین نے بھی فتوحات کے ضمن میں بے شمار سفر کئے۔ اور مشرق سے مغرب تک اسلام کا نام روشن کر دیا۔

صرف یہ ہی نہیں بلکہ صحراؤں اور وادیوں کے علاوہ دریاؤں اور سمندروں کا سینہ چیر کر بھی ان طالع آزماؤں نے سفر کو جاری و ساری رکھا۔

پھر جب حدیث کے لئے تدوین کی کوششیں ہوئیں تو مدونین حدیث نے سفر کرنے کے گذشتہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے اور گلی گلی محلے محلے' شہر شہر وہ لوگوں سے ملنے اور ان سے پوچھنے کی خاطر گئے اور تب کہیں جا کر یہ

کام پایہ تکمیل کو پہنچا۔

اس طرح سے اندلس، عراق، مدینہ، مکہ، چین، روم، شمالی افریقہ، ہندوستان، ایران، روس، افغانستان غرضیکہ ہر ملک کے لوگوں نے ایک سے دوسرے ملک کا سفر کیا، تعلیم حاصل کی نوادرات جمع کئے۔ آستانے بنائے اور بعض تو ہجرت کے دوران ہی انتقال فرما گئے اور پھر وہ ادھر ہی دفن ہوئے اور ان کے مزارات آج بھی مرجع خلائق ہیں اور سفر کی روایت کو زندہ رکھتے ہیں۔

ان میں ایک بڑی مثال حضرت داتا گنج بخشؒ کی ہے جو لاہور میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ خواجہ معین الدین چشتیؒ نے بھی زندگی کا بڑا حصہ سفر میں گزارا۔ یعنی دنیا کی یہ عظیم مذہبی شخصیات سفر کو وسیلہ ظفر قرار دیتی رہیں اور اپنے اپنے مقاصد کے حصول کے لئے انہوں نے سفر سے کبھی گریز نہیں کیا بلکہ اپنے شاگردوں کو بھی سفر کی تلقین کی۔

عظیم شخصیات کے علاوہ مشہور انسانوں نے بھی سفر کئے اور ان کے بیانات بھی تاریخ کا حصہ ہیں یا پھر سفر ناموں کی تاریخ میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سکندر یونانی نے فتوحات کے ضمن میں یونان سے ہندوستان تک تاخت و تاراج کی تو اس کے جواب میں چندر گپت موریہ نے بھی یونانیوں کے خلاف آواز بلند کی اور پنجاب کا حکمران بن بیٹھا اور اسی دھاک کی وجہ سے سکندر کے ایک جرنیل نے اپنی بیٹی اس سے بیاہ دی۔ اس تمام سفر میں شہزادی کے ساتھ میگستھنیز تھا جس نے تمام سفر کی داستان، گزرنے والی علاقوں کے متعلق معلومات اور بالخصوص ہندوستان کی رسم و رواج، تہذیب و ثقافت، درباری آداب وغیرہ کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے، وہ سفر ناموں کے ساتھ کے ساتھ ایک تاریخی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔

اسی طرح سے فاھیان نے جب ہندوستان کا سفر کیا تھا تو اس نے بھی ہندوستان میں بدھ مت کے مقدس مقامات ان کے احوال اور یہاں کے متعلق دیگر بیانات کو پیش کر کے گویا اس دور کو زندہ کیا ہے۔

چین ہمیشہ سے ایک اہم ملک رہا ہے اور اس کی اپنی تہذیب و ثقافت اور الگ پہچان ہے۔ اور محمد مصطفیٰؐ نے علم حاصل کرو خواہ چین تک جانا پڑے فرما کر اس کی اہمیت کو دوچند کر دیا۔ اگرچہ اس کا مطلب خاص چین سے نہیں بلکہ علم کے حصول کے لئے دور دراز کے سفر کی طرف لطیف اشارہ تھا لیکن اس سے چین کا نام احادیث میں محفوظ ہو گیا۔

لیکن اہل چین بھی دیگر علاقوں کے سفر میں سرگرم عمل رہے ہیں اور انہوں نے مختلف ملکوں کی طرف مختلف اغراض و مقاصد سے سفر کیا۔ ان میں ''ھیونگ شیانگ'' نے زیادہ شہرت حاصل کی۔ اس نے پندرہ سال تک ہندوستان کے مختلف علاقوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا۔ اور پھر ان تمام یادداشتوں کو ایک جامع شکل میں پیش کیا۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

اہل عرب جیسا کہ ابتدا میں ذکر ہوا ہے کہ نبیوں کے حوالے سے سفر کی داستانیں رکھتے ہیں۔ اور اسلام

کی تبلیغ کے سلسلے اور احادیث کی تدوین و تجمیع کی خاطر بھی ان لوگوں نے سفر کئے۔ اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کے ساتھ ساتھ سفر کی قوت اور روایت بھی زیادہ پنپنے لگی اور خاص طور پر اس کی وجہ کا ایک دینی حوالہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسلام میں ''حج'' کو صاحب حیثیت شخص پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ اور دنیا کے کسی بھی خطے میں بسنے والا مسلمان شخص لازماً حج کے لئے سفر کرے گا۔ اور اس کے احباب، دوست اور دیگر جاننے والے عقیدت کے باعث اس سفر کے حالات کو جب سنتے ہیں یا جاننے کی کوشش کرتے ہیں تو اس کے جواب میں خود بخود سفر نامہ جنم لیتا ہے خواہ یہ تحریری شکل میں ہو یا زبانی بیان کی صورت میں لوگوں کے اذہان میں محفوظ ہو رہا ہو یہ سفر نامہ کی ہی شکل ہو گی۔ اور پھر یہ ایک شخص سے دوسرے اور ایک گروہ سے دوسرے گروہ میں منتقل ہوتا ہے اور مسلسل سفر کرتا ہے۔

اسی طرح سے روسی علاقوں کے سربراہوں[1] نے عرب خلفاؤں کو درخواست بھیجی تھی کہ ہمارے ہاں کچھ مبلغین کو بھیجا جائے تا کہ ہم لوگ دین کو سمجھ سکیں اور کچھ مساجد اور قلعے بھی تعمیر کروا دیں تا کہ ہم دشمنوں سے محفوظ رہ سکیں۔

چنانچہ عباسی فرمانروا المقتدر باللہ[2] نے ابن خفلان کی قیادت میں ایک وفد بھیجا جو بغداد سے روانہ ہو کر ہمدان، نیشا پور، دریائے جیحون، بخارا، خوارزم وغیرہ کے راستے بالآ خراز بکستان اپنی جائے مقام پر پہنچا۔

ابن خفلان نے ان تمام دنوں کے واقعات اور حالات کو جس طرح سے بیان کیا ہے وہ سفر نامے کی ایک عجیب شان کو ظاہر کرتے ہیں اور ساتھ ہی سفر کرنے والی قوت مشاہدہ کو بھی ظاہر کرتے ہیں کہ اس نے دوران سفر کس قوت و باریک بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ گویا عربوں نے سفر ناموں کو زندہ رکھنے میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

اس کی ایک اور مثال ایک اور عرب سیاح کی ہے جسکا نام ابو عبداللہ محمد مقدسی[3] ہے۔ جس نے خاص طور پر تمام اسلامی دنیا کا دورہ کیا اور اپنی بیس برس کی طویل و عریض سیاحت کے ذریعے سے اس نے دنیائے اسلام بالخصوص مراکش سے تاشقند تک کے رہنے والوں کا رہنے سہنے کا طرز تجارتی امور ان کی فن سازی وغیرہ کے متعلق بہت عرق ریزی سے مطالعہ کیا، انہیں اکٹھا کیا اور اس طرح آنے والوں کو نہ صرف سفر کی دعوت دی، بلکہ اس دور کو بھی ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔

ابو ریحان البیرونی مشہور محقق، مورخ، جغرافیہ دان، ہیئت دان جس کا نام محتاج تعارف نہیں اس کا تعلق خوارزم کے علاقے سے تھا۔ اس نے اس وقت ہندوستان کا رخ کیا جب یہاں محمود غزنوی برسر اقتدار تھا۔ البیرونی نے نہ صرف ادھر کا سفر اختیار کیا تھا بلکہ اس نے زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل کی۔ اور سنسکرت[4] جیسی مشکل زبان کو سیکھا اور پھر ادھر طویل قیام میں اس نے جو کچھ دیکھا اس کو اس نے ''کتاب الہند'' کے نام سے تحریر کیا۔ اس کے اندر موجودہ پاکستان کے مختلف علاقوں بالخصوص ملتان اور لاہور کا ذکر بھی ملتا ہے۔ البیرونی نے اس ضخیم کتاب یا سفر نامے میں ادھر کی یعنی ہندوستان کی رسم و رواج، تہذیب و ثقافت، عادات و اطوار۔ ادھر کی

مذہبی روایات، فلسفے، جوتش، ادب، ہیت غرضیکہ ہر شعبے اور ہر طبقہ ہائے فکر کے متعلق بہت گہرائی کے ساتھ تحریر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''کتاب الہند'' ایک مستند حوالے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ہندوؤں نے[5] اسے ''ودیا ساگر'' کا خطاب دیا تھا۔

البیرونی نے عربی زبان میں بھی تصانیف رقم کی ہیں یہی وجہ ہے کہ اس کی مقبولیت عرب وعجم اور مشرق ومغرب میں یکساں ہے۔ اندلس جب سے طارق بن زیاد کے ہاتھوں فتح ہوا تھا تب سے وہاں سے شائقین مذہب عرب دنیا بالخصوص مکہ اور مدینہ کا رخ کرتے تھے کیونکہ مقدس مقامات کے علاوہ یہاں پر بسنے والی مقدس ہستیاں جو علم وہنر کا فیض جاری رکھے ہوئے تھیں اہل اندلس کے لئے کشش کا باعث تھیں۔ اندلس کے مسلم حکمرانوں کی سرپرستی اور خاص طور پر علم دوستی کی وجہ سے بے شمار لوگوں نے سفر کیا اور اپنے سفر کو تحریری شکل بھی دی۔ اس دور کے سفرنامے بھی تاریخی حیثیت کے حامل ہیں۔

اندلس کے سفر نگاروں میں ابن جبیر کا نام خاصا معتبر ہے جس کا مقصد سفر اگرچہ حج بیت اللہ[6] تھا لیکن آمد ورفت کے دوران اس نے مختلف راستہ اختیار کیا اور جس جس علاقے اور شہر سے اس کا گزر ہوا اس نے وہاں کے حالات اور لوگوں، عمارات اور روایات وغیرہ کو بہت دلچسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اور مختلف علاقوں کی خوبصورتی، دریاؤں اور مختلف چیزوں کو ایک ایسی صورت میں بیان کیا ہے کہ یہ ایک اعلیٰ ازلی فن پارہ شمار کیا جا سکتا ہے۔ جس میں قاری کی دلچسپی ابتدا سے انتہا تک برقرار رہتی ہے۔

اندلس کے ملحقہ علاقے مراکش کے شہر طنجہ نے ابن بطوطہ[7] کے حوالے سے تاریخی، یادگار اور عالم گیر شہرت حاصل کی۔ ابن بطوطہ ایک عظیم سیاح تھا جس نے جب سیاحت کی غرض سے گھر سے قدم نکالا تو پھر آگے ہی بڑھتا گیا۔ پچیس برس تک اس نے واپس پلٹ کر نہ دیکھا اور پھر جب واپس ہوا تو تو کچھ عرصے کے بعد دوبارہ قدم بڑھایا اور اندلس کی جانب نکل گیا، وہاں سے پھر اس نے تونس، لیبیا، سوڈان، مصر، شام وغیرہ کا سفر کیا۔ یعنی اس نے افریقہ، ایشیا، یورپ، مشرق وسطیٰ، عرب سرزمین وغیرہ کے سفر کو تین برسوں میں مکمل کیا۔ اور اسی سلسلے میں وہ ہندوستان بھی رہا بلکہ ادھر اس کا قیام خاصا طویل یعنی تقریباً نو برس کا تھا اور اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کا قریبی تعلق ''محمد بن تغلق'' سے رہا۔ جس نے اس سے متاثر ہو کر اسے دہلی کا قاضی مقرر کیا۔ بعد ازاں اسے چین میں بطور سفیر بنا کر بھیجا تھا۔

ابن بطوطہ نے ان تمام برسوں میں حالت سفر میں جو کچھ دیکھا وہ جس طرح سے بیان کیا ہے اس سے نہ صرف محمد بن تغلق کی شخصیت کے بعض تشنہ تاریخی پہلوؤں کی تکمیل ہوتی ہے بلکہ خود ابن بطوطہ کی ذات وشخصیت اور اس کے کردار کے بھی سمجھنے میں یہ سفرنامے بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اس کے سفرنامے کو اعلیٰ ادبی مقام حاصل ہونے کے ساتھ اعلیٰ سماجی اور تاریخی مقام کا حامل بھی سمجھا جاتا ہے۔ دوسری طرف اس کو آپ بیتی یا جگ بیتی کا درجہ بھی دیا جا سکتا ہے۔

ابن بطوطہ کا اسلوب بہت شاندار اور دلچسپ ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے سفر نامے کا شمار عظیم ازلی شاہکاروں اور ماہ پاروں میں ہوتا ہے۔ اور اسی طرز تحریر کو پھر بہت سے لوگوں نے اپنا کر اس روایت کو زندہ رکھا۔ اور اپنے سفر ناموں کو دلچسپ بنایا۔ گویا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خوبصورت طرز تحریر اور دلچسپ پیرائے میں سفر نگاری کی ابتداء کا موجد ابن بطوطہ ہی ہے۔ جس نے آج سے تقریباً چھ صدیاں قبل یہ اعزاز حاصل کیا تھا۔

سفر ناموں کے ضمن میں ہی اٹلی کا ایک مشہور سیاح مارکوپولو بھی دائمی شہرت رکھتا ہے۔ وہ وہیں سے نکلا اور چین' ایران' تبت' ہندوستان' ترکی' مڈگاسکر' جاوا وغیرہ کا سفر کیا اور اسی دوران اس کی ملاقات چنگیزی خاندان کے سربراہ ''قبلائی خان'' سے بھی ہوئی۔ جس نے اسے چین کے ایک صوبے کا سربراہ مقرر کیا۔

ابن بطوطہ اور مارکوپولو[8] میں یہ قدر مشترک ہے کہ دونوں عظیم درباروں سے منسلک رہے۔ مارکوپولو جب قبلائی خان کے دربار سے وابستہ ہوا تو اس نے اس کے محل' شان و شوکت' اور ان کے عجیب وغریب تاتاری قبائل کے رسم و رواج کو غور سے دیکھا اور انہیں ضبط تحریر میں بھی لایا۔ اس طرح سے مارکوپولو کا سفر نامہ بھی ایک عظیم شاہکار ہے اور تاریخی ماخذ کا درجہ بھی رکھتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں بھی عظیم الشان سفر کرنے والے ہو گزرے ہیں۔ لیکن ان سفر ناموں کی تاریخ محفوظ نہ رہ سکی۔ یا پھر سفر کرنے والوں نے اسے محفوظ رکھنا ضروری نہ سمجھا ہوگا۔ البتہ سید جلال الدین بخاریؒ المعروف جہانیاں جہاں گشت کا اردو ترجمہ جس میں تاریخیں تو رقم نہیں ہیں البتہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی کتاب ''انوار صوفیہ''[9] سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ محمد بن تغلق کا دور تھا۔

لیکن اس سفر نامے میں ایسے ایسے عجائبات عالم کو جو کہ عقل دنگ کرنے والے ہیں بیان کیا گیا ہے جو کہ عقلی دلائل سے میچ نہیں کرتے خاص طور پر بعض پراسرار واقعات' عجیب الخلقت جانوروں کے متعلق حکایات وغیرہ ایسی ہیں جو کہ مصدقہ معلوم نہیں ہوتی ہیں۔ اس کی یہ بھی وجہ ہو سکتی ہے کہ اس سفر نامے کا ترجمہ کرنے والے کو کیا معلوم نسخہ کس حالت میں اور کن کن ہاتھوں سے گزر کر ملا ہو۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اس سفر نامے کو مستند ماخذات میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان میں مغلوں کے عہد حکومت میں جہاں فن سفر نگاری کو تقویت ملی۔ وہاں خود مغل حکمرانوں نے بھی اس سلسلے میں کافی کچھ چھوڑا ہے۔ ان کی خود نوشتیں' آپ بیتیاں وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔ تزک بابری ہو یا ہمایوں نامہ' تزک جہانگیری ہو یا اکبر نامہ' ہر ایک میں اس دور کے حالات و واقعات' تاریخ' ذاتی دلچسپیاں' عادات و اطوار' رنگ و راگ' محفلوں شراب نوشی' کنیزوں' درباروں وغیرہ کے متعلق نادر معلومات ملتی ہیں جن سے اس دور کو سمجھنے میں اور مدد ملتی ہے۔

اسی عہد میں امیر البحر سید علی نامی سیاح کا سفر نامہ بھی مرتب ہوا جس نے ہمایوں' اکبر' ان کے بیٹوں وغیرہ سے ملاقات کی۔ اور پھر راستے بھر کے تمام واقعات کو ترکی سے افغانستان' ہندوستان' ایران وغیرہ کو بیان کیا

ہے۔ سید علی چونکہ بحری سفر پر تھے۔ لہٰذا انہوں نے سفر نگاری میں بحری جنگوں، قزاقوں وغیرہ کے قصے بھی بیان کئے ہیں۔ جس سے یہ اور بھی زیادہ دلچسپی کا حامل سفر نامہ بن گیا ہے۔

تزک بابری کی طرح تزک جہانگیری بھی اپنے طور پر الگ حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں جہانگیر نے اپنے بچپن، جوانی، اور اقتدار میں کرنے والے سفروں، کا حال انتہائی لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ بالخصوص قدرتی مناظر کا حسن، عام لوگوں کے متعلق معلومات، تہذیبوں اور ثقافتوں کے ادغام کے بارے میں گراں قدر معلومات کے باعث تزک جہانگیری کو عظیم شہرت حاصل ہوئی۔ ہر چند کہ تزک بابری ترکی زبان، اور تزک جہانگیری فارسی زبان میں لکھی گئیں لیکن ہندوستان میں ان کی مقبولیت میں کمی نہیں ہوئی اور ادھر کی مقامی زبانوں میں اس کے تراجم ہوتے رہے۔

تقریباً اسی عہد میں ڈاکٹر فرانسیسی برنیئر ہندوستان آیا اس نے بھی سفر کشمیر کیا۔ اور اس سفر کو اس نے اس عہد کے حوالے سے جس طرح بیان کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نظر کتنی گہری تھی۔ اس نے بادشاہوں کے حالات، عادات، عمارات، رسم و رواج وغیرہ کے متعلق غیر جانبدارانہ رائے دی ہے۔ جس سے اہل اقتدار کی بعض ایسی خصوصیات کے متعلق بھی جاننے کو ملتا ہے جو کہ عام کتب میں دستیاب نہ تھا۔ خاص طور پر درباری شان و شوکت کے حوالے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

اس طرح مغل عہد سے سفر ناموں کی تاریخ نکل کر اگلے دور میں داخل ہوتی ہے۔ اور اس مغل دور کے آخری دور میں مشہور اٹالین سیاح نکولائی ماکوچی اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں ہندوستان آیا اور اس نے اورنگ زیب کے دربار کی اور اس کی محلاتی زندگی کی جو تصویر کشی کی ہے وہ اس کے عہد کی منہ بولتی داستان ہے۔ کیونکہ اورنگ زیب کا عمومی تصور مختلف تھا لیکن اس سے معلوم ہوتا ہے کہ در حقیقت شہنشاہوں کی طرز زندگی عوام سے مختلف ہی ہوتی ہے۔

برطانوی عہد سے پہلے جب مختلف اقوام کی ادھر آمد ہونے لگی اور ہندوستان جادوئی اور تصوراتی دنیا کے طور پر متعارف ہونے لگا تو لوگ اس جانب زیادہ شد و مد کے ساتھ متوجہ ہوئے۔ حتیٰ کہ مقامی باشندوں اور مبلغین نے بھی جب دیار غیر کا سفر کیا تو انہوں نے بھی سفر کی روایت کو بیان کرنا شروع کیا۔ جس میں خاص طور پر حضرت شاہ ولی اللہؒ کا نام لیا جا سکتا ہے جنہوں نے حج کے سفر نامے کو موضوع سخن بنایا۔ لیکن اس دور تک اگرچہ اردو زبان مقبولیت حاصل کر چکی تھی مگر ابھی کتب فارسی زبان اس پر غالب تھی۔ مگر فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد فارسی و عربی رفتہ رفتہ وہ اہمیت برقرار نہ رکھ سکیں جو کہ انکا خاصا تھا مگر کبھی کبھی کوئی اردو کا ماہر قادر الکلام و ماہر زبان بھی اردو کو چھوڑ کر اپنا مافی الضمیر فارسی میں بیان کرنے کو ترجیح دیتا تھا جیسا کہ مصطفیٰ خاں شیفتہ کی مثال ہے کہ انہوں نے اپنا سفر نامہ ''جذب القلوب الی دیار المحبوب'' فارسی زبان میں پیش کیا۔

اردو کے سفر ناموں میں یوسف خاں کمبل پوش کا سفر نامہ ''عجائبات فرنگ'' کو قدیم ترین کا اعزاز

حاصل ہے۔ آپ فطری طور پر سفر کی پر خطر راہوں اور نت نئے تجربوں کو پسند کرتے تھے۔ اور سفر کے لئے جو بھی مراحل تھے ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے تھے۔ آپ نے اس ضمن میں انگریزی زبان بھی سیکھی تھی۔ تاریخی کتب سے معلومات بھی حاصل کی تھیں اور دوران سفر آپ پر مذہب' روایات' تہذیب وغیرہ کا اتنا رنگ نظر نہیں آتا بلکہ آپ نے کھلے دل اور کھلے ذہن کے ساتھ سفر کیا۔

سرسید احمد خاں نے جب اپنے بیٹے محمود کو لندن میں داخل کروانے کے لئے ادھر کا سفر کیا تو آپ وہاں سے خطوط کے ذریعے اپنی یادداشتیں اور تجزیئے ادھر بھجواتے رہے جو کہ ساتھ ساتھ چھپتے رہے تھے۔ [10] آپ نے یہ سفر علمی اور تحقیقی حوالے سے بالخصوص ان کے نظام تعلیم کے مطالعے کے لئے کیا تھا لہٰذا آپ نے خوب موازنہ کیا ہے اور جگہ جگہ آپ قوم کی زبوں حالی سے پریشان نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ حالی نے کہا تھا کہ

''جس دھن میں سرسید احمد خاں نے سفر نامہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والا ملی اور قومی خیر خواہی اور ہمدردی میں شرابور ہے۔''

یعنی یوسف کمبل پوش کا سفر نامہ غیر مقصدی اور خالصتاً تفریحی تھا جبکہ سرسید احمد خاں کا سفر نامہ پند و نصائح' تجزیات اور اصلاحات سے بھرپور ہے۔ پھر محمد حسین آزاد نے ''سیر ایران'' اور شبلی نعمانی کا مختلف ممالک کا سفر نامہ اردو سفر نامے کی فنی اصلاح کو آگے بڑھاتا ہے۔ یعنی بیسویں صدی میں سفر کی سہولتوں' اخبارات' بحری سفر کے عام ہونے اور ملت اسلامیہ کو یکجا کرنے کی خواہش نے لوگوں کو سفر پر آمادہ کیا اور وہ لوگ جو سفر کرتے تھے وہ اپنے سفر کی داستان سنانا چاہتے تھے۔ اب مردوں کے علاوہ پڑھی لکھی اور باشعور خواتین نے بھی سفر لکھنا شروع کر دیا جو کہ بجائے خود خوش آئند روایت تھی۔ بیگم حسرت موہانی' عطیہ فیضی' شاہ بانو بیگم وغیرہ اس بارے میں خاصی ترقی پسند نظر آتی تھیں۔

اس طرح سفر نامہ کا سفر آگے بڑھتا رہا اور قیام پاکستان کے بعد اس میں مزید نکھار آنا شروع ہو گیا۔ اب اس میں مزید چاشنی پیدا ہو گئی تھی اور اس کے پڑھنے والوں کی تعداد میں بھی گراں قدر اضافہ ہونے لگا۔

سفر نامہ لکھنے کی روایت جاری ہے۔ نت نئے تجربے ہو رہے ہیں۔ ہر گزرنے والا دن ایک نئے سفر کی کہانی اپنے اندر سمو رہا ہے۔ یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ سفر رو بہ سفر ہے اور سفر نامہ لکھنے والے بھی اس میں پا بہ رکاب رہے ہیں اور رہیں گے اور اس کی نئی تاریخ مرتب ہوتی رہے گی۔

•·····•·····•

حوالہ جات

-1 ازبکستان کے حکمران مراد ہیں جو کہ سلافی تھے۔ ان کے حکمران للطور انے درخواست کی تھی۔

-2 المقتدر باللہ کا عہد حکومت 320ھ تا 395ھ تک ہے۔

(مزید تفصیل کے لئے ابن خفلان کا سفر نامہ دیکھیں جس کا اردو ترجمہ نذیر حسین صاحب نے

"سیاحت نامہ روس" کے نام سے کیا ہے۔ جسے نقاش اکیڈمی لاہور سے شائع کیا ہے)

3- خورشید احمد فاروقی "اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں" دہلی 1962ء

4- کتاب الہند، ص 302، دارالمصنفین اعظم گڑھ 1921ء

5- ہندو علماء نے البیرونی کو "ودیا ساگر" کا خطاب دیا ہے۔

6- ابن جبیر اندلسی، رحلۃ ابن جبیر، مصر 1943ء

7- سفر نامہ ابن بطوطہ، نفیس اکیڈمی کراچی 1961ء
(مترجم، رئیس احمد جعفری)

8- "Marco Polo Life and Histroy" page 109,
by Mujahid Hussain, Karachi, 1969

9- انوار صوفیہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کی کتاب "اخبار الاخیار فی اسرار الابرار" کا اردو ترجمہ ہے۔

10- سر سید احمد خاں، مسافران لندن، ص 8، علی گڑھ 1908ء
(دیباچہ)

برائے مزید تفصیلات و معلومات دیکھیے

سید فیاض محمود، ہند و پاکستان کی کہانی، لاہور 1983ء

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، اردو سفر نامے کی تاریخ، اسلام آباد 1987ء

جیلانی کامران، حج کے سفر ناموں کی روایت، ماہ نو 1979ء

ڈاکٹر وحید قریشی، اردو نثر کے میلانات، لاہور 1975ء

ڈاکٹر انور سدید، تاریخ سفر نامہ، لاہور 1987ء

ماہنامہ سپوتنک، دسمبر 1999ء

محسن احسان

نظر زیبائشِ قامت میں زندانی سی رہتی ہے
لباسِ خوش لباساں میں بھی عریانی سی رہتی ہے

خراباتِ محبت سے کوئی تشنہ نہیں اٹھتا
نظر میں روشنی چہرے پہ تابانی سی رہتی ہے

ہم ایسے روز و شب میں سانس لیتے ہیں جہاں اکثر
کتابِ عمر کی اوراق گردانی سی رہتی ہے

محبت بھی عجب اک کاروبارِ عشق ہے جس میں
خسارہ ہو نہ ہو لیکن پریشانی سی رہتی ہے

غبارِ جانکنی سے جسم و جاں آلودہ رہتے ہیں
ہمارے آئینہ خانے پہ ویرانی سی رہتی ہے

گنہگاروں کے سامانِ عبادت میں نہیں کچھ بھی
بس اک عمرِ گذشتہ کی پشیمانی سی رہتی ہے

ہوا شوقِ سفر سے اس قدر مجبور ہے محسنؔ
خس و خاشاک دریا میں بھی طغیانی سی رہتی ہے

٭

محسن احسان

مدتوں کے بعد آئی اک ٹھکانے کی خبر
دشت دل میں گرم ہے خفیہ خزانے کی خبر

اب مرادیں بے دعا مانگے بھی بر آنے لگیں
اب جبینوں کو نہیں ہے آستانے کی خبر

اہلِ ساحل کو ملی تو ہے، مگر تاخیر سے
موجِ دریا میں کسی کے ڈوب جانے کی خبر

ہم کو تھیں معلوم رسمِ دوستی کی مشکلیں
ہم نے رکھی ہے فقط یاری نبھانے کی خبر

اب خزاں کی آبرو بادِ خزاں کے ہاتھ ہے
ہے گلستاں میں صبا کے گل کھلانے کی خبر

٭

محسن احسان

رہائی اب کفِ صیاد سے نہیں ممکن
کہ یہ کرم ستم ایجاد سے نہیں ممکن

جو اضطراب مری ایک مشت خاک میں ہے
وہ شور نالہ و فریاد سے نہیں ممکن

ترے وصال سے بھی تشنگی بجھے نہ بجھے
علاج ہجر، تری یاد سے نہیں ممکن

جو ایک حرفِ محبت سے ہو گیا ہے وہ کام
تمام عمر کی فریاد سے نہیں ممکن

ہمیں معانی مکتوب عشق سمجھا دے
یہ اس زمانے کے استاد سے نہیں ممکن

کمال حرف گری ہے رہین فیض خیال
یہ جمع بندی، اسناد سے نہیں ممکن

٭

محسن احسان

خوابوں کے جھروکوں میں ہے تعبیر طلسمات
پاؤں سے مگر لپٹی ہے زنجیر طلسمات

ناوک فگنی کا تھا اسے زعم مگر حیف
دل پر نہ لگا جا کے کوئی تیر طلسمات

آنکھیں ہیں چکاچوند، بدن کانپ رہا ہے
وہ سامنے ہے یا کوئی تصویرِ طلسمات

ہم کو نہ ملی شہریتِ شہر تمنا
کیا کیا نہ وگرنہ ہوئی تشہیرِ طلسمات

پھر کیوں نہ سخن سینہ احباب میں اترے
ہو حرف و معانی میں جو تاثیر طلسمات

جو لاش زیں پر ہے وہ اٹھتی ہے زمیں سے
آ دیکھ مرے ہاتھ میں شمشیر طلسمات

کہتا ہے جسے میر تقی میر زمانہ
وہ شخص ہے محسن کے لئے میر طلسمات

٭

محسن احسان

ہر اشک بوند بوند ہے ہر مُو گرہ گرہ
ہیں سب معاملاتِ مَن و تو گرہ گرہ

دستِ صبا ہی کھولے تو کھولے کہ اس برس
صرصر سے گلستاں میں ہے خوشبو گرہ گرہ

ہم جانتے ہیں کیسا سفر کر کے آئے ہیں
طے کی ہے سب مسافتِ گیسو گرہ گرہ

فرخندہ ساعتوں کا نہ کر تذکرہ کہ اب
سطرِ جبیں شکن شکن ابرو گرہ گرہ

اک رشتہ جمال میں ہم نے پرو دیئے
آنکھوں سے بہہ رہے تھے جو آنسو گرہ گرہ

اس عہد نے خودی کا عجب حال کر دیا
ہر سفلۂ باوقار ہے حق جُو گرہ گرہ

محسن کوئی نجات کا رستہ تلاش کر
حالات و واقعات ہیں ہر سُو گرہ گرہ

❋

محسن احسان

سر کشیدہ ہے شوخ و شنگ ہوا
جس سے کر رہی ہے جنگ ہوا

کتنی اٹھکیلیوں سے چلتی ہے
میرے ہمراہ فتنہ رنگ ہوا

ناچتی ہے فضا میں موسیقی
جب بجاتی ہے جلترنگ ہوا

آسماں کی بلیغ وسعت میں
گھولتی ہے دھنک کے رنگ ہوا

نغمہ نغمہ ہے اس کا پیکرِ ناز
چھیڑتی ہے رباب و چنگ ہوا

بود نابود کی عمل داری
ڈھا گئی گھر کے خشت و سنگ ہوا

اپنی دُھن میں رواں دواں محسن
مری مانند ہے ملنگ ہوا

❋

محسن احسان

دعا کو ہاتھ اٹھاتے ہیں رفتگاں کے لئے
زمیں کے پاس نہیں کچھ بھی آسماں کے لئے

مرے لئے ہے بہت میری چشم شوق کا نم
کہ ایک بوند بھی بارش ہے دشتِ جاں کے لئے

خیالِ سود و زیاں کس حساب میں کرتے
یقیں کو آگ لگا دی گئی گماں کے لئے

ہم اس کے واسطے چھاؤں تلاش کرتے ہیں
جو دھوپ ہم نے بچائی تھی سائباں کے لئے

ہمارے عہد کا یہ سانحہ بھی دیدنی ہے
بہار جشن منانے لگی خزاں کے لئے

کوئی نشانی کہیں سطح آب پر رہ جائے
ڈبو دیا ہے سفینے کو بادباں کے لئے

ہے یہ بھی دستِ تہی ظرف کا ہنر محسن
کہ ہم نے تیر نہ چھوڑا کوئی کماں کے لئے

٭

محسن احسان

جمالِ دلبرانہ کھینچتا ہے
دل و جاں والہانہ کھینچتا ہے

تصرف میں تھا جس کے قید خانہ
اب اس کو قید خانہ کھینچتا ہے

کبھی حرصِ زمانہ کھینچتی تھی
پر اب جبر زمانہ کھینچتا ہے

زمیں پر ساکنانِ آسماں کو
فریب آب و دانہ کھینچتا ہے

عنانِ عمر کو دست مشیت
ہمیشہ غائبانہ کھینچتا ہے

مبارک سیر ہفت اقلیم تم کو
ہمیں اپنا ٹھکانہ کھینچتا ہے

ہم ایسے دین داروں کو بھی محسن
مذاقِ مشرکانہ کھینچتا ہے

٭

جراثیم

گل نوخیز اختر

عبدل کو یقین ہو گیا تھا کہ بس اب وہ چند ہی دنوں کا مہمان ہے' وہ بیمار نہیں تھا' نہ ہی عمر رسیدہ تھا' ہٹا کٹا تیس سال کا بھرپور جوان تھا' گٹھا جسم تھا' گاؤں میں کبڈی کے ہر مقابلے میں ہاتھ بلند کر کے اٹھتا' پورے کھیت کو اکیلا سنبھالتا تھا...... اس کے باوجود ڈاکٹر صاحب کی باتیں سن کر اسے مکمل یقین ہو گیا کہ اس کا وقت قریب آ گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے اس کی پہلی ملاقات شہر میں ان کی کوٹھی میں ہوئی تھی۔ عبدل اپنے گاؤں کے دوست ریاض سے ملنے آیا تھا۔ ریاض ڈاکٹر صاحب کے پاس ڈرائیور تھا اور تین سال سے انہی کی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں مقیم تھا' جب بھی گاؤں آتا' عبدل کو تاکید کر کے جاتا کہ شہر آنا ہو تو میرے پاس ضرور چکر لگانا۔ لیکن ان تین سالوں میں عبدل کا شہر آنا ہوا بھی تو افراتفری اور پریشانی میں۔ اس کی ماں چھت سے گر کر دائیں ٹانگ تڑوا بیٹھی تھی۔ اسی کے علاج کے لئے اسے بار بار شہر آنا پڑ رہا تھا۔ ماں کا علاج اس لئے بھی ضروری تھا کہ گھر کے کام کاج اس کے بغیر ادھورے تھے۔ ایک بہن تھی جس کی دو سال پہلے شادی کر دی تھی' اس کا خاوند اسے اپنے ساتھ کراچی لے گیا تھا' خود وہ ابھی تک کنوارہ تھا۔ لے دے کے ایک ماں ہی رہ گئی تھی۔ گھر میں اگر دو تین بہن بھائی ہوں تو ماں کی اہمیت کا احساس بھی ہوتا ہے' پیار کی تقسیم کا اندازہ لگانا زیادہ آسان ہو جاتا ہے۔ عبدل کو ماں سے بہت پیار تھا لیکن یہ پیار تلخی کی صورت میں زیادہ نمایاں ہوتا تھا' شاید اسی لئے ٹانگ کے ٹوٹ جانے پر اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا اور اس نے فوری طور پر گاؤں والوں کی مدد سے ماں کو شہر کے ہسپتال پہنچا دیا۔ ہسپتال میں تین دن لگ گئے۔ ڈاکٹرز نے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو ساتھ ملا کر پلستر چڑھا دیا تھا اور زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کی ہدایت کی تھی۔ تین دن بعد جب وہ ماں کو لے کر گاؤں واپس پہنچا تو پورا گاؤں ماں کی عیادت کو اُمڈ پڑا۔ شہر کے لوگ قیادت اور گاؤں کے لوگ عیادت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ عبدل کی ماں کو بھی علاج سے شاید اتنا سکون نہ ملا ہو جتنا عیادت کرنے والوں کو دیکھ کر ملا۔ یہی وہ دن تھے جب ریاض بھی گاؤں آیا ہوا تھا' اسے حادثے کی خبر ملی تو وہ بھی دوڑا چلا آیا۔ عبدل اسے دیکھتے ہی بغل گیر ہو گیا۔

''کیا ہوا ماسی کو؟؟؟'' ریاض نے عبدل کا کندھا تھپتھپایا۔

''ہونا کیہ اے یار...... ہزار مرتبہ سمجھایا ہے کہ اماں تیری نظر کمزور ہے' چھت پہ نہ جایا کر' پردے بھی نہیں بنے ہوئے' پھسل جائے گی' لیکن نہیں مانتی' کہتی ہے بارشوں کا موسم آنے والا تھا' کوٹھے کی لیپائی کے لئے اوپر گئی تھی......بس ریاض بھائی...... پاؤں ذرا سا سر کا اور آ پڑی نیچے۔''

''کسی آرتھوپیڈک کو دکھایا......؟'' ریاض کو پتہ ہی نہ چلا کہ وہ بے خیالی میں اپنے میٹرک پاس ہونے کا فائدہ اٹھا گیا ہے۔ عبدل حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ ''یہ کیا ہوتا ہے؟''

ریاض کو یکدم احساس ہوا کہ اسے اپنی تعلیم کا یوں بے محابا استعمال نہیں کرنا چاہئے تھا لہٰذا جلدی سے بولا ''میرا مطلب ہے کسی ہڈی جوڑ ڈاکٹر کو نہیں دکھایا؟'' جواب عبدل کی ماں نے دیا۔

''نہیں پت!......بس ہسپتال والوں نے ہی پٹی کر دی سو کر دی' اس موئے کو خیال ہوتا تو ماں کو لے نہ جاتا اس ڈاکٹر کے پاس' جس کا تو کہہ رہا ہے۔''

عبدل کو غصہ آ گیا۔ ''چپ کر کے لیٹی رہ......نیند کی بڑے والی پوری پانچ گولیاں دی ہیں' پھر بھی ہماری طرح جاگ رہی ہے۔''

''ارے بڑی دیکھی ہیں نیند کی گولیاں' میں تو چاٹی کی چاٹی پی جاؤں پھر بھی نہ اونگھ لوں' یہ اتنی سی گولی مجھے کیا سلائے گی......گولی نہ ہوگئی لوری ہوگئی......'' اماں خود ہی ہنس پڑی۔

''یار عبدل! خیراتی ہسپتال والے علاج بھی خیرات سمجھ کر ہی کرتے ہیں' میری مان ایک دفعہ اپنے ڈاکٹر صاحب سے بھی مشورہ کر لے۔''

''کون سے ڈاکٹر صاحب؟''

''ارے وہی جہاں میں کام کرتا ہوں' بہت بڑے ہڈی جوڑ ہیں' میں تجھے اپنا بھائی بتاؤں گا' پیسے بھی نہیں لیں گے' بالکل مفت کام ہو جائے گا۔''

''اماں کو بھی ساتھ لے جانا ہوگا؟''

عبدل کے سوال پر ریاض سوچ میں پڑ گیا' یہ ایک ڈاکٹری مسئلہ تھا جس پر رائے دینے کی ابھی اس کی ہمت نہیں تھی' اس نے تھوڑی دیر تامل کے بعد کہا ''ایسا ہے کہ پہلے تم خود ڈاکٹر صاحب سے مل لو' میں نے ڈاکٹر صاحب کو دیکھا ہے' وہ کئی مریضوں کو ٹیلی فون پر بھی نسخہ بتا رہے ہوتے ہیں' اگر ماسی کو لے جانے کی ضرورت ہوئی تو لے جانا۔''

عبدل کشمکش میں پڑ گیا' شہر کے خیراتی ہسپتالوں کے دھکوں نے اسے پہلے ہی ڈرا دیا تھا' کہیں دوبارہ ویسی ہی صورت حال پیش نہ آ جائے' اور پھر ویسے بھی سنا تھا کہ بڑے ڈاکٹر اگر علیحدہ سے مریض کو دیکھیں تو بھاری فیس لیتے ہیں۔

''ریاض! یار دیکھ لینا......میرے پاس پیسے ویسے بالکل نہیں ہیں' اگر ڈاکٹر صاحب نے فیس مانگ لی

تو......؟؟؟"

ریاض کا قہقہہ نکل گیا...... "تم ابھی ڈاکٹر صاحب سے ملے نہیں ہو وہ بہت اچھے اور قابل ڈاکٹر ہیں' شہر میں ان سے بڑا ہڈی جوڑ کوئی نہیں' مرتے ہوؤں کو بھی موت کے منہ سے کھینچ لاتے ہیں' ان کے پاس انسان کو زندہ رکھنے کے بڑے اعلیٰ نسخے ہیں' پتا ہے ہر ہفتے نوکروں کو گولیاں کھلاتے ہیں تاکہ بیماری نہ پھیلے' گھر میں بالکل صفائی رکھتے ہیں' موت کو دور سے ہی محسوس کر لیتے ہیں' تم ایک بار ان سے ملو تو سہی۔

عبدل نے تہیہ کر لیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے ضرور ملے گا' اس نے ایک نظر ماں کی طرف دیکھا جو ذرا سی دیر میں گہری نیند سونے لگی تھی۔

o......o......o

ریاض کے شہر جانے کے ٹھیک چوتھے روز وہ بھی اس کے پاس ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی پہنچ گیا' کوٹھی کیا تھی' ایک محل تھا' باہر ایک پٹھان چوکیدار موجود تھا۔ عبدل نے ریاض کا پوچھا تو پتا چلا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو گاڑی میں لے کر شیخوپورہ گیا ہوا ہے۔ اس نے چوکیدار سے بہت کہا کہ وہ ریاض کا دوست ہے اور اسے اندر جانے کی اجازت دی جائے لیکن پٹھان چوکیدار نے کسی قسم کی بات سننے سے انکار کر دیا اور صاف صاف بتا دیا کہ جب تک ریاض نہیں آ جاتا' وہ کوٹھی کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔

مجبوراً شام تک وہ سامنے والے پارک میں چادر تان کر سوتا رہا۔ شام ہوئی تو دوبارہ کوٹھی پر آیا۔ پتا چلا کہ ریاض آ چکا ہے' عبدل کے آنے کی اطلاع ملتے ہی ریاض نے بڑی گرم جوشی سے اسے اندر بلایا اور اپنے کوارٹر میں بٹھا کر کھانا کھلایا۔

"عبدل! ڈاکٹر صاحب ابھی تھکے ہوئے ہیں' پہلے کافی پئیں گے' پھر مریض دیکھیں گے' اس لئے تم ابھی انتظار کرو اور ہاں...... کپڑے ضرور بدل لو۔"

"کیوں......؟؟؟" عبدل نے حیرانی سے پوچھا۔

"اوہو...... یار ڈاکٹر صاحب میلے کپڑوں والے مریضوں سے دور بھاگتے ہیں' تمہیں پتا ہے کہ میلے کپڑوں میں جراثیم ہوتے ہیں جو انسانی صحت کے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔"

"لیکن میں تو انہی کپڑوں میں آیا ہوں' دوسرے کپڑے کہاں سے لاؤں؟"

"کوئی بات نہیں' میرے کپڑے پہن لو...... لیکن نہا کر پہننا۔"

"کیوں......؟؟؟" عبدل پر دوسرا دورہ پڑا۔

"اس لئے کہ صابن سے نہائے بغیر تمہارے جسم سے جراثیم دور نہیں ہوں گے۔"

عبدل ڈر گیا اور جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

نہانے اور کپڑے بدلنے کے بعد ریاض اسے لئے کوٹھی کی دوسری طرف ڈاکٹر صاحب کے کلینک

میں لے آیا۔ وہاں اور بھی مریض موجود تھے' کسی کے بازو پر پٹی بندھی تھی اور کسی کی ٹانگوں پر پلستر چڑھا تھا۔ عبدل بھی ایک طرف بیٹھ گیا۔ یہاں آ کر اسے محسوس ہوا کہ اسے ماں کو بھی ساتھ لانا چاہئے تھا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بعد اس کی باری آئی تو سب مریض جا چکے تھے۔ ریاض غالباً پہلے ہی ڈاکٹر صاحب سے اس کا تعارف کرا چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو دیکھتے ہی عبدل یک دم گڑبڑا گیا۔ ڈاکٹر صاحب کوٹ پینٹ میں ملبوس تھے' کنپٹیوں پر سفید بال' نہایت بارعب شخصیت اور چہرے پر انتہائی سنجیدگی۔

''عبدل تمہارا نام ہے......؟''

''ج...... جی...... جی ہاں......'' اس نے بمشکل تھوک نگلا۔

''کہاں ہے تمہاری ماں؟''

''وہ جی...... وہ...... وہ تو ادھر گاؤں میں ہے۔''

''کیا مطلب...... وہ گاؤں میں ہے تو میں دیکھوں گا کیسے؟''

عبدل گھبرا گیا...... ''وہ جی...... ریاض نے کہا تھا کہ آپ مریض دیکھے بغیر نسخہ لکھ دیتے ہیں۔''

''وہاٹ نان سنس......'' ڈاکٹر صاحب دھاڑے...... ''یہ کیسے ممکن ہے!''

''ٹھیک ہے جی...... میں کل اماں کو لے آؤں گا۔'' عبدل نے جلدی سے بات سنبھالی۔

''ڈاکٹر صاحب نے خفگی سے اس کی طرف دیکھا' پھر سپاٹ لہجے میں بولے ''ہسپتال والوں نے کون سی دوائیاں لکھ کر دی تھیں؟''

عبدل آہستہ سے بولا ''پرچی تو گم ہو گئی۔''

''تو پھر اب مریضہ کیا کھا رہی ہے؟'' ڈاکٹر صاحب نے دانت پیسے۔

''اماں کہتی ہے صرف دیسی گھی پیوں گی' وہی پی رہی ہے۔''

''اوہ گاڈ...... دیسی گھی' وہ بھی خالص...... سراسر کولیسٹرول......'' ڈاکٹر صاحب اچھل پڑے!

عبدل کی جان نکل گئی' اسے یوں لگا جیسے اس کی ماں زہر کھا رہی ہے' وہ فوراً بولا...... ''ڈاکٹر صاحب ملاوٹ والا گھی نہیں ہے' بالکل اصلی ہے' رحیم بخش گھر میں خود بناتا ہے' میری آنکھوں کے سامنے...... میں خود بھی پیتا ہوں۔''

''تم بھی...... تم بھی خالص گھی پیتے ہو...... اوہ گاڈ......'' ڈاکٹر صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا...... ''تمہیں پتہ ہے کہ گھی والا ایک پراٹھا بھی دل کے لئے کتنا خطرناک ہوتا ہے' اسی لئے ہر دوسرا بندہ ہارٹ اٹیک کا شکار ہو رہا ہے۔''

''لیکن ڈاکٹر صاحب گاؤں میں تو سب گھی پیتے ہیں' آج تک کسی کو کچھ نہیں ہوا...... بلکہ میرا دادا کہتا تھا کہ گھی پینے سے تو طاقت آتی ہے۔''

''او احمق!...... تم زہر پی رہے ہو...... خالص زہر...... یہ گھی تمہاری زندگی کے دن کم کر رہا ہے' تم موت کی طرف سفر کر رہے ہو۔''

''موت......!!!'' عبدل کانپ گیا۔

''ہاں موت...... فوری طور پر گھی چھوڑ دو' اس کے قریب بھی مت پھٹکنا...... اور ماں کو بھی منع کر دو...... ویسے تم کام کیا کرتے ہو؟''

''کھیتی باڑی......'' عبدل بولا۔

''وہی جراثیم...... دن میں کتنی بار ہاتھ دھوتے ہو؟'' ڈاکٹر صاحب نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''کئی دفعہ...... کھیتوں کے ساتھ ہی نہر ہے......''

''نہر سے ہاتھ دھوتے ہو...... جراثیم بھرے پانی سے...... صابن استعمال نہیں کرتے؟؟؟''

''نہیں جی!!!''

''اوہ گاڈ...... جراثیم!''

''پیسٹ کرتے ہو؟''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''دانتوں کی صفائی۔''

''ہاں جی! جمعے کے جمعے مسواک کرتا ہوں۔''

''ایک ہفتے بعد' اور وہ بھی فلورائیڈ والے ٹوتھ پیسٹ کے بغیر...... اوہ گاڈ...... جراثیم...... اور نہاتے کب ہو؟''

''نہاتا میں روز ہوں۔'' عبدل فخر سے بولا۔

''شکر ہے......'' ڈاکٹر صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔

''اصل میں صبح صبح گاؤں کے ٹیوب ویل پر گاؤں کے سارے جوان نہانے آتے ہیں۔''

''کیا......؟'' ڈاکٹر صاحب ہڑبڑا گئے...... ''ایک ٹیوب ویل میں سارے بندے نہاتے ہو۔''

''ہاں جی! بہت بڑا ٹیوب ویل ہے اس کا۔''

''جراثیم بھی اتنے ہی بڑے ہوں گے''...... ڈاکٹر صاحب نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔ اس روز ڈاکٹر صاحب کرید کرید کر اس سے سوالات کرتے رہے' دو گھنٹے کے طویل انٹرویو کے بعد انہوں نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے اس کی قبل از وقت موت کی پیش گوئی کر دی۔

''تم پوری طرح سے جراثیم کے حصار میں ہو' میں حیران ہوں کہ تم ابھی تک زندہ کیسے ہو...... جاؤ اپنے ایکسرے کراؤ' ٹیسٹ کراؤ...... تم اپنی حماقت کی وجہ سے موت کے منہ میں جا رہے ہو۔''

عبدل کے ہاتھ پیر کانپنے لگے' ڈاکٹر صاحب کی باتوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا' وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اتنی خطرناک زندگی گزار رہا ہے' ماں کی بجائے اسے اپنی فکر پڑ گئی۔ اگر وہ ہی نہ رہا تو ماں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔ اس نے کن اکھیوں سے اپنے جسم پر نظر ڈالی' اس کا دل بھر آیا' وہ ابھی مرنا نہیں چاہتا تھا' ابھی تو اس نے ساتھ والے گاؤں سے کبڈی کے مقابلے جیتنے تھے' بیلوں کی نئی جوڑی لینی تھی' شادی کرنی تھی......"

"تم بچ سکتے ہو......" ڈاکٹر صاحب کی آواز اس کے کانوں میں پڑی "اگر اب بھی ان جراثیموں سے فوری طور پر دور ہو جاؤ۔"

"لیکن اب تک تو یہ جراثیم میرے پورے جسم میں پھیل چکے ہوں گے۔" عبدل نے مایوسی سے کہا۔

"ہاں! لیکن یہ کنٹرول ہو سکتے ہیں...... یاد رکھو! موت ہمارے اپنے اختیار میں ہوتی ہے' مجھے دیکھو' میری عمر 60 سال سے زائد ہے' لیکن مجال ہے بیماری کا کوئی معمولی سا جرثومہ بھی میرے قریب پھٹکا ہو۔ میں آرتھوپیڈک سرجن ہوں' مجھے پتا ہے کہ ٹوٹنے والی ہڈیوں کے خلاء جراثیم کے متلاشی ہوتے ہیں' لیکن میں انہیں روکنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہوں اسی لئے میرے مریض جلدی صحت یاب ہو جاتے ہیں' لیکن جو احتیاط نہیں کرتے ان میں سے اکثر کا مقدر موت بنتی ہے۔

"م...... مجھے کیا کرنا چاہئے؟" عبدل نے جلدی سے کہا۔

"احتیاط...... صرف احتیاط کرو...... گندگی کے جراثیم سے بچو...... یہی موت لاتے ہیں۔"

●......●......●

عبدل دو دن ڈاکٹر صاحب کی کوٹھی میں رہا اور اس دوران اس نے بے شمار حیرت انگیز چیزیں دیکھیں' کوٹھی کا ہر فرد جراثیم سے بچاؤ میں پیش پیش نظر آیا' ڈاکٹر صاحب ان میں سرفہرست تھے۔ وہ ڈرائیور کے بغیر گاڑی بھی چلاتے تو دستانے پہن کر' غسل خانوں میں روزانہ دوائی چھڑکی جاتی' پانی بھی ابلا ہوا استعمال کیا جاتا' گلاس بھی ہر ایک کے علیحدہ تھے' تولیے بھی علیحدہ' کمرے بھی علیحدہ...... اور شاید بستر بھی......

شہر سے واپسی پر عبدل بالکل بدل چکا تھا' اس کی یہ تبدیلی سب نے محسوس کی' پہلا کام تو اس نے یہ کیا کہ گھر میں مکھی کے داخلے پر سختی سے پابندی لگا دی۔ فوری طور پر شہر سے لایا ہوا ٹوتھ پیسٹ اور برش استعمال کرنا شروع کر دیا' ڈاکٹر صاحب کی ہدایات کی مطابق ٹیوب ویل میں نہانے کی بجائے گھر ہی میں یہ فریضہ سرانجام دینے لگا۔ صابن کا استعمال اس نے باقاعدہ شروع کر دیا تھا' اب کی بار وہ کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے محسوس کر رہا تھا جیسے کھیت کی مٹی سے زہریلے جراثیم لپک لپک کر اس کے اندر داخل ہو رہے ہیں' اسی خطرے کے پیش نظر اس نے بیلوں کو بھی نہیں تھپتھپایا کہ کہیں ان کے جسم پر لگے جراثیم بھی اس میں منتقل نہ ہو جائیں۔ یہ بات بیلوں نے بھی نوٹ کی' اسی لئے سست روی سے چلتے رہے۔ ماں حیران تھی کہ آخر اسے کیا ہو گیا ہے' وہ یکدم گاؤں والوں سے کٹ سا گیا تھا۔ بار بار ہاتھ دھوتا' پینے والے پانی کو روزانہ ابالتا' سونے سے پہلے بستر اچھی طرح

جھاڑتا...... حالانکہ پہلے اس نے کبھی اس قسم کا تکلف نہیں کیا تھا۔ جراثیم اور موت کے خوف نے اسے کبڈی سے بھی متنفر کر دیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے بتایا تھا کہ میلے کچیلے جسموں کے ملنے سے بھی جراثیم ایک دوسرے میں سرائیت کر جاتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کبڈی کھیلتے ہوئے کوئی اس کے ساتھ لگے۔ اس کی یہ تبدیلی اتنی اچانک اور غیر متوقع تھی کہ اسے خود بھی سمجھ نہیں آئی۔ ماں خالص گھی کے لئے ترس گئی لیکن اس نے دوٹوک کہہ دیا کہ "گھی موت ہے' اور میں موت کو گھر نہیں لا سکتا۔"

ڈاکٹر صاحب سے ایک ہی ملاقات نے اسے محتاط بنا دیا تھا' اسے شدت سے احساس ہونے لگا کہ وہ کتنی خطرناک زندگی گزارتا رہا ہے' طبیعت کے بدلتے ہوئے رجحان نے اسے کچھ چڑچڑا سا کر دیا تھا' ایک ماہ کے اندر اندر وہ اپنے بارے میں اتنا محتاط ہو گیا کہ دوسرے لوگ تنگ آ گئے' ماں بھی سارا سارا دن اسے کوستی رہتی۔

"وے ڈاکٹری گولیاں گرم ہوتی ہیں' مجھے دودھ جلیبیاں لا دے۔"

"جلیبیاں لا دوں...... وہ جلیبیاں جن پر سارا سارا دن مکھیاں بیٹھی رہتی ہیں' جراثیم تیرے اندر چلے گئے تو دو دن بھی زندہ نہیں رہے گی۔" اس نے ماں کو ڈرایا۔

"وے نہیں مرتی میں...... کبھی کوئی جلیبیاں کھانے سے بھی مرتا ہے؟"

عبدل کان لپیٹ کر باہر نکل جاتا' وہ موت سے واقعی ڈر گیا تھا۔ ایک ماہ بعد اس نے اپنا جائزہ لیا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ "بچ" گیا ہے۔ اس نے اپنے معمولات نوٹ کئے تو خوشی سے سرشار ہو گیا' اب وہ جراثیم سے محفوظ زندگی گزار رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو دعائیں دینے لگا' اگر انہوں نے بروقت اسے خطرے سے آگاہ نہ کیا ہوتا تو آج وہ منوں مٹی تلے ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب واقعی موت کی چالاکیوں سے واقف تھے' کبھی کبھی عبدل کا بڑا جی چاہتا کہ وہ پہلے کی طرح گھی پیئے' ٹیوب ویل میں نہائے' بیلوں کو تھپتھپائے...... لیکن سامنے موت نظر آتے ہی اس کے ارادے ڈھیلے پڑ جاتے۔ اس دوران وہ تین چار مرتبہ شہر جا کر ڈاکٹر صاحب سے ملا' ڈاکٹر صاحب نے اسے زندگی کی بشارت دی اور مزید احتیاط برتنے کے لئے کہا۔ ماں تو خود بخود ٹھیک ہوتی چلی گئی' البتہ عبدل مزید بدلتا گیا۔

o......o......o

یہ اس روز کی بات ہے جب اسے جراثیم کے خلاف محاذ کھولے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ وہ حسب معمول ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کے لئے شہر پہنچا۔ لاری اڈے پر اترتے ہی اس کا سامنا ریاض سے ہو گیا۔

"عبدل...... یار بڑے دنوں بعد شہر آیا ہے۔"

"ہاں ریاض بھائی...... اماں کی ٹانگ کا پلستر کھلا ہے ناں' بس اسی لئے گھر میں رہنا پڑتا تھا' آج ذرا مہلت ملی تو سوچا ڈاکٹر صاحب سے ہی مل آؤں۔"

"ڈاکٹر صاحب......" ریاض کی آنکھوں میں نمی اتر آئی...... "عبدل!...... یار ڈاکٹر صاحب تو اللہ کو

پیارے ہو گئے......"

"کیا......؟" عبدل کا دماغ بھک سے اڑ گیا...... اس نے اپنا سر گھومتے ہوئے محسوس کیا...... "ڈاکٹر صاحب......فوت ہو گئے......ڈاکٹر صاحب......مگر کیسے...... آخر کیسے......ناممکن......" اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب بھی مر سکتے ہیں۔ ریاض نے اسے سہارا دیا۔

"ہاں یار!......بس اللہ کی مرضی۔"

"لل......لیکن کیسے......وہ تو جراثیم سے بہت محفوظ تھے......" عبدل کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔

"ٹھیک کہتے ہو......" ریاض نے گہرا سانس لیتے ہوئے آنکھوں کی نمی صاف کی...... "جراثیم نے تو انہیں کچھ نہیں کہا' البتہ سامنے سے آنے والی ایک بس نے ان سے زندگی چھین لی......"

عبدل کا سارا جسم ٹھنڈا پڑ گیا...... اسے یوں لگا جیسے وہ ابھی گر جائے گا......اس کے اردگرد جراثیم ہی جراثیم موجود تھے......ٹرکوں کی شکل میں......بسوں کی شکل میں......ویگنوں کی شکل میں۔

○......○......○

پرانا کھیل

گلشن کھنہ

سنٹرل لائبریری کی نئی عمارت جو انگریزی حرف 'یو' کی شکل میں تعمیر کی جا رہی تھی نصف سے زیادہ بن کر تیار ہو چکی تھی مگر بلڈنگ کا مغربی حصہ ابھی تک نامکمل تھا۔ اس بلڈنگ کو بنانے کا ٹھیکہ لندن کے مشہور بلڈنگ کنٹریکٹرز ایمبک کنسٹرکشن کارپوریشن کو دیا گیا تھا اور یہ کمپنی لائبریری کی اس جدید عمارت کو جلد از جلد مکمل کرنا چاہتی تھی مگر مزدوروں کی قلت کے باعث تعمیر کا کام رکا پڑا تھا۔ جب کوشش کے باوجود مناسب مزدور دستیاب نہ ہو سکے تو مجبوراً کمپنی کو ان کی ہفتہ واری اجرت میں اضافہ کرنا پڑا۔ پھر جب بہتر ہفتہ واری تنخواہ کے ساتھ مزدوروں کی آسامیوں کے اشتہار اخباروں میں شائع ہوئے تو بھی صرف چار امیدوار ملازمت حاصل کرنے کمپنی کے دفتر پہنچے۔ ان میں دو سفید فام تھے جن میں ایک جنوبی آئرلینڈ کا رہنے والا تھا اور دوسرا مشرقی یورپ کے ایک ملک رومانیہ سے آنے والا رفیوجی تھا۔ دوسرے دو امیدوار افریقی نسل کے سیاہ فام تھے۔ چونکہ کمپنی کو مزدوروں کی سخت ضرورت تھی اس لئے ان چاروں کو ہی ملازم رکھ لیا گیا۔

جنوبی آئرلینڈ سے آنے والے مزدور کا قد درمیانہ اور عمر پچیس چھبیس برس کے قریب تھی۔ اس عمر میں بھی اس کے سر کے کافی بال جھڑ چکے تھے۔ اس کا نام پیڈی تھا۔ رومانیہ کے سفید فام مزدور کی عمر کوئی تیس برس کے قریب ہوگی۔ اس کا قد ناٹا' بیضوی چہرہ اور چہرے پر گہرے داغ تھے۔ اس کا نام جوزف تھا۔ سیاہ فام مزدوروں میں ایک ستائیس اٹھائیس برس کے پیٹے میں تھا۔ اس کا قد چھ فٹ سے زیادہ اور جسم فربہ مگر پھرتیلا تھا۔ اس کا نام سینڈو تھا۔ دوسرے کی عمر کوئی پچیس برس کے قریب تھی۔ اس کا قد درمیانہ' جسم توانا' لب موٹے موٹے اور نام برونو تھا۔

دوسرے دن صبح ہی جب وہ چاروں مزدور کام پر حاضر ہوئے اور سائٹ منیجر نے ان سب کا دوسرے گورے مزدوروں اور معماروں سے تعارف کرایا تو وہ لوگ دونوں سفید فاموں کو دیکھ کر تو بہت خوش ہوئے مگر پہلی بار اس کنسٹرکشن سائٹ پر دو سیاہ فام مزدوروں کو اپنے قریب دیکھ کر حیرانی سے ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ سائٹ منیجر نے اشارے سے انہیں کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

پھر ان سب نے ایک رسمی اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دونوں سیاہ فام مزدوروں کو بھی خوش آمدید کہا۔ پھر سائٹ منیجر کے حکم پر ہیڈ معمار ان چاروں مزدوروں کو بلڈنگ کے ایک کمرے میں لے گیا جہاں بلڈنگ رولز کے مطابق انہیں سر پر پہننے کے لئے ایک ایک سیفٹی ہیلمٹ (ٹوپی) زیب تن کرنے کے لئے پیلے رنگ کی ایک ایک جیکٹ اور عام جوتوں کی جگہ پاؤں میں پہننے کے لئے بڑے بڑے بوٹ فراہم کئے گئے۔ اس کے بعد انہیں کام سمجھایا گیا۔ پیڈی چونکہ ایک تجربہ کار مزدور تھا اس لئے اسے فورلفٹ چلانے کے کام پر تعینات کیا گیا۔ جوزف کو ایک بڑھئی کے ساتھ لکڑی کا کام کرنے پر لگا دیا گیا۔ سینڈو کو سیمنٹ اور ریت مکس کرنے کا کام سونپا گیا اور برونو کو موٹے موٹے پتھر اور اینٹیں اٹھا کر معماروں کے پاس پہنچانے کا حکم دیا گیا۔

لائبریری کو جلد از جلد مکمل کرنے کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ یوں تو سب مزدور کام میں مصروف رہتے تھے مگر سیاہ فام مزدوروں سے بڑی چالاکی سے دن بھر کام کروایا جاتا تھا۔ ظاہری طور پر تو گورے معمار اور مزدور سینڈو اور برونو سے بڑا پیار جتاتے تھے' مگر من ہی من میں ان کے خلاف نفرت اور حقارت کا زہر گھولتے رہتے تھے۔ یوں تو دونوں سیاہ فام مزدوروں کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا مگر پھر بھی کھانے کے وقفے کے دوران سائٹ منیجر اور ہیڈ معمار رسمی طور پر ان کی خیریت پوچھتے رہتے تھے اور کئی بار تو ہیڈ معمار جب اپنا سگریٹ بنا کر رئیسانہ ٹھاٹھ سے دھواں اڑاتا ان کے پاس سے گزرتا تو انہیں بھی سگریٹ کی پیش کش کرتا۔ مگر سینڈو اور برونو یہ کہہ کر "نو سر۔ ہم سگریٹ نہیں پیتے۔" اس پیشکش کو ٹھکرا دیتے۔ انہیں صرف اپنے کام سے سروکار تھا۔ وہ بڑی تندہی' مستعدی اور ایمانداری سے کام کرتے تھے۔ ان سب کی لگاتار محنت سے لائبریری کی عمارت دو ماہ کے عرصے میں ہی تکمیل کے آخری مراحل میں پہنچ چکی تھی۔ اب اس عمارت کو جدید زندگی کے تمام تر تقاضوں اور سہولیات سے آراستہ کرنا باقی رہ گیا تھا۔ لائبریری کی اندرونی آرائش کا کام صرف گورے مزدوروں کو سونپا گیا تھا۔ عمارت کے درمیان ایک چھوٹا سا مستطیل نما باغیچہ اور اس کے چاروں اطراف پیدل چلنے کے لئے راستہ بنانے کے لئے کچھ وائٹ کاریگر ملازم رکھ لئے گئے تھے۔ انہوں نے پلان کے مطابق پہلے لائبریری کی عمارت کے ساتھ ساتھ قسم قسم کے خوبصورت پتھروں سے شاندار راستہ بنایا پھر درمیان کی جگہ کو اچھی طرح کھود کر ہموار کرنے کے لئے سینڈو اور برونو کو تعینات کیا گیا جب وہ جگہ ہموار ہو گئی تو پہلے وہاں پر ہری ہری گھاس بچھائی گئی۔ پھر چاروں طرف کیاریاں بنا کر ننھے ننھے پودے اور قسم قسم کے پھول لگائے گئے۔ اس کے بعد کارپوریشن کے ڈائریکٹرز کے ہاتھوں چند پیڑ بھی لگا دیئے گئے۔ اب اس باغیچے میں صرف ایک فوارہ لگانا باقی رہ گیا تھا۔

بخار اور نزلہ میں مبتلا ہونے کے باعث برونو کئی روز سے کام پر نہیں آ رہا تھا اس لئے سارے مشکل بیرونی کام سینڈو کے ذمہ تھے۔ گزشتہ چند دنوں سے وہ چھت پر ٹائلیں اور پینٹ پہنچانے میں مصروف تھا۔ وہ یہ کام بڑی مستعدی اور جانفشانی سے سرانجام دے رہا تھا۔ ایک دن صبح کے وقت ہی آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ فضا بھی کہر آلود تھی اور سورج بادلوں کی گود میں چھپ کر شاید کہیں سو رہا تھا۔ موسم کی خرابی کے باوجود لائبریری کی

چھت پر کام جاری تھا۔ چھت پر جانے کے لئے عمارت کی دیوار کے ساتھ لوہے کے بڑے بڑے پوسٹ نصب کر کے ان کے ساتھ لکڑی کے مضبوط اور لمبے لمبے تختے باندھے گئے تھے اور اوپر پہنچنے کے لئے ان پر ایک لمبی سیڑھی رکھی گئی تھی۔ سینڈو اپنا ضروری سامان لے کر آہستہ آہستہ سیڑھی پر چڑھ رہا تھا۔ جونہی وہ چھت کے قریب پہنچا اچانک اس کا پاؤں پھسلا اور وہ لکڑی کے بڑے بڑے تختوں سے ٹکراتا اور ہوا میں ڈولتا ایک دلسوز چیخ کے ساتھ دھڑام سے نیچے آ گرا۔ اس کی دلسوز چیخ اور دھڑام سے نیچے گرنے کی آواز سن کر سائٹ پر کام کرنے والے تمام مزدور اور معمار بھاگ کر باہر نکل آئے۔ انہوں نے دیکھا وہ سیاہ فام مزدور سینڈو بلڈنگ کے درمیان بنے باغیچے میں اوندھے منہ گرا پڑا تھا۔ وہاں ایک خاصی بھیڑ جمع ہو گئی تھی اور سب اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے۔ گورا سائٹ مینجر ابھی باہر نہیں آیا تھا۔ وہ شاید اپنے دفتر میں پولیس کو فون کرنے میں مصروف تھا۔ اسے اس طرح بے حس و حرکت زمین پر گرا دیکھ کر جوزف نے ہیڈ معمار سے کہا۔ ''چلو چل کر دیکھیں وہ زندہ ہے یا مر گیا۔''

''نہیں نہیں ہم اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ یہ پولیس کیس ہے۔ پڑا رہنے دو اس بلیکی کو اسی طرح۔''

گورے ہیڈ معمار نے جواب دیا۔

''پولیس تو پتہ نہیں کب آئے گی۔ ہم سب جا کر اسے دیکھیں تو سہی۔ آخر وہ ایک انسان ہے اور ہمارا ساتھی بھی ہے۔''

''تم اس گینڈے کو انسان کہتے ہو۔ نہیں مائی ڈیئر یہ انسان کی طرح دکھائی ضرور دیتا ہے مگر اصل میں یہ بلیکی ہے بلیکی۔ ہمارا اس سے کیا تعلق۔''

''مگر پرسوں تو تم اس سے بڑا پیار جتا رہے تھے اور خود ایک سگریٹ بنا کر اسے پیش کر رہے تھے۔''

''مائی ڈیئر یہ تو ہم وائٹ لوگوں کا پرانا کھیل ہے اور ہم نے اپنی اسی سیاسی حکمت عملی سے آدھی سے زیادہ دنیا پر حکومت کی تھی اور پھر جب کسی سے کام لینا ہوتا ہے تو ہم گدھے کو تو کیا ایک خارش زدہ کتے کو بھی اپنا باپ بنا لیتے ہیں۔ رہی بات سگریٹ کی تو اس میں بھی میرا اپنا ہی فائدہ تھا۔''

''تمہارا فائدہ۔ وہ کیسے میں کچھ سمجھا نہیں۔'' جوزف مجسم سوالیہ نشان بن گیا۔

''وہ اس طرح کہ جو سگریٹ میں خود بنا کر سموک کرتا ہوں۔ اس کے تمباکو میں تھوڑی سی براؤن شوگر یعنی ہیروئن پاؤڈر ملا لیتا ہوں۔ ایسے سگریٹ کے کش لینے سے دل و دماغ پر ایک نشہ سا چھا جاتا ہے اور انسان ہوا میں اڑنے لگتا ہے اور پھر کام کرتے ہوئے کوئی تھکان بھی محسوس نہیں ہوتی۔ اگر سینڈو میرے کہنے پر وہ سگریٹ سموک کرتا تو وہ نشے کے عالم میں ایک تو خوب ہمارا کام کرتا اور دوسرے اسے ایسا سگریٹ سموک کرنے کی عادت پڑ جاتی تو میں وہ براؤن شوگر اسے دوگنے داموں پر فروخت کرتا۔''

ابھی وہ دونوں اپنی بات پوری طرح ختم بھی نہیں کر پائے تھے کہ انہوں نے دیکھا کہ اس بھیڑ میں کھڑا ایک اور گورا کاریگر سینڈو کی طرف اشارہ کر کے اسے زور زور سے گالیاں دے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید

نفرت اور حقارت کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے۔ اسے اس طرح چلاتا دیکھ کراس کے پاس کھڑے آئرش پیڈی نے پوچھا۔ ''کیوں بھائی تم بیچارے سینڈو کو اس قدر گالیاں کیوں دے رہے ہو۔ اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟''

''گالیاں نہ دوں تو اور کیا کروں۔ اس بلڈی گینڈے نے نیچے ہی گرنا تھا تو کہیں اور جا کر گرتا۔ ہمارے بنائے ہوئے اس خوبصورت باغیچے میں کیوں گرا۔ ہم لوگوں نے بڑی محنت سے کل ہی اس باغیچے کو مکمل کر کے اسے رنگ رنگ کے پھولوں سے سجایا تھا۔ آج اس باسٹرڈ نے یہاں گر کر تمام ننھے منھے پودوں اور پھولوں کو برباد کر ڈالا۔''

وہ اونچی اور کرخت آواز میں بولے جا رہا تھا اور غصے کی آگ کی تپش سے اس کا سفید اور نرم نرم چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور نفرت کی کڑواہٹ سے اس کی زبان بھی اینٹھنے لگی تھی۔ اسی اثنا میں پولیس کی سرکاری کار اپنا مخصوص سائرن بجاتی ہوئی وہاں آ پہنچی۔ پولیس کا سائرن سنتے ہی گورا سائٹ منیجر اپنے دفتر سے نکل کر بھاگتا ہوا وہاں آیا اور سب مزدوروں کو ڈانٹتا ہوا بولا۔ ''کیا شور مچا رکھا ہے یہاں پر۔ چلو چلو یہاں سے اور اپنا اپنا کام سنبھالو۔ ایک سیاہ فام مزدور ہی گرا ہے کوئی زلزلہ نہیں آیا جو اتنی بھیڑ جمع کر رکھی ہے۔'' اس کی ڈانٹ سنتے ہی سب معمار اور مزدور خاموشی سے جا کر اپنے اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

سرکاری کار سے پولیس کے دو افسر باہر نکلے۔ ان میں ایک انسپکٹر کی وردی میں ملبوس تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ چہرے پر غرور، نفرت اور عیاری کے آثار نمایاں تھے۔ دوسرے پولیس والے کی وردی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایک کانسٹیبل تھا۔ پولیس کو دیکھتے ہی سائٹ منیجر آگے بڑھا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''گڈ مارننگ آفیسر۔ میں راجر گرین ہوں۔ یہاں کا سائٹ منیجر۔ میں نے ہی آپ کو اس حادثے کے بارے میں فون کیا تھا۔''

''میں انسپکٹر ایلن وائٹ ہوں اور یہ کانسٹیبل جم بلیک ہے۔ بتائیے یہ حادثہ کب اور کیسے ہوا؟''

''حادثہ کوئی دس منٹ پہلے ہی ہوا تھا۔ آپ میرے دفتر میں چلیں۔ میں آپ کو تفصیل سے بتاتا ہوں۔'' راجر گرین نے کہا۔

''ٹھیک ہے مسٹر گرین۔'' یہ کہہ کر وہ کانسٹیبل بلیک سے مخاطب ہوا۔ ''جم تم یہاں لاش کے پاس کھڑے رہو اور جونہی ایمبولینس آئے ہمیں خبر کر دینا۔''

''یس سر۔'' پی سی بلیک نے جواب دیا۔

راجر گرین اور انسپکٹر ایلن وائٹ سرگوشیوں میں باتیں کرتے ہوئے دفتر کی طرف بڑھ گئے۔ دفتر میں بیٹھ کر وہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔ کوئی پانچ چھ منٹ کے بعد ہی ایمبولینس والے اپنا مخصوص سائرن بجاتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ایمبولینس کا سائرن سنتے ہی راجر گرین اور انسپکٹر وائٹ بھی دفتر سے نکل کر وہاں آ گئے۔

ایمبولینس ٹیم کے دو ممبر اسٹریچر لے کر سینڈو کے پاس پہنچے۔ اسے سیدھا کیا اور پھر اس کی نبض ٹٹول کر دیکھی تو وہ ڈوب چکی تھی اور زندگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ پھر بھی انہوں نے اس کی ناک پر آکسیجن ماسک لگا کر اسے اسٹریچر پر ڈالا اور ایمبولینس میں سوار ہو کر سائرن بجاتے ہوئے ہسپتال کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب انسپکٹر وائٹ اور پی سی بلیک سرکاری کار میں سوار ہوئے تو راجر گرین نے انسپکٹر وائٹ سے پوچھا۔ ''تو پھر میں سر والٹر کو کیا جواب دوں؟''

''سر والٹر سے کہہ دینا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم سب سنبھال لیں گے۔'' انسپکٹر وائٹ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

پی سی بلیک نے بھی راجر گرین سے مسکرا کر ہاتھ ملایا اور کار اسٹارٹ کر کے تیزی سے نیو کراس ہسپتال کی طرف بڑھ گئے۔

پولیس کے وہاں سے جاتے ہی راجر گرین لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اپنے دفتر میں پہنچا اور فون اٹھا کر کمپنی کے چیئر مین سر والٹر سے رابطہ قائم کرنے لگا۔ مگر کمپنی کا نمبر مصروف تھا۔ وہ سر والٹر سے بات کرنے کے لئے بے چین ہو رہا تھا۔ دو منٹ کے انتظار کے بعد اس نے پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیا مگر وہ نمبر ابھی تک مصروف تھا۔ سر والٹر سے فوری طور پر رابطہ قائم نہ ہونے کی وجہ سے راجر گرین گھبرا سا گیا اور اس کے چہرے پر جھنجھلاہٹ اور پریشانی کے آثار ابھرنے لگے۔ دو تین منٹ کے انتظار کے بعد اس نے پھر نمبر ڈائل کیا تو سر والٹر کی سیکریٹری ٹیسا جانسن نے فون اٹھایا۔ سیکریٹری کی آواز سن کر راجر گرین بولا۔

''ٹیسا۔ کین آئی پلیز سپیک ٹو سر والٹر۔ اٹ از وری ارجنٹ۔'' (ٹیسا کیا میں سر والٹر سے بات کر سکتا ہوں۔ یہ بہت ضروری ہے)

''او کے راجر۔'' ٹیسا نے جواب دیا اور پھر فوراً سر والٹر سے اس کا رابطہ قائم کر دیا۔

سر والٹر کی آواز سنتے ہی راجر گرین بولا۔ ''گڈ مارننگ سر والٹر۔ ابھی ابھی ایمبولینس والے اس بلیکی کی لاش کو نیو کراس ہسپتال لے گئے ہیں۔ میں نے پولیس انسپکٹر سے اس بارے میں ساری بات کر لی ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ پورا پورا تعاون کریں گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ مگر پھر بھی آپ ہسپتال میں ایمرجنسی وارڈ کے ڈاکٹروں سے بات کر لیں کیونکہ ڈاکٹروں نے غلط رپورٹ لکھ دی تو ہمیں بہت ہرجانہ دینا پڑے گا اور ہماری کمپنی کی بدنامی بھی ہو گی۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بلیکی کا حادثہ ہماری غفلت کے باعث ہوا ہے۔ اس لئے آپ کو فوری طور پر ڈاکٹروں سے بات کرنی پڑے گی۔ آپ ہیلتھ اتھارٹی سے رابطہ قائم کر کے ڈاکٹروں کا اعتماد حاصل کر لیں۔ ہماری طرف سے سب او کے ہے اور میں نے وہ ٹوٹی ہوئی سیڑھی بھی وہاں سے ہٹا کر دوسری رکھوا دی ہے۔''

''ٹھیک ہے راجر۔ تم فکر مت کرو۔ نیو کراس ہسپتال میں میری بہت جان پہچان ہے۔ ایسٹ لندن

ہیلتھ اتھارٹی کا چیئرمین بھی میرا پرانا دوست ہے۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم نے اس مزدور کے گھر والوں کو خبر کر دی تھی۔''

''یس سر۔ انسپکٹر وائٹ نے ہی اس کے گھر فون کر کے اپنے طریقے سے خبر دے دی تھی۔ اس کے بارے میں بھی آپ فکر نہ کریں۔''

''ویل ڈن۔ راجر۔ اب میں سب سنبھال لوں گا۔'' یہ کہہ کر سر والٹر نے فون بند کر دیا۔

سر والٹر کا جواب سن کر راجر گرین نے اطمینان کا سانس لیا اور اپنی آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی پر بیٹھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک لہر پھیل گئی۔ ایک ایسی مسکراہٹ جو کسی فاتح کے چہرے پر ہوتی ہے۔

دوسرے دن اخباروں میں جلی حروف میں یہ خبر شائع ہوئی۔

''سینٹرل لائبریری کی نئی بلڈنگ سے گر کر ایک سیاہ فام مزدور ہلاک۔ بتایا گیا ہے کہ مذکورہ مزدور ہیروئن اور کوکین جیسی نشیلی دواؤں سے نشہ کرنے کا عادی تھا اور سائٹ منیجر کی وارننگ کے باوجود نشہ کر کے کام پر حاضر ہوتا تھا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ اس سیاہ فام کی موت مہلک ڈرگس استعمال کرنے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ مزید بتایا جاتا ہے کہ پولیس نے تفتیش کے دوران اس کے کوٹ کی جیب سے ہیروئن اور کوکین کے دو چھوٹے چھوٹے پیکٹ بھی برآمد کر لئے تھے۔

o......o......o

شہر چشم میں بارش

ظفر سپل

اس دن میری ماں نے کافی دیر تک مجھے ایک ہی کتاب پوری توجہ اور انہماک سے پڑھتے دیکھ کر کہا تھا:

''دیکھو کوئی کتاب پڑھتے وقت تمہارے رویوں اور responses میں لچک ضرور ہونی چاہئے۔ ورنہ کہانی تم پر مسلط ہو جائے گی۔ تم اس پر مسلط نہیں ہو سکتے۔''

اور اسی دن جب ہم دو بجے تک اپنے ایئر کنڈیشنڈ یخ بستہ کمروں میں بیٹھے آسمان سے مقدس پانی کے برسنے کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو اچانک آسمان پر رحمت کے کالے سیاہ بادل مسلط ہو گئے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس دن میری چھوٹی بہن نے کپڑے کی بنی ہوئی اپنی ایک بہت پرانی گڑیا بھی جلائی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جب ہمیں کسی دن بارش ایسی رحمت کا شدت سے انتظار ہو تو اس دن ہمیں اپنی گڑیوں میں سے ایک گڑیا کو ضرور جلانا چاہئے۔

''مگر پرانی...... بیکار میں پڑی ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں useless''

پتہ نہیں کیوں مجھے اس گڑیا کی شکل و صورت سڑک کے کنارے مٹی کے کچے جھونپڑے میں رہنے والی سکینہ کی طرح لگی تھی -- بالکل ویسی میلی کالی۔

بارش کے پہلے قطرے کے ساتھ جب میرے چھوٹے بھائیوں نے لان میں ناچنا شروع کر دیا تو میری بڑی بہن نے انہیں سکس ملین ڈالر مین کے سٹکر لگی نیکریں لا کر دیتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں رحمت کی آمد کا استقبال پورے اہتمام کے ساتھ کرنا چاہئے۔'' اور انہوں نے پھر ناچنا شروع کر دیا۔

میں نے اوپر کے کمرے سے چیختے ہوئے کہا ''مگر رحمت اور زحمت میں امتیاز کس طرح کیا کریں۔ وہ چیز جو رنگوں، خوشبو اور دھنک کے وسیلوں پر چل کر صرف ہمارے گھر آئی ہے۔ کیا وہ رحمت ہوتی ہے؟'' مگر میری بات ان کے استقبالیہ نعروں میں ڈوب گئی۔

تھوڑی دیر بعد سٹریٹ کے تمام مردوں نے ترنگ میں آ کر موسم کی پہلی بارش کا استقبال اس طرح

کیا کہ انہوں نے بچوں کی طرح تیز تیز رسہ کودنا شروع کر دیا۔ میں نے دیکھا۔ رسے کے نصف گھیرے نے جب پہلی دفعہ سر سے پاؤں تک کا سفر مکمل کیا تو کچی آبادی کی کئی چھتوں نے اس کے ساتھ سانجھی کی۔

اور پھر سٹریٹ کی تمام عورتوں اور لڑکیوں نے سرخ چوڑیاں پہنیں اور ایک دوسرے کے گھر بھاگنا شروع کر دیا۔ لون کی پتلی قمیضوں نے جب جسموں سے رابطوں کے تمام حوالے پورے کئے تو میں نے سوچا ''روحوں نے ضرور احتجاج کیا ہوگا'' مگر میں اپنی بات سے مطمئن نہ ہو سکا۔ میرا بڑا بھائی کافی دیر تک شہلا کو عجیب عجیب نظروں سے دیکھتا رہا۔ پھر جلدی سے اندر آ کر ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا...... ''آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے تو بات بن جائے......'' اور پھر گلی کے تمام ڈسک پلیئر پوپ میوزک اگلنے لگے۔

ہم تو ویسے بھی نورمز (norms) کو اندرونی شہر کی گلیوں اور محلوں میں رہنے والے بیک ورڈز (backwards) کا شیوہ اور وطیرہ سمجھتے تھے' اگرچہ ہمارے پیرنٹس انہیں گلی کوچوں سے اٹھ کر ادھر آئے تھے۔ پور پیرنٹس (poor parents) لیکن ہم تو جدید لوگ تھے۔ جدید بستی میں رہتے تھے۔ جدید خیالات رکھتے تھے' جدید ہوا میں سانس لیتے تھے۔ برمودا اور میلی جین پہنتے تھے اور KFC پر لنچ کرتے تھے۔۔تو ہم تو ویسے بھی نورمز کو اندرون شہر کی گلیوں اور محلوں میں رہنے والے بیک ورڈز کا شیوہ اور وطیرہ سمجھتے تھے۔ اس دن بھی ہم سارے نورمز توڑنا چاہتے تھے۔ سو ہم نے ٹی پہلے ختم کی اور ٹی پر سرو کئے جانے والے پکوڑے بعد میں۔۔ اور اس سے پہلے کہ جدید ترین مخروطی کپوں میں ہماری چائے ختم ہو۔ میری بڑی بہن سارے بیسن کے پکوڑے تل چکی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا ''آج تم نے بشیراں کو کوئی کام بھی تو نہیں بتایا سوائے پیالوں کو دھونے کے'' مگر اس نے مجھے عجیب نظروں سے بھی نہیں دیکھا۔

اور پھر تمام کی تمام گیلے کپڑوں والی لڑکیاں' لڑکے اور بچے پکوڑوں پر جھپٹ پڑے۔ وہ زبردست ہلا گلا کر رہے تھے' اچھل رہے تھے۔ ایک دوسرے سے پکوڑے چھین رہے تھے اور عجیب عجیب طریقوں سے ایک دوسروں کو چھیڑ رہے تھے۔ کمرے کے تاریک ترین کونے میں لہراتے ہوئے بے چہرہ ہیولے سے میں نے پوچھا ''شائستگی؟''

جواب آیا ''Excitement, adventure, enjoyment, fastness''

''مذہب؟''

''تو تمہارا اولڈ فیشنڈ (old fashioned) مذہب مساوات ہی کی تعلیم دیتا ہے نا' تو تمام human beings برابر۔ لڑکے لڑکیاں' بچے' والدین۔''

او خدایا میں ہی شاید بھول رہا ہوں۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین میں شاید چیخا تھا۔ مگر مجھے اپنی چیخ سنائی نہ دی۔ اھدنا الصراط المستقیم۔

کتاب پڑھتے پڑھتے مجھے محسوس ہوا کہ ماں کے کہے کے مطابق میرے تمام تر رویوں میں

strictness ابھی تک موجود ہے۔ اس لئے میں نے کتاب شیلف میں لگا دی۔ اور کمرے کی کھڑکی میں آ کھڑا ہوا۔

•······•······•

اس دن، دن چڑھے ہی سے گرمی اور حبس نے جسم کو مضمحل کرنا شروع کر دیا تھا۔

شیر محمد نے آسمان کی طرف دیکھا، وہاں ہلکے ہلکے بادل نظر آ رہے تھے۔ پھر اس نے گھڑے کے پاس پڑے ہوئے کورے پیالے کو پانی سے بھرا اور غٹا غٹ پی گیا۔ اس کا سانس بحال ہوا تو اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا:

''سکینہ کی ماں۔ کہتی تو تو ٹھیک ہے کہ اگر چار چھینٹے بارش کے پڑ جائیں تو یہ دھرتی ذرا ٹھنڈی ہو اور گرمی کا زور ٹوٹے۔ پار سال بھی گرمی پڑی تھی لیکن اتنی نہیں۔ مگر نیک بخت تو دوسری طرف نہیں سوچ رہی۔''

''دوسری طرف؟ کیا مطلب'' سکینہ کی ماں نے اس کی طرف دیکھا ''یہی ناں'' وہ ذرا دیر کو چپ ہو گیا۔ پسینہ اس کی کنپٹی سے بہہ کر اس کے رخسار تک آ گیا تھا۔ اس نے جھولی میں رکھے ہوئے صافے کو اٹھا کر اپنا پسینہ صاف کیا۔ اور دوبارہ مخاطب ہوا:

''یہی ناں۔ تو جانتی تو ہے۔ لیکن پھر بھی پوچھتی ہے۔ اپنا تو دھندا ہی ایسا ہے۔ بارش نے گرمی تو ختم کر دینی ہے۔ پر بھوک تو نہیں مٹانی ناں یہ۔ ادھر لوگ ہیں کہ صبح بادل دیکھ کر ہی اس دن تعمیر کا کام بند کر دیتے ہیں۔ کہ کہیں دوپہر تک بارش نہ ہو جائے۔ اور مزدوروں کو ساری دیہاڑی کے پیسے نہ دینے پڑ جائیں۔ اگر بارش ہو گئی تو سمجھو۔ آج کی تو اپنی دیہاڑی ماری گئی۔ اور اپنا تو آج کا راشن بھی ختم ہے۔''

پھر ہوا بھی ایسے ہی۔ اس دن کسی دیہاڑی دار کو مزدوری نہیں ملی۔ شیر محمد جب گھر واپس آ رہا تھا تو اس وقت آسمان پر بادل کافی گہرے ہو چکے تھے اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ ہوا نے اس کے جسم کو ذرا ہلکا کر دیا۔ اور اس نے اپنے اندر کہیں آسودگی محسوس کی۔ جب وہ گھر پہنچا تو ہلکی ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی۔ سکینہ کی ماں اس کو واپس آتا دیکھ کر ساری صورت حال سمجھ گئی۔ لیکن چپ رہی۔

وہ اندر آ کر چٹائی پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ ذرا دیر خاموشی رہی۔ بچوں نے اپنے پرانے جانگیے اتار دیئے تھے اور باہر ننگ دھڑنگ اچھل کود کر رہے تھے۔ شیر محمد نے مسکرا کر اپنی بیوی کو دیکھا اور کہا:

''نیک بخت۔ آج اگر تو ایک پیالہ چائے پلا دے ناں۔ تو ٹھنڈے موسم کا مزا ہی آ جائے۔''

اس کی بیوی بھی جواب میں مسکرائی۔ لیکن اس میں پھیکا پن تھا:

''چائے تو میں بنا دیتی۔ گھر میں چائے کی پتی بھی ہے۔ کہیں سے گڑ بھی ڈھونڈ لوں گی۔ لیکن دودھ کہاں سے لاؤں۔''

شیر محمد نے ذرا شرمندگی سی محسوس کی۔ ''رہنے دے۔ کوئی خاص طلب نہیں ہے۔ میں تو بس ویسے ہی

موسم کو دیکھ کر کہہ رہا تھا۔"

جھونپڑے کے اندر خاموشی چھا گئی۔ باہر سے بچوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سکینہ بھی اٹھ کر باہر چلی گئی۔ تب اس نے دیکھا کہ چھت تو کئی جگہ سے ٹپک رہی تھی۔ اس نے اور سکینہ کی ماں نے مل کر کئی جگہ نیچے برتن رکھے۔ پر بارش تیز ہو گئی تھی۔ اور چھت کے شگافوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب کئی جگہ سے چکنی مٹی اور گوبر سے لپا ہوا فرش نظر نہیں آ رہا تھا۔ پانی کو انہوں نے اپنے پاؤں پر محسوس کیا تو وہ دونوں میاں بیوی جھونپڑے کے دروازے پر آ گئے۔ اور آسمان کی طرف دیکھا۔

ہوا کا طوفان بہت تیز ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کو اندھیرا ہوا۔ پھر بجلی چمکی تو بچے اور سکینہ سمٹ کر ماں باپ کی طرف آ گئے۔ کہیں پرے آسمان پر بادل زور سے گرجا۔ تو شیر محمد نے اپنی بیوی سے مخاطب ہو کر کہا:

"نیک بخت! آج یہ چھت نہیں رہنے کی۔"

o......o......o

بارش میں جب مزید تیزی آ گئی تو میرے بڑے بھائی نے اپنے دو تین دوستوں کی مدد سے مجھے باہر کھینچتے ہوئے کہا:

"انجوائے منٹ بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ لگتا ہے زندگی اور اس کے تمام تر حوالے تمہارے وجود میں آخری سانسیں لے رہے ہیں۔"

"مگر زندگی کی ایک قیمت ہے۔ جو ہم سب کو ادا کرنا ہے۔ ہم وقت کی آنکھ کے محور سے باہر نہیں ہیں۔ ہماری فردِ عمل مرتب ہو رہی ہے۔ دھرتی ہمیں معاف نہیں کر سکتی۔ زندگی کے سامنے ہمیں جواب دہ ہونا پڑے گا۔"

"فلسفہ ہر جگہ دلیل نہیں بن سکتا۔" میرے بھائی نے میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈالتے ہوئے کہا "اور پھر فطرت نے ہر چیز میں ایک بیلنس رکھا ہوا ہے وہ ہی نیل کنٹھ پیدا کرتی ہے کہ زہر پی کر قربانی کے سارے تقاضے پورے کر دے۔"

"مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ہم آبِ حیات پی کر باقی عمر خضر کی ابدیت کے خواب دیکھنے میں گزار دیں" پوری بات سننے سے پہلے انہوں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اس دفعہ مجھے اپنی واضح چیخ سنائی دی۔"

گلی کے نکڑ پر پہنچ کر میرے بھائی نے میرے ہاتھ کو دبا کر آنکھ مارتے ہوئے کہا:

"یہ ہوئی enjoyment نا- زندگی"۔

o......o......o

جب ہم سڑک کے کنارے پہنچے تو ہمیں معلوم ہوا کہ سڑک کے کنارے والے تمام کچے جھونپڑے گر چکے ہیں۔ سکینہ اور اس کے چھوٹے بھائی باہر کچی، گیلی، بے خوشبو، بے رنگ، بے ڈھنگ مٹی پر دھرنا مارے بیٹھے

تھے۔ اس کی گیلی اور پھٹی ہوئی قمیض اس کے جسم کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً اپنے بھائی کی طرف دیکھا۔ مگر میں یہ دیکھ کر لرز اٹھا۔ کہ وہ اس طرف بالکل بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ پھر سکینہ کے چھوٹے بھائی کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ ایک ٹوٹا ہوا مٹی کا پیالہ ہاتھ میں لئے کہہ رہا تھا:

''آپا میں نے تو ابھی تک کچھ بھی نہیں کھایا''

اور پھر عذاب میری شریانوں اور وریدوں میں دوڑنا شروع ہو گیا۔ میری آنکھوں میں بہت سے کالے کالے بادل امنڈ آئے۔ میں نے فوراً وہ رومال جو میری بڑی بہن سکول جانے سے پہلے میری جیب میں ٹھونس دیا کرتی تھی' نکالا اور اپنی دونوں آنکھوں پر تان لیا۔ مجھے لگا اگر میں نے اس بارش کو نہ روکا تو پھر برسے بہہ جائے گی۔ میرا وجود بھی' میرا گھر بھی' میرا محلہ بھی' میرا شہر بھی۔

o......o......o

جنازہ

جنید اقبال

میاں صحیف الدین آج صبح فوت ہوئے اور عصر کے بعد ان کا جنازہ تھا۔ جونہی یہ خبر وزیر علی کی گھر والی نے انہیں سنائی تو وہ اپنی بیوی پر برس پڑے۔ کبھی تو کوئی اچھی خبر سنا دیا کرو ہمیشہ کوئی بری خبر ہی تمہارے منہ سے نکلتی ہے۔ پہلے ہی میں اتنا مصروف ہوں اب میاں صاحب کا جنازہ بھی پڑھنا پڑے گا اور کم از کم میرا ایک گھنٹہ تو ضرور ضائع ہو گا۔

بیوی یہ جلی کٹی سن کر چپ رہنے والی کہاں تھی اور وہ بیوی ہی کیا جو مرد کا غصہ دیکھ کر خاموش ہو جائے' فوراً جوابی حملہ کر دیا۔ وزیر علی میاں صاحب کے جنازے کے بہانے ہی مسجد کا منہ دیکھ لینا اور عصر کی نماز پڑھ لینا ویسے تو کبھی تمہیں نماز کی توفیق ہوئی نہیں۔ وزیر علی فوراً بولے۔ آہا--ہا--ہاہا----اور تم تو جیسے تمام نمازیں پڑھتی ہو۔ بیوی فوراً بولیں' ارے وزیر علی کچھ خدا کا خوف کرو پانچ کی پانچ پڑھتی ہوں تم گھر کہاں ہوتے ہو جو تمہیں معلوم ہو۔ کبھی کبھار ایک آدھ گھر کے کام کاج' بچوں کی دیکھ بھال میں رہ جاتی ہے تو کیا ہوا' اللہ کے حضور معافی کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔ وزیر علی فوراً سٹپٹائے! ارے بیوی کیا یہ دروازے صرف تمہارے لئے ہی کھلے ہیں' تم ہی ایک کامل مسلم ہو اس دنیا میں کیا؟

بیوی نے جب میاں کو مکمل طور پر تنگ کر کے بیوی ہونے کا فرض نبھا لیا تو فوراً کھانا لگا دیا۔

میاں کے منہ میں نوالا چلا گیا تو بیوی کو اور کھل کر بولنے کا موقع ملا۔ اللہ بخشے دادی حضور فرمایا کرتی تھیں قبر کا عذاب برا ہوتا ہے۔ قبر میں سب سے پہلے نماز کے متعلق ہی سوال کیا جاتا ہے۔ ارے وزیر علی' میاں صحیف الدین تو سنا ہے پانچ وقت کے نمازی تھے۔ وزیر علی بولے' ارے کہاں! اتنے پکے بھی نہیں' ہاں کبھی کبھار نماز پڑھ بھی لیتے تھے' کہا کرتے تھے رمضان میں نمازوں کا ثواب دوگنا چوگنا ہو جاتا ہے۔

بیوی بولیں ہاں بھئی ہو تو جاتا ہے لیکن گنتی تو پوری نہیں نہ ہوتی۔

میاں بولے کیا مطلب؟

بیوی بولیں ارے بھئی باقی عمر کی نمازیں بھی پڑھنی ہیں نا' صرف ثواب زیادہ ہونے سے ان کو چھوٹ

نہیں مل جائے گی۔
وزیر علی بولے چلو چھوڑو بیگم مرنے والے کے متعلق صرف اچھی باتیں ہی کرنی چاہئیں۔
ابھی یہ گفتگو چل ہی رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ وزیر علی نے دیکھا تو ساتھ والے ہمسائے ہشام صاحب تھے۔
وزیر علی کو ہشام صاحب سے ملے عرصہ ہو چلا تھا۔ علیک سلیک کے بعد ہشام صاحب بولے بھئی وزیر صاحب کیا پروگرام ہے میاں صاحب کے جنازے کا؟ وزیر علی بولے پروگرام کیا' بس عصر کے وقت مسجد پہنچ جائیں گے اور جنازہ پڑھیں گے۔ ہشام صاحب بولے بھئی کیا ہی اچھا ہوا گر آدھ گھنٹہ پہلے پہنچ جائیں' عرصہ ہوا آپ کی میری ملاقات کو اسی بہانے کچھ گپ شپ بھی ہو جائے گی۔ وزیر علی بولے جیسا حکم جناب کا' میں پہنچ جاؤں گا۔ میاں صاحب جب واپس کھانے کی میز پر پہنچے تو بیوی نے فوراً بیویوں والے انداز میں پوچھا' کون تھا؟
میاں نے تمام کہانی بتادی اور کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے۔
کھانا کھانے کے بعد وزیر علی کہنے لگے بھئی بیگم وہ میرا ذرا سفید رنگ کا سوٹ استری کر دینا میاں صاحب کے جنازے کے لئے۔ بیگم جل بھن کر بولیں آپ کے لئے تو سفید سوٹ استری ہو جائے گا' آخر میں نے بھی تو جانا ہے میاں صاحب کی بیوہ سے افسوس کے لئے۔ وزیر جان بوجھ کر نہ سمجھتے ہوئے بولے بھئی جاؤ' روکا کس نے ہے؟
بیگم فرمانے لگیں کیا خاک جاؤں' وزیر علی بولے بھئی اتنے کپڑے ہیں تمہارے پاس' کوئی پہن جاؤ۔ بیوی فرمانے لگیں وہ سب تو دعوتوں وغیرہ پر پہن کر جانے کے لئے ہیں۔ وزیر علی بولے بھئی بیگم اب کیا افسوس پر جانے کے لئے بھی نئے سوٹ سلیں گے۔ تو اور کیا' اور وہ میری گلے کی چین بھی ابھی تک ٹوٹی پڑی ہے' آپ نے مرمت نہیں کروا کر دی۔ وزیر علی بولے بھئی بیگم کوئی خدا کا خوف کرو۔ بیگم بولیں اپنے لئے تھوڑا ہی کر رہی ہوں یہ سب کچھ۔ یہ سب کچھ تو آپ کے لئے کر رہی ہوں۔ شوہر کی عزت بنتی ہے اس سے۔ وزیر علی بولے بھاڑ میں گئی ایسی عزت۔ یہ کہہ کر وہ کپڑے تبدیل کرنے کے لئے چلے گئے۔ کپڑے تبدیل کر کے وہ جنازے کے لئے نکلنے لگے تو بیگم کا پھولا ہوا منہ دیکھ کر منانے لگے۔ بھئی ابھی وقت نکال لو آئندہ کے لئے جو کہو گی بنوا دوں گا۔ مجھے تھوڑا ہی پتہ تھا کہ میاں صحیف الدین آج جنت سدھار جائیں گے ورنہ میں تمہیں پہلے ہی سوٹ سلوا دیتا۔ چلو اب غصہ تھوکو اور میاں صحیف الدین کی بیوہ سے افسوس کر آؤ۔ یہ کہہ کر وزیر علی باہر نکلے تو ہشام صاحب سامنے ہی کھڑے تھے۔ دونوں خراماں خراماں میاں صاحب کے گھر کی طرف چلنے لگے۔
ہشام صاحب وزیر علی سے کہنے لگے' اب میاں صاحب کا سارا کاروبار ان کا بڑا بیٹا ہی سنبھالے گا۔
وزیر علی نے کچھ اور سوچتے ہوئے کہا' بھئی ہونا تو یہی چاہئے اگر کوئی اور دعوی دار نہ نکل آیا تو۔
ہشام صاحب کہنے لگے بھئی ہمارا تو بڑا کاروباری لین دین تھا میاں صاحب سے' اب تو ان کے بیٹے

سے مراسم بڑھانے پڑیں گے۔

وزیر علی نے کہا بھئی آپ اپنی کاروباری نزاکت کو بہتر سمجھتے ہیں۔ یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں اصحاب ابھی میاں صاحب کے گھر کے قریب ہی پہنچے تھے کہ ایک بچہ ہشام صاحب کے پاس دوڑتا ہوا آیا اور بتایا کہ آپ کے والد دل کا دورہ پڑنے سے چل بسے ہیں۔ ہشام صاحب یہ سن کر گھر کی طرف بھاگے اور وزیر علی انہیں دیکھتے رہ گئے۔

وزیر علی کی چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے' شاید اس لئے کہ انہیں اب ایک اور جنازے کے لئے وقت نکالنا پڑے گا۔

منیرہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محبت امر ہے بعض لوگ محبت کو امر نہیں جانتے۔ کچھ لوگ تو اس جذبے کی صداقت اور مثبت اثرات پر بضد ہیں جبکہ ایک خاص حلقہ احباب اس جذبے کو رذیل اور ضیاع وقت قرار دیتا ہے۔

لیکن منیرہ کا محبت کے متعلق کچھ اور ہی خیال تھا۔ منیرہ تھی بھی اپنے نام کی طرح عجیب۔ شکل و صورت میں کوئی خاص معصومیت یا خوبصورتی نہ تھی' جسامت بھی کوئی خاص معنی نہ رکھتی تھی۔ لیکن اس میں کشش بہت زیادہ تھی۔ شاید اس کشش کا باعث اس کی یہی عجیب بات تھی۔

منیرہ کے عجیب قسم کے خیالات اسے ہر محفل میں منفرد حیثیت دلاتے تھے۔ منیرہ کو کسی سے کوئی محبت نہ تھی لیکن پھر بھی بقول اس کے وہ اس جذبے کی تمام اونچ نیچ اور اثرات کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ منیرہ کو کھانا پکانے اور گھر کے کاموں میں کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ تعلیمی لحاظ سے وہ ایک ادنیٰ درجے کی طالب علم تھی۔ بی اے پاس کرنے کے بعد بقول منیرہ کے اس کے خیالات میں اور پختگی آ گئی تھی۔ منیرہ کی شادی بھی ایک مسئلہ تھی' کیونکہ منیرہ اپنے جیون ساتھی کے متعلق کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے ہر امیدوار کے ساتھ کچھ سوال و جواب کرنا چاہتی تھی اور اس کے عجیب قسم کے سوالات' ایک نارمل انسان کو شادی کے فیصلے سے متنفر کرنے کے لئے کافی تھے۔

مثال کے طور پر وہ پوچھتی تھی کہ کیا ایک نارمل انسان شادی کے بغیر زندگی گزار سکتا ہے۔ اگر جواب ہاں میں ہوتا تو وہ کہتی جب آپ ایک نارمل انسان ہیں اور بقول آپ کے ایک نارمل انسان شادی کے بغیر زندگی گزار سکتا ہے تو پھر آپ شادی کیوں کر رہے ہیں؟ اگر کوئی برخوردار ڈھٹائی سے کہہ دیتا کہ وہ نارمل نہیں ہے تو منیرہ فوراً جواب دیتی' میں ایک ابنارمل انسان کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ اگر کوئی امیدوار کہتا کہ ایک نارمل انسان شادی کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا تو منیرہ جواب دیتی آپ میں برداشت کرنے کی قوت نہیں ہے اور

میرے ساتھ زندگی گزارنا بڑی برداشت اور حوصلے کا کام ہے۔ منیرہ کو اپنی عمر گزرنے کی کوئی پرواہ نہ تھی اس کی وجہ اس کے محبت کے متعلق عجیب قسم کے خیالات تھے۔ منیرہ اکلوتی ہونے کی وجہ سے بھائی بہنوں کے جھنجھٹ سے آزاد تھی اور اسی لئے فطرتاً تنہائی پسند تھی۔ اسے کھیلوں سے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی کیونکہ اس کے خیال کے مطابق کھیل صرف ذہنی اور جسمانی اعصاب کو تنومند بنانے کا ایک ذریعہ ہیں اور کھیل سے انسان میں ہار برداشت کرنے کی قوت اور جیت کو محظوظ کرنے کا جذبہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ تمام چیزیں منیرہ میں پہلے سے ہی موجود تھیں۔ ظاہری طور پر منیرہ ایک بے رنگ اور ناکام زندگی گزار رہی تھی لیکن بقول منیرہ کے وہ ایک رنگا رنگ اور کامیاب زندگی گزار رہی ہے۔ کیونکہ وہ محبت کے اصل معنی سمجھتی ہے اور بقول منیرہ کے کامیاب زندگی گزارنے کے لئے لفظ محبت کو صحیح طور پر سمجھنا از حد ضروری ہے۔

منیرہ کے مطابق......

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کا وجود نہیں ہوتا لیکن کسی بھی انسان کو اپنے اندر اس جذبے کو پیدا کرنے کے لئے زیادہ تگ و دو کی ضرورت نہیں ہوتی' یہ جذبہ خودرو پودے کی طرح ہوتا ہے۔ جو کہ کسی بھی انسان کے اندر کسی بھی شکل میں اچانک جنم لے سکتا ہے اور آہستہ آہستہ نشوونما پاتا رہتا ہے آخرکار انسان کے محسوسات پر حاوی ہو جاتا ہے۔

انسان کسی بھی چیز کے سامنے اتنا بے بس نہیں ہوتا جتنا کہ اس خودرو جذبے کے سامنے ہوتا ہے۔

منیرہ کو بے بسی قطعاً پسند نہیں۔ اسی لئے منیرہ کا کہنا ہے ہمیں اس بے بسی سے بچنے کے لئے اس جذبے کے وجود سے ہی انکاری ہونا چاہئے جیسا کہ میں ہوں۔

لیکن میں پھر بھی بے بس ہوں' کیا ہوا جو وہ مجھے بھری جوانی میں چھوڑ گیا۔

⚬......⚬......⚬

چھٹکارہ

سعدیہ اشرف قریشی

رات کے خوفناک سایے بڑھتے جا رہے تھی۔ ریحانہ کمرے میں کھڑکی کھولے رسالہ پڑھنے میں مصروف تھی۔ خنکی بھری ہوا نے اس کے چہرے پر لٹکے آنچل کو جنبش دی تو وہ کھڑکی بند کرنے کے لئے اٹھی۔ اسی لمحے بڑی ساری کالی چادر میں لپٹا عباس دیوار سے صحن میں کود گیا۔ ریحانہ نے حسب معمول عباس کی حرکت پر خفگی کا اظہار کیا۔ اس کے کمرے تک آنے سے پہلے وہ دوبارہ لحاف میں گھس گئی۔

''نہیں چھوڑوں گا میں اس منحوس کو۔ میری رگوں میں دوڑتا ہوا خون مجھے چین سے نہیں رہنے دے گا جب تک میں اس ذلیل کو کیفر کردار تک نہ پہنچا دوں۔'' وہ حسب عادت لمبی بندوق کو زمین پر مارتے ہوئے بڑبڑایا۔ تو ریحانہ نے لحاف سے منہ باہر نکالتے ہوئے کہا۔

''آخر تم کس منحوس کو ٹھکانے لگاؤ گے؟ وہ کون ہے کہاں ہے؟ مجھے بھی بتاؤ۔ بیوی ہوں تمہاری۔ جس دن سے بیاہی گئی ہوں تمہارے ارادوں نے میری زندگی اجیرن کی ہوئی ہے۔'' کچھ توقف کے بعد پھر بولی۔

''میرے پاس آؤ...... ادھر بیٹھو...... مجھ سے آرام سے بات کرو۔ جو کچھ تمہارے دل میں ہے اور نہیں تو دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ہی مجھ سے کہہ ڈالو...... میں غیر تھوڑی ہوں عباس!''

عباس بے چین ہو کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ عجیب بیزاری اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے ظاہر ہو رہی تھی۔ ایک ٹک فرش پر دیکھتا رہا پھر گویا زندگی کی کتاب کھول شریک حیات کے سامنے رکھ دی۔

''ریحانہ جب بھی بچپن کے دنوں میں جھانکتا ہوں۔ بیتا ہوا ایک ایک پل امی ابو کی بیقراری کے ہر ہر لمحے کی کڑواہٹ میرے حلق میں کسی نشتر کی طرح گڑھ جاتی ہے۔ ان دونوں نے صرف دو ماہ کے وقفے میں میرا ساتھ چھوڑ کے مجھے اس دلدل میں جھونک دیا۔ جہاں میں جی سکتا ہوں نہ مر سکتا ہوں۔ جب میں چھوٹا سا تھا ''بی بی ساحرہ'' کا نام میرے کانوں میں ہر دم پڑتا تھا۔ لمبا چوڑا کرتہ پہنے ہر وقت کسی چلے میں مصروف ''بی بی'' پورے علاقے میں جادوگرنی مشہور تھی۔ لوگوں کا اس کے تعویذ گنڈوں پر اتنا عقیدہ مضبوط تھا کہ کبھی کسی کی گائے کھڑی کھڑی گر کر مر جاتی، کبھی کسی کے گھر میں اچانک بغیر کسی چور ڈاکے کے چوری ہو جاتی، کبھی کسی کی جوان لڑکی کے

بال کٹ جاتے تو کبھی دروازوں کے باہر چاول اور دال کی ڈھیریاں لگا دی جاتیں۔ دوسرے گھروں کی طرح میرے دوست علی کے گھر سے مٹھی بھر تعویذ ہر ہفتے نکلا کرتے اور چھت کے اوپر (کورے) گھڑے کی ٹھیکریاں پھینکی ہوتیں۔ میرے امی ابو کو بھی بہت وہم تھا مجھے اسی لئے انہوں نے ساتویں جماعت میں ہی شہر بھیج دیا۔ تعویذ گنڈے پر میرا اعتبار تو بالکل نہیں تھا۔ ایک کان سے سنتا دوسرے سے نکال دیتا۔ کسی کے ہاتھ جب بھی شہر ابو کا رقعہ آتا یہ ضرور لکھا ہوتا ''بیٹا وہ بہت تنگ کرتی ہے' ہر روز ہمارے دروازے کی دہلیز پر لوٹا بھر تعویذوں والا پانی چھڑکا جاتی ہے۔''

ابا کے خط کا ایک ایک حرف ان کی تلخ زندگی کا عکاس تھا۔ دن بدن بڑھتے اضطراب سے گھبراہٹ ہونے لگی۔ گھربار کا سکون تباہ ہوگیا۔ امی' ابو کی لڑائی شروع ہوگئی۔ ان سب باتوں کا علم مجھے ہر خط سے ہوتا۔ میں اگلی جماعتوں کی طرف بڑھتا رہا اور وہ زندگی کے آخری دنوں کی تلخیوں کو سمیٹتے ہوئے جیتے رہے۔

ابو پٹواری تھے شروع ہی سے گھر میں پیسے کی ریل پیل تھی۔ ہر آسائش کے باوجود سکون نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا روپیہ کہاں سے آتا ہے کہاں جاتا ہے۔

اچانک ایک دن پتہ چلا...... ابو چل بسے۔ اس ناگہانی مصیبت کے لئے نہ میں تیار تھا نہ امی۔ وہ تو بستر کے ساتھ ہی لگ گئیں۔ گھر بھر میں نحوست پھیل گئی۔ شہر آنے کا سوچتا تو نظر ماں پہ ٹھہر جاتی۔ بی اے کا امتحان انہی حالات کی نذر ہوگیا۔ زندگی کی گاڑی چلانے کے لئے پیسہ چاہئے سوچا اب تو شہر جانا ہی ہوگا۔ ابھی شہر آئے ہوئے چار دن ہی گزرے ہوں گے کہ خبر ملی امی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے۔ فوراً واپسی کا سفر باندھ لیا۔

ماں نے زندگی چھوڑ کے میری زندگی کی تلخی میں اپنا حصہ ڈالتے ڈالتے مجھ پہ ایک اور انکشاف کر ڈالا کہ ''میں ان کا بیٹا ہی نہیں ہوں۔''

''کیا'' ریحانہ نے چونک کے کہا۔ مگر اس کے تاثر کا جواب دیئے بغیر عباس ماضی سے حال کی طرف بڑھتا گیا۔

''دیکھتے ہی دیکھتے میرے کانوں نے ماں کی وفات کے اعلان کی صدا بھی سن لی۔ زندگی اتنی تلخ' اتنی بے مروت بھی ہوسکتی ہے سوچا بھی نہیں تھا۔ ماں کی تدفین کے بعد زیادہ عرصہ گاؤں میں ٹھہر نہ سکا۔ مجھے ابو کے کہے ہوئے الفاظ ہر آن سنائی دینے لگے تو وحشت میں ہر گھڑی اضافہ ہوتا چلا گیا۔

''وہ ہمیں بہت تنگ کرتی ہے۔ وہ بہت ظالم ہے۔ جادو ٹونے کے زور سے زندگیوں کا سودا کرتی ہے۔ نیاز موچی کی ماں اسی کے تعویذ سے پاگل ہوگئی بے چاری...... عامل صاحب بتا رہے تھے کہ ہمارے گھر بھی اس نے تعویذ دبا رکھے ہیں...... چولہے کے پاس......''

شہر آنے کے بعد میں ابو کی بتائی ہوئی جگہ یعنی چولہے کے قرب میں تعویذوں کی پوٹلی دیکھنے گیا۔ میری آنکھیں شپٹا گئیں۔ چولہے کے پاس واقعی اس طرح گڑھا کھدا ہوا تھا گویا کسی نے گڈے کی مانند کوئی پوٹلی سی

وہاں سے نکال لی ہو۔ وہ سارا بیان حال جسے میں صرف وہم سمجھتا رہا تھا...... ایک حقیقت تھا؟ کیا امی ابو...... ساحرہ کے خوف سے ہی مر گئے؟ میرے وجود کی رگ رگ سے خاموش دھاڑیں سنائی دینے لگیں تو میں نے خود کو ماں کے نئے انکشاف میں ضم کرنے کی کوشش کی کہ "میں تو ان کا بیٹا ہی نہیں تھا پھر مجھے اس جہنم میں کیوں سلگایا گیا۔ میں تو خود ایک جرم تھا...... ماں باپ کے جرم کا بے یقین راز......"

"کیا مطلب ہے؟" ریحانہ نے حیرت سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا۔

"ماں بہت بیمار تھی بچے کی پیدائش کے وقت انہیں ہسپتال لے جایا گیا تو انہوں نے مردہ بچے کو جنم دیا۔ ماں کے بقول انکی حالت بہت زیادہ خراب تھی۔ ڈاکٹرز نے ذہنی سکون کی خاطر ان کی گود میں ایک بچہ رکھ دیا۔ اور اس خاتون کو جو میری ماں تھی مردہ بچہ تھما دیا۔ شاید اس ماں میں یہ صدمہ سہنے کی زیادہ طاقت تھی کہ جسے وہ نو ماہ پیٹ میں لئے پھرتی رہی اس کے سامنے ایک سانس بھی نہیں لے گا۔ یا پھر ایک پٹواری نے اولاد کی خواہش اور بیوی کی خوشی کی خاطر...... سکون کا سودا کر لیا۔ کچھ تو تھا۔ ابو کو تو سب پتہ تھا انہوں نے ماں کو بہت دیر بعد بتایا۔ تب وہ ممتا مجھ پہ اتنی شدت سے نچھاور کر چکی تھیں کہ ان کے دل میں اپنے مردہ بچے کا ذرا خیال نہ آیا۔ شائد امی ابو کی بے چین زندگی کی وجہ یہی دھوکہ تھا......

پھر میں نے ابو کو بہت سمجھایا کہ یہ اوپر والی آمدنی چھوڑ دیں۔ مگر دولت کا نشہ انسان سے سوچنے کی سکت چھین لیتا ہے۔ خود کو مر گئے اور مجھے اندھیر نگری میں بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ گویا کسی ماں کا بھی نہ رہا۔ رات بھر سو نہیں سکتا میں...... دل کرتا ہے بی بی ساحرہ کو جہنم رسید کر آؤں ابھی...... اسی وقت......!!!"

ریحانہ اس کی طرف دیکھتی رہی قدرے نرم لہجے میں بولی۔

"آج کیوں اس کی یاد آ گئی...... تم تو کبھی گاؤں بھی نہیں گئے؟"

پرانا دوست ملا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے ہمسایے میں اس بدبخت کے فتنے سے لڑائی ہوئی۔ دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی جان کے درپے ہو گئے۔ بیوی نے زہر کھا لیا اور میاں کو کھیتوں میں سانپ نے ڈس لیا۔ گاؤں کی گلیوں میں ننگے پھرنے والوں میں پانچ بچوں کا اضافہ ہو گیا۔ بے چارے...... ان کی بے بسی پر ترس آ رہا ہے" عباس نے نظریں جھکائیں۔

"ہاں عباس! ماں باپ کے کئے کی سزا اکثر بچوں کو بھگتنا پڑتی ہے۔ گاؤں میں تو ساحرہ کے سحر پر اندھا یقین ہونے کی وجہ سے بے چینی تھی یہاں کیا ہے؟ رات بھر تم گھر نہیں آتے ہو۔ مجھ سے غم کہہ دیا کرو۔ زندگی میں شریک کر لیا تو درد تنہا کیوں سہتے ہو۔ یہ سب لوگ جو تمہارے ادھر ادھر ہیں انہیں کیوں روندتے ہو؟ اپنی بے حسی سے انہیں بھی گنوا لو گے۔ زندگی کی خوبصورت تصویر پر بھی دیکھو عباس۔" ریحانہ نے نرمی سے کہا تو وہ غصے سے بولا۔

"گھن آتی ہے مجھے اس کی بدنمائی سے۔ سوائے داغوں کے اس کے چہرے میں اور ہے ہی کیا۔"

''داغ تو چاند میں بھی ہیں یار! اس کے چہرے کو کبھی کسی نے بدنما نہیں کہا۔ ویسے بھی رات اور دن تو زندگی کا خاصہ ہیں۔ غم نہ ملیں تو خوشی کا احساس کیسے ممکن ہو؟ زندگی سے جتنا بھاگو گے یہ تمہارے پیچھے اتنی ہی تیزی سے آئے گی۔ گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کو پیار سے بلاؤ تو سہی تمہارے پکے دوست بن جائیں گے۔

تم کوئی مجرم تو نہیں ہو پھر رات کے پچھلے پہر چور دروازے سے گھر آنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے تم پر اعتماد ہے۔ تم رات کے کسی بھی پل گھر آؤ مجھے کبھی شک نہیں گزرے گا۔ جتنا لوگوں کے قریب جاؤ اتنا ہی وہ تمہیں چاہیں گے۔ پیار کی وادی میں جو ایک بار قدم رکھ لے لذت شیرینی اسے کسی الجھن کی کڑواہٹ کا احساس نہیں ہونے دیتی۔ کوئی لاکھ برا ہو اپنے حصے کا پیار رکھتا ہے۔ اب یہ اس پر ہے کہ اسے پائے یا نہ پاسکے۔

عباس! تم سب کی زندگی اتنی تلخ رہی۔ سب کو ساحرہ خاتون کا تو ڈر رہا مگر نیلی چھت والے کا خوف گھر سے جاتا رہا۔ گھر میں موجود پنوار خانے میں روپوں سے بھرے تھیلے کسی کام نہ آئے کہ ان سے زندگی کا گھڑی دو گھڑی سکون خریدا جاسکے۔ کسی کا بچہ چرانے کی معافی تو ہوسکتا ہے مل گئی ہو۔ مگر خدا کی حکم عدولی سے ہر روز گھر آنے والے روپوں کے تھیلوں کا حساب کس طرح دیا جاسکے گا اس بات کا احساس دلوں سے اٹھ گیا تو سکون کیسا؟ پھر تمہارے ابو کو یہ بھی اعتراض کہ انہوں نے بہت عبادت کی۔ بہت دعائیں مانگیں جو شائد کہیں راہ ہی میں اٹک گئیں۔

وہ دینے والا ہاتھ دے کے حساب نہیں رکھتا۔ ہمارے مانگنے میں کسر رہ جاتی ہے۔ بعض اوقات انسان کی چھوٹی سی غلطی اسے بہت بڑی سزا دلوا جاتی ہے اور بعض اوقات بڑی بڑی خطائیں معاف ہو جاتی ہیں۔

غلطی، غلطی ہوتی ہے۔ ہمارے لئے اس کی نوعیت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ انکل کے نزدیک ان کی خطا تمہیں تمہاری امی سے جدا کرنا تھی۔ اسی کی معافی کی طلب کرتے رہے مگر ہر روز لقمہ لقمہ رزق میں حرام کی ملاوٹ کا احساس نہ ہوا۔ تمہارا قصور بھی شاید یہی ہے کہ تمہاری تربیت اور نامکمل تعلیم کا اہتمام اسی رزق سے ہوا تھا۔ یہ قصور ایسی خطا نہیں کہ تم ساری زندگی سزا کے احساس میں گزار دو۔ خود کو لوگوں کے قریب لاؤ۔ کوئی کسی کو سزا دینے کا مجاز نہیں ہے۔ یہ ہمارے اعمال ہیں جو سزا کی وجہ بنتے ہیں۔ اور پھر ''ساحرہ'' جیسے لوگ سزا دینے کے لئے وسیلہ بن جاتے ہیں۔ جس نے بظاہر تمہارے والدین کو کچھ نہیں کہا۔ مگر اس کے انجانے خوف نے ان کے اعصاب شل کر دیئے۔''

ریحانہ نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں۔

پھر اگلے دن وہ صبح صبح بچوں کی طرح اس کی انگلی پکڑ کے سائیں سرکار کے دربار...... دلی سکون کے لئے لے گئی۔ دربار پر حاضری سے اسے طمانیت کا احساس ہوا۔ واپسی پر وہ بار بار بڑبڑاتا رہا۔ ''واقعی...... دل سکون میں ہے۔'' اس کے ذہن میں دربار کے نقش بیٹھ گئے۔ اسے واقعی ٹھنڈک ملی۔ چند ہی دنوں بعد اس نے گاؤں کے سیٹھ سے مل کر مدرسے کی تعمیر شروع کروائی۔ قرآن پاک کی تعلیم کا انتظام کیا...... ذکر پاک کی برکات

کہ مصیبت ٹل گئی!!!

''Not Out''

ریحانہ نے دروازے سے جھانک کر دیکھا وہ بچوں کی ننھی سی کرکٹ ٹیم کے اہم میچ میں ایمپائرنگ کے فرائض سنبھالے ہوئے تھا۔

ریحانہ کو ایک دم دل میں ٹھنڈک اور ''سکون'' کی لہر اٹھنے کا احساس ہوا۔

محمد اسلم گورداسپوری

اس شہر میں جینے کا مزہ اب نہیں آتا
بے روح سا ماحول ہے دل خوف سے کھاتا

بے وجہ سرِ دار تو کوئی نہیں جاتا
کچھ بات تو ہوتی ہے اناالحق کی طرح کی

اے کاش کبھی اس میں مسیحا کوئی آتا
اس قوم کو مرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی

ٹوٹا ہے وہی پیڑ کہ جو خم نہیں کھاتا
جھک جانے سے طوفان میں بچ جاتی ہیں شاخیں

یوں ظلم ستم ہم میں کبھی راہ نہ پاتا
ہم لوگ اگر جبر کو تسلیم نہ کرتے

یوں عرصہ شب ہم پہ تسلط نہ جماتا
ہم لوگ اگر خوگر ظلمات نہ ہوتے

رہبر کوئی ہوتا تو ہمیں راہ دکھاتا
سب قافلہ سالار ہی رہزن تھے ہمارے

ویران ہوئی جاتی ہے نگری تری داتا
سنسان ہوا جاتا ہے یہ شہرِ دل آویز

کس کس کو میرا ذوقِ نظر ڈھونڈنے جاتا
شبنم کو کہ پھولوں کو کہ خوشبو کو ہوا کو

کیا کام کروں کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا
رہتا ہوں پریشان میں کچھ کرنے کی دھن میں

لوگوں کو تو کرنے کے بہت کام ہیں اسلم
ہم کو تو محبت کے سوا کچھ نہیں آتا

طارق نعیم

ساری ترتیب زمانی مری دیکھی ہوئی ہے
ایک تصویر پرانی مری دیکھی ہوئی ہے

ذرے ذرے کو بتاتا پھروں کیا بحر تھا میں
ریگِ صحرا نے روانی مری دیکھی ہوئی ہے

یہ جو ہستی ہے کبھی خواب ہوا کرتی تھی
خواب کی نقل مکانی مری دیکھی ہوئی ہے

اک زمانے میں تو میں لفظ ہوا کرتا تھا
تنگیِ جوئے معانی مری دیکھی ہوئی ہے

دل کے بازار میں کیا سود و زیاں ہوتا تھا
اس کی ارزانی گرانی مری دیکھی ہوئی ہے

یوں ہی تو کنجِ قناعت میں نہیں آیا ہوں
خسروی شاہِ جہانی مری دیکھی ہوئی ہے

تم جو سنتے ہو چراغوں کی زبانی تو سنو
شب کی ہر ایک کہانی مری دیکھی ہوئی ہے

میں ترے وصل کے گرداب میں آنے کا نہیں
اس کی ہر موج پرانی مری دیکھی ہوئی ہے

کرنل (ر) سید مقبول حسین

اپنے آئینے سے ہر عکس کو باہر کر کے
خود بھی پتھر کا ہوا وہ مجھے پتھر کر کے

اس کو معلوم بھی کیا اشک کی قیمت کیا ہے
جس نے دیکھا نہیں قطرے کو سمندر کر کے

میرا اس اجنبی ماحول میں دم گھٹتا ہے
کس جگہ چھوڑ گئے ہو مجھے بے گھر کر کے

سر اٹھانے کی مجھے اس نے اجازت دی ہے
شہر کے سنگ مرے سر کا مقدر کر کے

وہ تری یاد کا دکھ ہو کہ غمِ دنیا ہو
ہم نے ہر چیز کو رکھا ہے برابر کر کے

کرنل (ر) سید مقبول حسین

اندھیرا رنگ بدلتا دکھائی دیتا ہے
کوئی چراغ سا جلتا دکھائی دیتا ہے

تو آفتاب نہیں ہے مگر تجھے چھو کر
تمام جسم پگھلتا دکھائی دیتا ہے

تمام شہر کسی سحر کے حصار میں ہے
یہ کون گھر سے نکلتا دکھائی دیتا ہے

زمین ہی کہیں ہموار آ گئی ہو گی
کہ اب وہ پاؤں پہ چلتا دکھائی دیتا ہے

عجیب موسمِ وابستگی ہے کہ مقبولؔ
ہوا سے شہر بدلتا دکھائی دیتا ہے

گفتارِ خیالی

اپنی جس وقت بھی انا جاگی
گویا اک تازہ کربلا جاگی

جاگی اک آہ نارسا جاگی
غم کے ظلمات میں دعا جاگی

جانے کیا سوچ کے بہاروں میں
وحشتوں کی نئی ادا جاگی

جب کھلے پھول تیری یادوں کے
دل کے صحرا میں صبا جاگی

خشک سالی جو ذہن پر برسی
پھر کہیں سوچ کی گھٹا جاگی

خامشی بھی تو اک تکلم ہے
خامشی میں بھی اک صدا جاگی

جب وفا کا سفر ہوا درپیش
راستوں میں نئی بلا جاگی

رتجگے سو گئے خیالوں کے
پھر تری یاد کی صدا جاگی

ہاتھ میں تو چراغ تھا لیکن
تیرگی بھی تو زیرِ پا جاگی

تھا سمندر سکوت میں ڈوبا
لے کے طغیانیاں ہوا جاگی

سیل جس دم گزر گیا گفتارؔ
پھر کہیں خلقتِ خدا جاگی

*

شہاب صفدر

یہیں کہیں کھلا تھا وہ، یہیں کہیں ملا تھا وہ
وصال رُت کا خواب تھا کہ موسم وفا تھا وہ

کھلی ہوئی ہیں کھڑکیاں، سجی ہوئی ہیں بستیاں
نہ جانے رہ گیا کہاں، امید کا دیا تھا وہ

خمار تھا بہار تھا طلب تھا انتظار تھا
ستم شعار ساعتوں میں پیار کی ادا تھا وہ

مشیتوں کے فیصلے تمام اس کے حق میں تھے
نگاہ لطف و مہر تھا، دعا تھا وہ عطا تھا وہ

کھڑی ہوئی ہیں حیرتیں لبوں پہ رکھ کے انگلیاں
گیا طلسم ٹوٹ جس سے اسم جانے کیا تھا وہ

کہاں کہاں کے پنچھیوں کا دائرہ تھا اس کے گرد
محبتوں کا لحن تھا، خلوص کی صدا تھا وہ

خدا گواہ اس کا لفظ لفظ دل پہ نقش ہے
شہاب گرچہ اجنبی زباں میں بولتا تھا وہ

(نذر قائد)

٭

شہاب صفدر

بچھڑ جانے کی موسم کی نشانی پاس رکھنا
نہ رہنا خود جواں عکسِ جوانی پاس رکھنا

کسی بے مہر کی نامہربانی جب رُلائے
مرے یارو تم اپنی مہربانی پاس رکھنا

بہت لمبا سفر ہے ہجرتوں کے دشت و در کا
لگے گی پیاس شدت کی سو پانی پاس رکھنا

مجھے تو بچپنے کی عادتوں نے مار ڈالا
نہ آیا جھوٹ کا مجھ کو زبانی، پاس رکھنا

وگرنہ فکر کے مرکز سے کٹ جائے گا رشتہ
نئی سوچیں لٹا دینا، پرانی پاس رکھنا

شہابؔ آخر نہ چھوڑے گا تجھے لائق سفر کے
سدا اک سنگِ احساسِ گرانی پاس رکھنا

٭

طاہر شیرازی

یہ کوئی مصلحت ہے یا عنایت ہونے والی ہے
بنائے دشت، دریا کی شفاعت ہونے والی ہے

میں اک در پر کھڑا ہوں اور مجھے دربان کہتا ہے
سنو، اندر چلے جاؤ تلاوت ہونے والی ہے

دیئے کے جلنے اور بجھنے کا منظر ایک جیسا ہے
یہ اس انداز میں کس کی حمایت ہونے والی ہے

جو صدیوں سے کسی اک آئنے کے بھید میں گم تھا
اسے اک عمر بعد اپنی زیارت ہونے والی ہے

طوافِ ریگِ صحرا میں ہوا مشغول ہے طاہرؔ
رقم اک پیاس کے بارے میں آیت ہونے والی ہے

٭

طاہر شیرازی

ورائے گفتگو مفہوم آتے تھے
دعائیں اوڑھ کر معصوم آتے تھے

بہت پہلے بہت سی برکتیں لے کر
ہمارے گاؤں میں مخدوم آتے تھے

یونہی آوارگی میں کچھ
پرندے ساری دنیا گھوم آتے تھے

کبوتر جس جگہ دن رات رہتے تھے
ہم ان قبروں کو جا کر چوم آتے تھے

وہ دن بھی تھے کہ جب اپنی حویلی میں
پرندوں کی طرح مقسوم آتے تھے

٭

پروفیسر صدیق علی مرزا

نظر سے ملنا نظر کا تو حادثاتی تھا
مگر یہ دل سے لپٹ جانا معجزاتی تھا

تو ناگہاں ہی ملا تھا مگر میں ہجر زدہ
سمجھ رہا ہوں ترا ملنا اتفاقی تھا

دیارِ شب میں بھی سورج تلاش کرتا تھا
مجھے قبول کہ یہ میرا فعل ذاتی تھا

رہا اٹھاتا میں تعمیر سنگ و آہن کی
پہ امتیاز مرا اپنا بے ثباتی تھا

میں سوچتا تھا کہ شاہد فقط مجھی تک ہے
غمِ فراق کو دیکھا تو کائناتی تھا

٭

پروفیسر صدیق علی مرزا

کھلے گلاب تو کچھ لوگ یاد آنے لگے
جنہیں بھلانے میں ہم کو کئی زمانے لگے

ابھارتا رہوں چہرہ ترا تصور میں
کہ تیرگیِ شبِ غم کی کہیں ٹھکانے لگے

ہے وہ بھی شخص کہ جب اس کی بزم میں بیٹھوں
تو قربِ ہجر کا احساس مجھ پہ چھانے لگے

مجھے ستا لے فلک، پر نہ میرے بچوں کو
کوئی بھی تیرِ ستم کا کسی بہانے لگے

بہت گیا ہے سفر رایگاں تری جانب
کبھی یہ کہہ کے تمنا مجھے ڈرانے لگے

کچھ ایسا حسن نہیں ہے مگر جب آتا ہے
نشہ سا بن کے مری روح میں سمانے لگے

سزا جزا کا ہے اب اس کا فیصلہ شاہد
ہم اپنے جرم کو تسلیم کر کے جانے لگے

٭

پروفیسر صدیق علی مرزا

نویدِ یومِ بہاراں فسردگی کو دی — ہوا نے دل سے اذیت فراق کی دھو دی
اڑائے پھرتی ہے سرشاریٔ بہار مجھے — حصارِ جسم میں رنگوں نے تازگی بو دی
بجھا بجھا سا تھا کب کا خیال کا سورج — تمہارے شعلۂ عارض نے روشنی تو دی
تمہاری باہوں میں آ کر یہ اپنا حال ہوا — کہ دل پہ لکھی عبارت ملال کی دھو دی
میں کچھ تو تھا ترا، لیکن بگاڑ کر تو نے — تعلقاتِ محبت کی آبرو کھو دی!

گلوں میں قحطِ سماعت عذاب ہے شاہدؔ
سنی نہ بات تو شبنم بھی آخرش رو دی

پروفیسر صدیق علی مرزا

بگڑنے بننے کا اک سلسلہ بھی رکھتا ہے — قریب ہو کے وہ اک فاصلہ بھی رکھتا ہے
تڑپ کے ملتا ہے دم بھر میں چھوڑ جانے کو — یہ دل کہ شاد ہے، اس سے گلہ بھی رکھتا ہے
بند آنکھ کر کے مت اس کے کہے پہ صاد کرو — وہ جھوٹ سچ کو بہم کچھ ملا بھی رکھتا ہے
رہائی اس کی بہت دور ہے مرے نزدیک — بیانِ دعویٰ ابھی تکملہ بھی رکھتا ہے

شفق کے پھول کھلے، اوس کی پھوار چلی
تڑپنا راتوں کا شاہدؔ صلہ بھی رکھتا ہے

اکرام تبسم

ہمیں اس عشق پہ اپنے غرور ہی کب تھا — کہ دل کو حسن کا اتنا شعور ہی کب تھا

ملے ہو تم تو کھلا زندگی حسیں شے ہے — وگرنہ جذبہ دل میں وفور ہی کب تھا

خیال و خواب مری چاہتوں کا سرمایہ — میں اس جہان سے پہلے بھی ... کب تھا

جو دیکھ لیتے ہیں اب آنکھ بھر کے ہم اس کو — سو ان نگاہوں پہ ہم کو عبور ہی کب تھا

اندھیری رات جدائی کا غم یہ تنہائی — سب فراق تیرے رخ پہ نور ہی کب تھا

ملا ہے اس کی محبت میں جو تبسم جی
ہماری روح کو ایسا سرور ہی کب تھا

✻

اکرام تبسم

ہو پائے نہ تھے ختم ابھی رات کے صدمے — لے بیٹھے ہمیں دن کے فسادات کے صدمے

ہر شخص کو اس دور میں ہے فکر بس اپنی — بانٹے گا یہاں کون تری ذات کے صدمے

کس کس کو سنائیں گے محبت کی کہانی — کچھ جیت کے صدمے ہیں تو کچھ مات کے صدمے

اظہار پہ افکار پہ تکرار پہ قدغن — ہم کس کو سنائیں شب ظلمات کے صدمے

اے راہبرو! زہرہ ورو قصر نشینو! — محسوس کرو کچے مکانات کے صدمے

✻

غضنفر عباس سید

زادِ سفر چراغ تھا، صحرا لباس تھا
تیری طلب ہی تو میرا سچا لباس تھا

اترا جو زینہ ہائے شب بے چراغ سے
اس جسم پر سحر کا دمکتا لباس تھا

لحظہ بہ لحظہ رنگ بدلتے جہان میں
چہرہ بہ چہرہ ایک انوکھا لباس تھا

موسم کے جذر و مد سے گزرنا پڑا انہیں
جن شاخوں پہ سبزہ و گل کا لباس تھا

اور پھر سراغ بھی نہ ملا جن کے جسم پر
اجداد کے غرور کا ورثہ لباس تھا

احساس نے بنا تھا جو پیراہنِ خیال
عالم میں اپنی طرز کا یکتا لباس تھا

واجب ہے اس لئے بھی بہاروں کا احترام
سبزہ مرے وجود کا پہلا لباس تھا

عباسؔ کیا یہ کم ہے سرکارِ زارِ زیست
ہم کشتگانِ شب کا سنہرا لباس تھا

محمد آصف مرزا

جو ہے آساں، اسے دشوار کرتے جا رہے ہیں
ہم آپس میں بہت تکرار کرتے جا رہے ہیں
نئے شہروں کو ہم آباد کرنے سے بھی پہلے
پرانی بستیاں، مسمار کرتے جا رہے ہیں
چھپاتے ہیں، جیسے ہم کو بتانا چاہئے تھا
جو ہے ناگفتنی، اظہار کرتے جا رہے ہیں
بدن سامانِ دنیا کی پرستش میں مگن ہے
بہت ہم روح کو، نادار کرتے جا رہے ہیں
عمل سے دست کش ہیں اور ادھر نعرہ زنی سے
عدو کو اور بھی ہشیار کرتے جا رہے ہیں
نہیں دریوزگاں میں تابع فرمان ہم سا
تری ہر بات کا اقرار کرتے جا رہے ہیں
کبھی گریہ سے اس کی آبیاری ہی نہیں کی
زمینِ عشق کو، بیکار کرتے جا رہے ہیں

*

محمد آصف مرزا

ہم نے انجام کو آغازِ سفر پر رکھا
گھر سے نکلے ہیں تو اسباب کو گھر پر رکھا
کام جو فرصت اول میں کیا جانا تھا
''ہم نے موقوف، اسے وقتِ دگر[1] پر رکھا''
کیسا اندھیر ہوا، شب کے پرستاروں نے
خوں اجالے کا کیا، دوش سحر پر رکھا
دیکھنا اہل سیادت کی ستم رانی کو
بوجھ جتنا تھا، اٹھا کر مرے سر پر رکھا
دھوپ سے چھاؤں کسی طور نہ مغلوب ہوئی
زور سورج نے بہت اپنا شجر پر رکھا
داغ فرقت رہا سرسبز تری یادوں سے
یہ وہ مرہم تھا، جسے زخمِ جگر پر رکھا
کچھ نہ رکھتے تھے، مگر نذر گزاری کے لئے
دل بچا تھا، سو ترے ذوقِ نظر پر رکھا

*

۱۔ مصحفی

انیلہ چشتی

درد سینے میں ہو، آنکھوں سے عیاں ہوتا ہے — پیار تو دل میں کہیں دور نہاں ہوتا ہے
لوگ یہ پوچھتے ہیں عشق کہاں ہوتا ہے — جہاں ہوتا ہے جنوں عشق وہاں ہوتا ہے
چاہنے والوں کی دنیا میں قدم دیکھ کے رکھ — یہ جہاں موقع پرستوں کا کہاں ہوتا ہے
کتنے نازک ہیں یہ دل والے مگر دیکھو تو — انہی لوگوں پر سدا ظلم یہاں ہوتا ہے
آئینے کی طرح نظر آتی ہے دنیا مجھ کو — اب تو ہر شخص پر اپنا ہی گماں ہوتا ہے

٭

سحر اقبال

سر سلامت رہے تو بات بہت — نظم کرنے کو کائنات بہت
گھٹ رہے ہیں بقا کے امکانات — بڑھ رہے ہیں جو حادثات بہت
گھر بسانے کے سینکڑوں پہلو — گھر اجڑنے کو ایک بات بہت
کیسے اس سمت چاند آ نکلا — چاندنی صحن میں تھی رات بہت
روشنی کا سراغ پانے کو — ہجر کی صرف ایک رات بہت
دو قدم کون ساتھ چلتا ہے — دو قدم کا بھی اب ہے ساتھ بہت
عشق آباد میں سحر اقبال
بے سر و پا ہیں واقعات بہت

٭

عطاء الحق قاسمی

کسی کی آنکھ پہ کچھ ایسا اعتبار کیا
تمام عمر سرِ راہ انتظار کیا

بھلایا میں نے اسے اس کے یاد کرنے تک
کیا جو یاد تو میں نے بھی بے شمار کیا

مرا غزال زمانے میں بے مثال کہاں
کہ اپنا سامنا خود اس نے بار بار کیا

خدا نہ کردہ کہیں سے خبر کسی کو ملے
دوائے دل کی جگہ اس نے دل فگار کیا

عجب تھا حال میرا اور بجھا بجھا تھا یہ دل
مری خزاں کو یہ کس پھول نے بہار کیا

ہو سامنے تو سخن سازیاں کہاں صاحب
گیا تو ہم نے سخن ہائے صد ہزار کیا

ہوا کے دوش پہ سنتا ہوں آہٹیں اس کی
ان آہٹوں نے ہواؤں کو مشکبار کیا

بدن کے بھید کبھی رہزنی کو کھول دیے
پھر اس نے راہبروں میں مجھے شمار کیا

خود اس نے بڑھ کے عطاؔ ہاتھ میرے چوم لئے
گناہ گار پہ یوں اس نے اعتبار کیا

☆

نبیل احمد نبیل

کشید ہجر سے کیف وصال ہم نے کیا
ترے فراق میں کیسا کمال ہم نے کیا

عجب نہیں ہے کہ تیرا خیال ہم نے کیا
کبھی خوشی، کبھی رنج و ملال ہم نے کیا

سکھا دیا ہے تمہیں، ہم نے دلدہی کا ہنر
دعائیں دو کہ تمہیں خوش خصال ہم نے کیا

زمیں سے بھوک اُگے گی عذاب کی صورت
اگر تلاش نہ رزقِ حلال ہم نے کیا

عجیب طرح کا کشکول ہے کہ بھرتا نہیں
دراز کیسا یہ دستِ سوال ہم نے کیا

محبتوں کا ازل سے دلوں میں تھا مسکن
محبتوں کو مگر لازوال ہم نے کیا

ترے وصال کی خواہش دل و نظر سے کی
کبھی نہیں کوئی تجھ سے سوال ہم نے کیا

وہ چاند تھا تو نہیں پھر بھی چاند جیسا لگا
محبتوں سے اسے بے مثال ہم نے کیا

اگرچہ رنج محبت نے بے شمار دیئے
نبیلؔ ان کا مگر کب ملال ہم نے کیا

راجا تیرؔ

وسعتِ بے نشاں سے آگے ہے
اک نشاں آسماں سے آگے ہے

اس ہنر کا بھی کچھ پتا دے دے
جو ہمارے بیاں سے آگے ہے

کہکشاں تک تو دیکھ لیتا ہوں
اور جو کہکشاں سے آگے ہے

وہ کہانی بھی کھول دے مجھ پر!
جو مری داستاں سے آگے ہے

جذبۂ شوق رہ نما میرا!
سو مرے کارواں سے آگے ہے

لاؤں کیا حرفِ مدعا لب پر
میرے وہم و گماں سے آگے ہے

جس کو تکمیلِ فن کہیں تیرؔ
خواہشوں کے جہاں سے آگے ہے

یادوں میں ایک شخص----انوار احمد

اصغر ندیم سید

دنیا میں اگر کوئی ایک شخص ایسا ہے جو میری زندگی کے ہر راز سے واقف ہے تو وہ انوار احمد ہے۔ لیکن میں اس کی زندگی کے ہر راز سے واقف نہیں ہوں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ مجھے اپنے سارے راز دینا نہیں چاہتا۔ وجہ صرف اتنی ہے کہ اس کے کچھ رازوں کی نوعیت ایسی ہے کہ دیئے نہیں جا سکتے۔ یہ بات مجھے خالد سعید نے بتائی ہے کہ آج کل انوار احمد مجھ سے کچھ چھپانے لگا ہے۔ اور یہ بھی خالد سعید نے ہی بتایا ہے کہ آج کل اس پر بھروسہ نہ کرنا۔ اس کے ہاتھ کسی خاتون کو کوئی پیغام نہ بھیجنا ورنہ اس مصرع کا مطلب واضح ہو جائے گا۔

ع بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

لیکن جس انوار احمد کو جانتا ہوں وہ تو کچھ اور ہے۔ یہ وہ انوار احمد نہیں جسے ملتان کے کچھ چنگلے بازوں نے چبھتے ہوئے کرارے جملے تخلیق کرنے پر لگا رکھا ہے۔ اور وہ بھی معصومیت سے ان کی داد سمیٹنے کے لئے بے تاب رہتا ہے۔ نہ ہی یہ وہ انوار احمد ہے جسے ملتان ڈویژن کے ٹریڈ یونین اور اساتذہ کی تنظیموں کے ماہر جغادری پنجہ باز اپنا مرشد مانتے ہیں۔ نہ ہی یہ وہ انوار احمد ہے جسے یونیورسٹیوں کی سیاست کے شائقین اپنا گرو مانتے ہیں۔ بھلا ہو بہاؤ الدین یونیورسٹی کے وائس چانسلر چوہدری غلام مصطفیٰ کا جس نے اس کے جوہر کو پہچانا اور ایک عظیم درس گاہ کی علمی روایت کو پروان چڑھانے کے لئے اس کی صلاحیتوں سے کام لینا شروع کیا ہے۔

ایک زمانہ تھا جب ڈاکٹر خواجہ زکریا انوار احمد کو پنجاب یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر کے لئے لے جانے پر بضد تھے۔ میری رائے یہی تھی کہ انوار فوراً لاہور آ جائے اور بہت سوں کے چراغ گل کر دے۔ ساتھ ہی وہ اپنا وہ بدلہ بھی لے لے جب مبینہ طور پر ایم اے اردو کے نتائج میں رد و بدل کر کے اس کی جگہ ڈاکٹر سعادت سعید کو اول کرا دیا گیا تھا۔ اس لئے کہ اس وقت انوار احمد نامی طالب علم کو یونیورسٹی کے بعض سیاست باز معلمین نہیں جانتے تھے۔ آج مجھے انوار احمد کا فیصلہ درست لگ رہا ہے۔ کہ اس کی اس خطے کو بہت ضرورت ہے۔ اس نے اس عرصے میں علم و دانش اور فکر و فن کی جو روایات قائم کی ہیں وہ ملتان کی تاریخ کے شایان شان ہیں۔ دنیا کے ہر حصے میں اس کے شاگرد مجھے مل جاتے ہیں۔ اور وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ میرا انوار سے کیا رشتہ ہے۔ اس

حوالے سے وہ خود کو میرا شاگرد ظاہر کرتے ہیں۔ برصغیر کے علمی وادبی حلقوں میں اس کا جو رعب و دبدبہ قائم ہے۔ اس کی وجہ صرف اس کا علم نہیں ہے دوسروں کی علمی کم مائیگی کو بھی دخل ہے۔ اس نے بڑے بڑوں کی علمی بد دیانتیاں اور چوریاں پکڑی ہوئی ہیں۔ میڈیا اور اخباروں نے جن جعلی ڈاکٹروں اور ان کے بیگ بردار شاگردوں کو مشہور کر دیا ہے۔ وہ انوار احمد کے نام سے کانپتے ہیں۔ لیکن میرا انوار احمد تو یہ بھی نہیں ہے۔ وہ تو کوئی اور ہے۔ شاید وہ ہے جس سے استاد ڈرتے تھے۔ اور لیکچر دینے سے پہلے لائبریریوں کے چکر لگا کر آتے تھے۔ پھر بھی انہیں انوار احمد کے کسی نہ کسی جملے کا بوجھ اٹھانا پڑ جاتا تھا۔ ان جملوں کا کفارا اس نے اس طرح ادا کیا کہ ان اساتذہ کے جوتے تک سیدھے کئے۔ اور ایسی دعائیں لیں کہ آج اس کا نام لیتے ہوئے اس کے شاگردوں کے چہرے تمتما اٹھتے ہیں اور آنکھوں میں نمی اتر آتی ہے۔

انوار کا اور میرا دکھ بہت حد تک ایک سا ہے۔ اس کے سر سے باپ کا سایہ اس وقت اٹھ گیا جب اسے اس کی سخت ضرورت تھی اور میرے ہاتھ سے فرزانہ کا ہاتھ اس وقت چھوٹ گیا جب مجھے اس کی شدید ضرورت تھی۔ جس طرح اس نے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو سہارا دیا ایسے ہی میں آزمائش سے گزر رہا ہوں۔ حس ظرافت کے پیچھے کیسے کیسے دکھ ہوتے ہیں اس کا اندازہ ہم دونوں کو ہے۔ اسی لئے شاید کسی نے کہا تھا کہ ہر ذہین اور خوشی بکھیرنے والے جملے کے پیچھے کوئی بڑا دکھ جھانک رہا ہوتا ہے۔ انوار نے مجھے ایم اے کے دوران بتایا کہ یار اچھا ہوا میرا باپ پہلے فوت ہو گیا۔ ورنہ وہ تو مجھے حساب پڑھانا چاہتا تھا۔ پھر میرا کیا ہوتا۔ اگر ایم اے انگریزی کی کلاسیں ملتان میں ہوتیں تو انوار اس وقت کسی جگہ کم سے کم کمشنر ہوتا۔ اس نے وظیفوں سے پڑھنا تھا۔ اور وظیفہ لاہور کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ لیکن اچھا ہی ہوا وہ کمشنر نہیں بن سکا۔ بے حد ناکام قسم کا بیوروکریٹ ہوتا۔ میں جس انوار کو جانتا ہوں وہ اور ہے۔ اس نے جب میرا رشتہ میرے والد مرحوم سے دیکھا تو محسوس کیا کہ ایک انوار احمد تو بچ گیا ہے دوسرے انوار احمد کو بچانا ہوگا۔ چنانچہ اس نے میرے والد مرحوم سے دوستی کر لی۔ جنہیں سب بڑے شاہ جی کہتے تھے۔ بڑے شاہ جی کو ایک دوست کی اشد ضرورت تھی۔ جو رشتہ ان کا بیٹے سے نہ بن سکا وہ انوار احمد سے بنا۔ اور بعد میں فیاض تحسین سے بنا اور آخر میں ہمارے کالج فیلو افضل گردیزی سے بنا جو حبیب بینک کا زونل چیف ہے اور جس کے ہاتھوں میں بڑے شاہ جی نے دم دیا۔ سو میری پراکسی بولنے والے بہت تھے۔ اس لئے میں والد کی خدمت کے حق سے سبکدوش ہو گیا تھا۔ کیا واقعی میں سبکدوش ہو گیا۔ اس کا جواب پھر کبھی سہی۔ جب کبھی بڑے شاہ جی سے کوئی کام ہوتا انوار احمد کو آگے کر دیا جاتا تھا اور وہ کام ہو جاتا تھا۔

انوار احمد میرے بابا میں اپنے والد کی گرمی تلاش کر رہے تھے یا کیا تھا۔ یہ ہم نہیں سمجھ سکے۔ انوار احمد نے مجھے کہاں کہاں نہیں بچایا۔ سب سے پہلے اس نے مجھے ایک قاتلانہ حملے سے بچایا۔ پاکستان کی تاریخ میں کسی کالم نویس پر یہ پہلا اور آخری قاتلانہ حملہ تھا۔ جب میرے ایک کالم سے میرے دوست خورشید خان کو ٹھیس پہنچی تو نواں شہر کی انڈر ورلڈ ایک لمحے میں متحرک ہو گئی۔ انوار احمد کو جب پتہ چلا کہ شمشیر بٹ پستول لے کر میرے گھر

روانہ ہو چکا ہے تو وہ فخر بلوچ کے ساتھ بھاگ کر پہنچا۔ شمشیر بٹ انوار کے سامنے اپنی شمشیر برہنہ کو نہ سنبھال سکا۔ اور اس نے سرنڈر کر دیا۔ میں تو بچ گیا لیکن تیسرے دن نواں شہر کا ایک نوجوان اس کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ شمشیر بٹ فرار ہو کر ہالینڈ پہنچ گیا جہاں وہ دو بیویوں کا شوہر ہے۔ اس کے ساتھ ہی نواں شہر کی انڈر ورلڈ اپنے انجام کو پہنچی۔ میں تو اس انوار احمد کو جانتا ہوں جس کی ہتھیلی پر میری پہلی محبت کا پہلا آنسو گرا تھا۔ اور کچھ عرصہ بعد میری دونوں آنکھوں سے محبت کے دو آنسو گرے تھے۔ ایک کسی کے لئے تھا تو دوسرا کسی کے لئے۔ اس نے دونوں آنسوؤں کی رنگت پہچان لی تھی اور دونوں کے نام بتا دیئے تھے۔ لیکن یہ قصہ پھر سہی۔ میں جس انوار احمد کو جانتا ہوں اسے مسعود اشعر نے بھی استعمال کیا۔ لیکن یہ شاید اس کی مجبوری تھی۔ میاں افتخار الدین اور ظہیر بابر کو سرائیکی بیلٹ میں کسی نہ کسی کو تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے ردل کے لئے وائسرائے بھیجنا تھا۔ یہ قصہ بھی پھر سہی۔ میں جس انوار احمد کو جانتا ہوں وہ میرے ساتھ گرمیوں کی شدید دوپہر میں اپنے سائیکل پر میرے ساتھ مسز صفیہ سید کے کلینک کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ مسز صفیہ سید سے یاد آیا۔ میری یادداشتوں کا ایک باب ان سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر کبھی سہی۔ سو جب ہم دونوں کے سائیکل ادھر سے گزرے تو ایک بچے نے مجھے ہاتھ دیا کہ مجھے بٹھا لو۔ میں نہیں رکا۔ انوار کا سائیکل رک گیا اور اس نے اس بچے کو پیچھے بٹھا لیا۔ اور اسے ڈیرہ اڈا تک لے گیا۔ یہ میرا انوار احمد سے پہلا تعارف تھا۔ اس وقت سے اب تک وہ بچوں کو اپنے سائیکل پر بٹھاتا چلا آ رہا ہے۔ یا پھر میں اس انوار احمد کو جانتا ہوں جس نے اس وقت کے لالہ رؤف اور اس وقت کے نیپال میں پاکستان چیئر کے ڈاکٹر عبدالرؤف کو ازار بند کو اڑسنا سکھایا تھا۔ اور اس کے بدلے میں نئی سبزی منڈی میں اس کے بھائی کی آڑھت کی دکان سے خربوزے اور تربوز حاصل کرنے کا ہنر سکھایا تھا۔ یہ قصہ پھر سہی۔ میں جس انوار احمد کو جانتا ہوں اس نے ایک کو ازار بند اڑھسنا سکھایا تو دوسرے کو ازار بند کھولنا سکھایا۔ لیکن آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں یہ کسی غیر ملکی چینل کا منظر نہیں ہے۔ ہوا یہ تھا کہ صلاح الدین حیدر کی والدہ جو ہم سب کی بے حد محترم خالہ تھیں۔ صلاح الدین حیدر کے اندر جیتی تھیں۔ وہ دس روپے فیس جمع کرانے کے لئے اس کے ازار بند میں باندھ دیتی تھیں جسے انوار احمد گورنمنٹ کالج بوسن روڈ کے اکاؤنٹ آفس کے سامنے کھولتا تھا۔ بعد میں یوں ہوا کہ ہماری خالہ نے اس سسٹم کو improve کر دیا اور دس روپے کا نوٹ بغلی پاکٹ میں ڈال کر اوپر سے اس پاکٹ کو سی دیا۔ اس کے نتیجے اکاؤنٹ آفس کے سامنے کھولنے کی بجائے ایک بار نشاط روڈ خرم گیٹ کی ایک تنگ و تاریک گلی میں ہمیں کھولنے پڑے تھے۔ یہ بات پھر سہی۔ میں جس انوار احمد کو جانتا ہوں اس نے اس وقت کے فخر ایشیا فخر بلوچ کو اتنی بار بچایا کہ اس وقت کی حکومت پریشان ہو گئی کہ تمام ایجنسیاں فخر بلوچ کا سراغ لگانے میں کیوں ناکام ہو گئیں۔ اس وقت کی حکومت اور امروز اخبار طرح طرح کی قیاس آرائیاں لگانے میں مصروف تھے۔ جبکہ مجھے اور انوار احمد کو معلوم تھا کہ فخر ایشیا کہاں چھپا ہوا ہے۔ اور کیا کر رہا ہے۔ فخر ایشیا' خانیوال کے جس گھر میں چھپا ہوا تھا وہاں سے نکاح پڑھا کے باہر آیا۔ اور کچہری روڈ کے تاریخی جلوس سے خطاب کر کے بھوک ہڑتال پہ بیٹھ گیا تھا۔ انوار احمد

میرے پاس بھاگا آیا کہ اب کیا ہوگا۔ چنانچہ رات دو بجے بوہڑگیٹ کے ہیکٹری کبابیئے سے کباب لے کر ہم نے فخر ایشیا کو کھلا دیئے اگلے روز بی بی سی کے نمائندے coverage کے لئے آئے تو فخر ایشیا کو نقاہت کے باعث قے آ گئی۔ جس میں کباب برآمد ہو گئے۔ جس پر بعض بدفطرت اور بدطینت غیرملکی نامہ نگاروں نے فخر ایشیا کی integrity کو چیلنج کر دیا۔ وہاں انوار احمد نے اسے اس طرح بچایا کہ سب کو خطاب کر کے کہا کہ صاحبو یہ کباب یا چانپوں کے ٹکڑے نہیں ہیں یہ فخر ایشیا کے دل وجگر کے ٹکڑے ہیں جو وہ قوم کے لئے قربان کر رہا ہے۔ اس پر غیر ملکی نامہ نگار بہت متاثر ہوئے۔

میں جس انوار احمد کو جانتا ہوں وہ جب ایم اے پاس کر چکا تو اس کا پیپر میرٹ پنجاب میں سب سے اوپر تھا یعنی throughout first class۔ اس کے باوجود اسے ملازمت نہیں مل رہی تھی۔ اس زمانے میں جسارت اخبار ملتان سے امروز کے مقابلے میں جاری ہوا۔ انوار اس کا انٹرویو دینے میرے ساتھ چاہ بوھری والہ پہنچا۔ میں باہر کھڑا رہا۔ جب وہ انٹرویو دے کر باہر آیا تو میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ یار کیا ہوا۔ کہنے لگا۔ کچھ نہیں وہ الطاف حسن قریشی بگا انٹرویو لے رہا تھا۔ تو اس نے پوچھا۔ تم اپنے آپ کو کس طرح ایک صالح مسلمان ثابت کرو گے تو میں نے اسے یہ جواب دیا کہ خود کو مسلمان ثابت کرنے کا ایک طریقہ 1947ء میں اختیار کیا گیا تھا۔ آپ کہیں تو میں اس طریقے سے خود کو مسلمان ثابت کر دوں۔ یہ جواب سن کر الطاف حسن قریشی بگا غصے میں آ گیا اور مجھے باہر نکال دیا۔ میں نے بھولپن سے پوچھا 1947ء میں کون سا طریقہ اختیار کیا گیا تھا تو انوار نے کہا اس کے لئے تمہیں منٹو کے افسانے پڑھنے پڑیں گے۔ اسی طرح جب اسلامیہ کالج خانیوال میں لیکچرر کی آسامی کے لئے مجھے سفارشی بنا کر اس وقت کے اسسٹنٹ کمشنر میر اقبال ندیم کے پاس پہنچا تو میر صاحب نے کہا سفارش تو ٹھیک ہے لیکن ابھی کچھ دیر پہلے صلاح الدین حیدر کے متعلق ہم نے فیصلہ کیا ہے۔ اس پر انوار احمد نے کہا اگر اسے لگا رہے ہیں تو میں ویسے بھی اپنا نام واپس لے لوں گا۔ اسے مجھ سے زیادہ ملازمت کی ضرورت ہے۔ بعد میں صلاح الدین حیدر نے بھوک ہڑتال کر کے خود کو اس کام کا اہل ثابت کر دکھایا یہ قصہ بھی پھر سہی۔ میں اس انوار احمد کو جانتا ہوں جس نے مرحوم محسن نقوی کی بے تاب طبیعت اور شہرت کی للک اور لپک کو دیکھ کر کہا تھا۔ اس کی منزل یا تو امام بارگاہ ہے یا قومی اسمبلی۔ 1975ء میں وہ اسمبلی میں جانے سے رہ گیا لیکن امام بارگاہ پہنچ کے دم لیا۔

بے روزگاری کے اس دور میں خالد شیرازی نے اپنی اور ہم دونوں کی مالی مشکلات کم کرنے کے لئے اہم کردار ادا کیا۔ وہ شہر کی متمول ہم جماعتوں برسرروزگار دوستوں اور اساتذہ کرام سے بیک وقت بھتہ وصول کرتا تھا۔ جو ہم تینوں میں برابر تقسیم ہوتا تھا۔ جو یہ بھتہ دینے سے انکار کرتا تھا۔ شہر میں اس کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا گردش کرنے لگتا تھا۔ مثلاً اسی طرح کہ پروفیسر صفدر امام کے طالب علمی کے زمانے کے نوٹس گم ہو گئے ہیں اس لئے وہ کئی دنوں سے کلاس نہیں لے رہے۔ یا یہ کہ فاروق کن کیا ایڈووکیٹ قریبی کھیت سے کھیرے چراتا ہوا پکڑا

گیا ہے۔ پھر ایک وقت آیا کہ بھتہ نہ دینے والوں نے ہمارا نوٹس لینا چھوڑ دیا۔ خالد شیرازی نے دل برداشتہ ہوکر دوستوں کے گھروں سے چیزیں اڑانا شروع کر دیں۔ پھر کیا تھا۔ اخباروں کی ردی۔ صابن بلیڈ جو ہاتھ لگا لے اڑا۔ آخری بار مجھے اتنا یاد ہے کہ ایک دوست کے گھر سے تانبے کا لوٹا اخبار میں لپیٹ کر لے آیا۔ جسے ہم نے برتنوں کی ایک دکان پر کلو کے حساب سے فروخت کیا۔ اس صورت حال پر قابو پانے کے لئے انوار احمد نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک ماہانہ رسالہ نکالا جائے۔ اس کا نام بادبان رکھا گیا۔ طے پایا کہ سوسالانہ خریدار پیشگی بنا لئے جائیں تو پرچہ نکل سکتا ہے۔ یعنی فلم بنانے سے پہلے ایڈوانس بکنگ شروع کر دی گئی۔ ہمیں بھروسہ تھا کہ ہم کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ میں امروز میں کالم لکھتا تھا۔ انوار احمد کے جملے کا وار سہنے والا مہینوں نہیں اٹھ سکتا تھا اور خالد شیرازی نہ صرف کھلم کھلا جارحیت پر اتر آتا تھا بلکہ شہر کے شاعروں کے کئی راز اس کے پاس تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے ہم نے ان شاعروں کو سالانہ ممبر بنایا جنہیں خالد شیرازی غزلیں لکھ کر دیتا تھا۔ دوسرے نمبر پر ان اساتذہ کے پاس گئے۔ جو انوار احمد کے سوالات سے عاجز آ چکے تھے۔ تیسرے نمبر پر ان ادیبوں کے پاس گئے جو اپنا نام عزت سے کالم میں چھپوانے کے خواہش مند تھے۔ اس لئے ہمیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔ جسٹس ریٹائرڈ شیخ خضر حیات اس وقت جماعت اسلامی کے امیر تھے۔ انہوں نے دوممبر شپ حاصل کرتے ہوئے کہا۔ یہ بیس روپے جو میں تم لوگوں کو دے رہا ہوں یہ بیس روپے نہیں بیس برچھیاں ہیں جو تم ہمارے سینے میں استعمال کرو گے۔ حتیٰ کہ کہ جابر علی سید مرحوم جو تاش کھیلتے وقت مبارک مجوکہ سے پیسے نکلوایا کرتے تھے وہ بھی ممبر بن گئے۔ مرحوم عرش صدیقی کو جب یہ بات پتہ چلی تو وہ بھی غیر مشروط طور پر ممبر بن گئے۔ اس کے بعد سب سے پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ سمارٹ ٹیلرز سے کپڑے سلوائے اور لیڈی رپورٹر کی تلاش شروع کر دی۔ اس مسئلے پر ایڈیٹوریل بورڈ میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے۔ وہ تو اچھا ہوا انوار احمد کو کوئٹہ میں لیکچرر شپ مل گئی۔

اس کے جانے کے بعد مجھے اور خالد شیرازی کو کچھ عرصہ روپوش ہونا پڑا۔ بعد میں یہ کوآپر یٹو سکینڈل میں دب دبا گیا۔ میں جس انوار احمد کو جانتا ہوں ایم اے کے دوران اسے میرے حصے کی کتابیں بھی پڑھنا پڑی تھیں۔ اور جو اس قدر درد مند اور وفا کیش انسان ہے کہ میرے ساتھ میرے تھیسس کے viva کے لئے لاہور اپنی ٹکٹ پر آیا۔ لیکن صبح سویرے یہ کہہ کر راولپنڈی چلا گیا کہ مجھے ایک کام ہے جب شام کو واپس آیا تو اس کی جیب میں نکاح نامہ تھا۔ تب مجھے پتہ چلا اسے کہانی اور کہانی کے بے شمار اسالیب سے دلچسپی کیوں ہے۔ اس کی اپنی زندگی کہانی کے تمام پراسرار بھید رکھتی ہے۔

مجھے کہانی سے انوار نے متعارف کرایا۔ کہانی اتنی جلدی اپنے بھید کسی کو نہیں دیتی۔ اس کے لئے اپنے دکھوں کی فائل کھولنی پڑتی ہے۔ اپنے زخموں کا چڑھاوا چڑھانا پڑتا ہے۔ اسی طرح ڈرامے کا فن بھی اتنی جلدی ہاتھ نہیں آتا کبھی کبھی اپنی انتہائی محبوب ہستی کو انتہائی ڈرامائی انداز سے اللہ کے حوالے کرنا پڑتا ہے۔

نظرِ ثانی

محمد کبیر خان

میرا پڑوسی سرور جھلا عجیب الخصلت شخص تھا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ اپنے دو سالہ بچے کی کسی ادا پر فدا ہوا تو گھر بار اس کے نام کر دیا۔ دوسرے روز اسی ادا پہ خفا ہوا تو معصوم کو جگہ پر عاق کر دیا۔ معاشرتی ضابطوں کا پاس نہ سماجی قدروں کا پاس۔ من چاہا تو ساری رات عبادت میں گزار دی' دل چاہا تو نماز با جماعت کے دوران سجدے سے پہلے مسجد سے نکل میخانے جا بیٹھا۔ اس کی زندگی میں بے قاعدگی کے سوا کچھ بھی نہ تھا لیکن ہمارے نانا مولوی اقبال خان کے ہاں بڑی باقاعدگی کے ساتھ جاتا۔ ہر دو ماہ بعد پہلے جمعہ کی شام کو۔ ''آپ تو جانتے ہیں۔ گنجوں' کانوں اور سیانوں کے علاوہ میرا اگلا ہوں اور کٹھ ملاؤں سے اٹ کتے والا بیر ہے۔ لیکن آپ نرے مولوی نہیں' تھوڑا بہت علم بھی رکھتے ہیں۔ اسی لئے ایک مسئلہ پوچھنے آیا ہوں۔'' سلام دعا کے بکھیڑے میں پڑے بغیر وہ کہتا۔ ''میں ہر مہینے کی پہلی کو گھر والی سے پوچھ لیتا ہوں۔۔ رہنے کی خواہش ہے یا گہنے کی چاہت۔۔؟ اگر گہنے چاہو تو کہنے کی ضرورت نہیں۔ کل میرے گھر لوٹنے سے پہلے پہلے مال بچھڑے' بال بچوں سمیت نکل جانا۔ فارغ خطی شام تک تمہارے میکے پہنچ جائے گی۔ میری طرف سے تم مادر پدر آزاد ہو۔ شرع متین کے مطابق میرا یہ اقدام تجدید وفا و نکاح' وغیرہ جائز ہے کہ نہیں؟'' کھڑے کھڑے جواب لیتا' الٹے قدموں گھر پہنچتا۔ دہلیز سے ہی بیوی کو مژدہ سناتا۔۔ ''جب تک ختم دوست اور خصم دشمن مولوی اس برادری میں زندہ ہے' تمہارا کلا قائم ہے۔ لیکن زیادہ تانگنے کی لوڑ کوئی نہیں۔۔ دو مہینے بعد پھر جاؤں گا۔''

اگرچہ میں بھی ادبی ضابطوں کا زیادہ قائل نہیں لیکن سرور جھلے کی طرح ایک مسئلہ لے کر پیرزادہ عطاء الحق قاسمی عفی عنہ کے پاس پہنچ گیا۔۔ میں زوجہ محترمہ کا خاکہ لکھنا چاہتا ہوں......

''تم چند سال پیشتر بے بی یا بابا کے عنوان سے مرحب قاسمی کا خاکہ لکھ چکے ہو' پھر یہ......؟''

وہ مرحب قاسمی کا تھا۔ اب میں اپنی بیوی کا خاکہ لکھنا چاہتا ہوں۔ کیا فرماتے ہیں علمائے دین بیچ اس مسئلہ کے؟ اس کا مسکت جواب جو مولوی صاحب نے دیا۔ اس کا لب لباب یہ تھا کہ اردو خاکہ نگاری میں ایسی کوئی صحت مند روایت موجود نہیں کہ کسی مستند خاکہ نگار نے ایک شخصیت کے ایک سے زائد خاکے لکھے ہوں۔ تاہم

تمہاری بات دوسری ہے۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ اس کے ساتھ ہی ایک نگاہ غلط انداز میرے چہرے پہ ڈالی اور بولے..... تم مسئلہ پوچھنے آئے ہو یا سوچنے ......؟ پھر خود ہی کچھ سوچ کر فرمایا!

''تاہم معروضی حالات میں آئمہ کرام اگر یہ سمجھتے ہیں کہ شخصیت اپنے ڈاکٹر وحید قریشی کی طرح اس قدر وسیع وعریض اور اتنی مفصل ہے کہ اس کا خلاصہ ایک آدھ خاکے میں ممکن نہیں تو ایک سے زیادہ لفافے یا کاغذی تھیلے بھی استعمال کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن جہاں تک میرے علم میں ہے' آں نساء مرحب قاسمی وغیرہم وحید قریشی تو کجا عورتوں کی جون ایلیا بھی نہیں ہیں۔ ایسی کڑیوں کے لئے پڑیوں تک کا استعمال جائز نہیں۔ میں تمہیں اس اصراف کی اجازت کیسے دے سکتا ہوں۔''

میں نے ڈرتے ڈرتے مزید گنجے فرشتوں کا حوالہ دیا تو تجوید کے ساتھ لاحول پڑھنے کے بعد فرمایا' شریعت ادب میں اسی کو مکروہ تحریمہ کہتے ہیں' جو تمہارے باب میں سراسر مباح ہے۔ انہی کے ایک اور قدرے پرانے مگر نسبتاً حساس کیس کی طرف اشارہ کیا تو یکدم پسیج گئے۔ دکھتی رگ پر ہاتھ پڑا تو تڑپ کر نہ صرف اجتہاد پر آمادہ ہو گئے بلکہ روانی میں یہ تک کہہ گئے کہ اگر میں داخل دفتر مسلوں کو نہ پھرولوں تو وہ اپنے رسک پر مجھے بھی مکروہ تحریمہ کی رعایت دینے کے بارے میں ہمدردانہ غور کر سکتے ہیں۔ میں تشکر' مسرت اور عقیدت سے مغلوب ہو کر ان کا دست' حق پرست چومنے کے لئے جھکا تو بولے:

''مگر یاد رہے کہ خاکہ نگاری کے اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں ہوسکتا۔ اور خاکہ نگاری کی اولین اور اہم ترین شرط یہ ہے کہ جس کا خاکہ لکھنا مطلوب ہو' لازم ہے کہ وہ تمہارا مقصود ومحبوب بھی ہو۔ یعنی تم نے اس سے رج کے پیار بھی کیا ہو۔ لیکن تمہارے لئے میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ خاکہ لکھنے کے لئے تم ہمیشہ ایسی شخصیت کا انتخاب کیا کرو جو ترجیحاً صاحب مزار ہو' یا پھر اس قدر بیمار شمار کہ ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے کر گھر بھیج دیا۔ یعنی اس کے صحت یاب ہونے کے امکانات مکمل طور پر معدوم ہو چکے ہوں۔ اگر حاضر اسٹاک میں ایسی شخصیت دستیاب نہ ہو تو تمہارا ممدوح کم از کم نحیف ونزار اور بے یار و مددگار تو ہونا ہی چاہئے۔ کیا خیر سے تمہاری زوجہ محترمہ نے اتنے قلیل عرصہ میں یہ ممدوحانہ اوصاف اچیو (achieve) کر لئے ہیں؟''

عرض کیا بوجوہ ہنوز وہ محولہ بالا اوصاف حمیدہ کا ہدف پورا نہیں کر پائی لیکن میں اس کی طرف سے قطعاً مایوس نہیں ہوں۔ اچیومنٹس (achievements) کے معاملے میں اس کا ریکارڈ ہمیشہ اچھا رہا ہے۔ تاہم خاکہ نگاری کی اولین شرط پر وہ بھی پورا اترتی ہے' میں بھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں ''رج'' کے پیار نہیں کر سکتا۔ رجنے کے بعد مجھے ''دھس'' کے نیند آتی ہے۔ یوں بھی ندیدہ رج جائے تو پیار پریت کی بجائے مار پیٹ کو اپنا مسلک بنا لیتا ہے۔ البتہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ میں اس سے بندگی کی حد تک پیار کرتا ہوں اور......

''تمہارا پیار بھی ریچھ کا سا ہے۔ لاڈ سے چہرے پر دست شفقت پھیرتا ہے تو گال کی کھال ہی نہیں آئی بال (eye ball) بھی نکال' مالک کی ہتھیلی پر دھر دیتا ہے۔ مہذب دنیا میں اسے بندگی نہیں درندگی کہتے ہیں۔''

''لیکن حضور میں یہ دست شفقت اس سے پہلے بھی......؟''

''تب کی بات اور تھی' اب کی اور ہے۔ پہلے موصوفہ محض ممدوحہ تھیں' اب تمہاری منکوحہ بھی ہیں۔ تب وہ صرف وضعدار خاتون تھیں' اب خاتون خانہ ہیں۔ پہلے یکا و تنہا تھیں' سہہ گئیں۔ اب خانہ جنگی میں بچوں کے علاوہ انہیں تمہارے ان دوستوں کی حمایت بھی حاصل رہے گی جن کے اس عرصہ میں تم نے خاکے لکھے ہیں۔ میرا کام نیک و بد کو سمجھانا تھا' سمجھا دیا۔ اس کے باوجود بیٹھے بٹھائے پنگا لینا چاہتے ہو تو شوق سے لو--میری طرف سے اجازت ہے۔''

مولوی صاحب کے دلائل ٹھوس ہی نہیں بے حد وزنی بھی تھے......انتباہ کی جھلکیاں کچھ اور کہہ رہی تھیں......گھر میں فرقہ وارانہ اور نسلی فسادات کے پھوٹنے کے اشارے مل رہے تھے۔ مولوی صاحب کے گئے گوڈے کئے تو بولے ''میری مانو تو دوسرا خاکہ لکھنے کی ادبی بدعت کا ارتکاب مت کرو۔ شریعت کے چھتے میں ہاتھ ڈالو گے تو منہ سوج کے کپا ہو جائے گا۔ بہتر یہی ہے کہ دوسرا لکھنے کی بجائے پہلے خاکے پر نظر ثانی کر لو۔''

نظر ثانی والی بات معقول لگی۔ یوں بھی محبوبہ اور منکوحہ میں فرق ہوتا ہے۔ اگرچہ شروع شروع میں یہ فرق انیس بیس کا ہوتا ہے لیکن وقت کے ساتھ انیس اور بیس کا فرق زمین و آسمان کا فرق بن جاتا ہے۔ اور جب حالات ایسے ہو جائیں تو بندے کو اپنے حالات پر نظر ثانی کر لینی چاہئے۔ چنانچہ اس تمہید طولانی کے بعد میں سابقہ ممدوحہ کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن پیش کرتا ہوں تاکہ سند رہے اور بے وقت ضرورت منکوحہ کے کام آسکے:

یونیورسٹی میں بھاری بستہ' بازار میں وزنی تھیلا اور گھر میں بوجھل کیسہ اٹھائے ''دھوڑیں پٹی'' کسی عورت کو دور ہی سے دیکھیں تو سمجھ جائیں کہ وہ مرحب قاسمی ہے۔ دور ہی سے دیکھنے کا مشورہ اس لئے دے رہا ہوں کہ وہ قریب سے تصدیق کے متمنی کسی مرد کو پھٹکنے نہیں دیتی۔ متجس جب تک ابتدائی دو سلیب طے کرتا' وہ کوریڈار پار کر چکی ہوتی ہے۔ متشکک جب تک تیسری دکان میں جھاتی مارتا' وہ چوتھی گلی چھان چکی ہوتی ہے۔ تجسس اور تشکک ماروں کو میرا دوسرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ کوریڈاروں اور بازاروں میں خواہ مخواہ تھکنے کی بجائے میرے ساتھ ''ہفتے'' کے لئے تشریف لائیں۔ میں باہر گاڑی میں بیٹھا اس کے لئے چشم براہ ملوں گا۔ (شادی کے بعد خوف کم ہو گا تو ممدوحہ کی سبک پائی میں بھی خاطر خواہ افاقہ ہو جائے گا۔ لیکن اس نے آج تک اپنی خو نہیں چھوڑی تو ہم اپنی وضع کیوں بدلیں......وہ اپنی چال پر قائم ہے' میں اپنے خیال پر قائم ہوں)

مرحب قاسمی کی دوسری پہچان اس کی ناک' اور عنوان خاک ہے۔ اس کی ناک اس قدر اونچی اور لمبی ہے کہ سنبھال رکھیں تو ہم دونوں کے لئے بہت ہے۔ اسی لئے پوری سنجیدگی کے ساتھ سوچ رہا ہوں کہ فالتو ناک اٹھائے پھرنی کی بجائے مشنری جذبے کے تحت میں اپنی ناک کٹوا کر کسی خیراتی ادارے کو دان کر دوں......کہ......
ملک عزیز میں جتنی قلت اس آئٹم کی ہے' اتنی شاید ہی کسی اور اسپیئر پارٹ کی ہو۔ لیکن یہ کار خیر میں ترجیحاً کسی معتبر این جی او کے حنائی ہاتھوں سے انجام دلوانا ہی پسند کروں گا۔ (بات مرحب کی دوسری پہچان کی ہو رہی تھی' بیچ میں

جملہ معترضہ کے طور پر میری اپنی ناک ٹپک پڑی)

مرحب کی ناک اونچی اور خطرناک حد تک لمبی ہی نہیں' بے حساب سیدھی بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے اس نے چلنا سیکھا ہے' ناک کی سیدھ میں ہی چلتی ہے۔ سیدھے چلنے میں وہ کمفرٹ ایبل محسوس کرتی ہے۔ جبکہ مجھے سخت الجھن ہوتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ سیدھے راستے میں شارٹ کٹ نہیں ہوتے۔ (مجھے پوری شدت کے ساتھ احساس ہے کہ مرحب کی دوسری پہچان کا ذکر اس کی ناک کی طرح طول پکڑتا جا رہا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ اپنے ہاں ایک بار شروع ہو جائے تو ناک کا قصہ اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک اس کا قصہ تمام نہیں ہو جاتا)

جیسا کہ اوپر بیان کر چکا ہوں' اللہ نے مرحب کو بلحاظ رقبہ ہی نہیں بہ اعتبار رتبہ بھی خاصی اونچی ناک عطا کی ہے۔ اور اس کی اونچائی میں روز افزوں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ جس کی ناک اس قدر بلند ہو چکی ہو' اصولاً اسے خود بھی اٹھ کر کم از کم عالم بالا تک تو جانا ہی چاہئے۔ لیکن جوں جوں اس کی ناک اونچی ہوتی جا رہی ہے' مرحب خود 'جھکی جھکی' رہی ہے۔ اتنی جھکی کہ کبھی کبھی اسے خاک سے پھرول کر نکالنا' اور پھر جھاڑ پھونک کر اس کے اصل مقام و پتہ پر ڈالنا پڑتا ہے۔ مگر صد شکر کہ خاکساری کے ان دوروں کا دورانیہ اور تواتر فی الحال بہت زیادہ نہیں۔ ورنہ آج قلم کی بجائے میرے ہاتھ میں جھاڑو اور کاندھے پر جھاڑن ہوتا۔

پیشے کے لحاظ سے مرحب درسی معاشیات میں استادیاں دکھا رہی ہے' جبکہ یہی کام وہ عملی سیاسیات میں زیادہ موثر طریقہ سے انجام دے سکتی تھی۔ اس لئے کہ وہ پیدائشی فساد پرستی اور انتشار پسند واقع ہوئی ہے۔ اس کے اس خالص لیڈرانہ وصف کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے پیدا ہوتے ہی والدین کے بیچ تفرقہ پیدا ہو گیا۔ والد کا موقف تھا کہ نوزائیدہ کی شکل تشویش ناک حد تک ماں سے ملتی ہے' جبکہ والدہ کا کہنا تھا کہ نیک بخت شکل سے ہی نہیں عقل سے بھی باپ سے مشابہ ہے۔ خاندان بھر میں مرحب سے زیادہ متنازعہ شخصیت اور کوئی نہیں۔ آج بھی پورا خاندان واضح طور پر دو گروپوں میں تقسیم ہے۔۔ پریشر گروپ اور انڈر پریشر گروپ۔ پہلے گروپ کا کہنا ہے کہ مرحب خوبصورت ہے' دوسرے کا کہنا ہے کہ مرحب خوبصورت نہیں ہے۔ (ذاتی طور پر میں اس نوع کے خانگی تنازعات میں ہرگز نہیں پڑتا۔ خواہ معاملہ میری اپنی کنٹروورشل بیوٹی کا ہی کیوں نہ ہو)

ہو سکتا ہے مرحب باقاعدہ خوبصورت نہ ہو لیکن اس کے چہرے کے گرد مدہم سی دمک' دھیمی سی للک اور ہلکی سی چھلک کا ایک حصار رہتا ہے...... آدھی رات کے پورے چاند کے گرد ہالہ جیسا۔ چاند کسی وجہ سے اتر بھی جائے' ہالہ نہیں اترتا۔ تاہم یہ ہالہ اس وقت عالم بالا سے زمین پر گرتا ہے جب کوئی کثیف نگاہ لطیف ہالے سے پار ہونے کی کوشش کرتی ہے۔ ایسے میں آسمان سے گرے' اور سندھ میں کسمپرسید پڑے ہالے میں کوئی فرق نہیں رہتا...... وہی جگہ جگہ کھڈے' تھاں تھاں پھڈے...... ادھر چیریں' ادھر لکیریں...... کرچیاں ہی کرچیاں' ریزے ہی

ریزے۔ چونکہ وہ میرے حبالہ نگاہ میں رہتی ہے اس لئے آسمانی ہالہ بھی اکثر زمین بوس ہی رہتا ہے۔

کہتے ہیں ڈھلتے سایوں کے ساتھ ساتھ بیٹیاں ماؤں جیسی ہونے لگتی ہیں اور اکثر وہ مقام بھی آتا ہے کہ جہاں وہ خود اپنی مائیں لگنے لگتی ہیں۔ مرحب کا معاملہ یہاں بھی مختلف ہے...... وہ بتدریج اپنی بیٹی پر پڑتی جا رہی ہے...... شکلاً بھی نسلاً بھی۔ یہ صورت حال مجھے اس وقت باقاعدہ خوف زدہ کر دیتی ہے، جب وہ بیٹی اور بیٹے کے ساتھ ہم عمریاں کرنے، گھر بھر میں قلانچیں بھرنے لگتی ہے۔ ایسے میں اس کے چہرے پہ متانت و ذہانت، اصالت وشرافت کی ہولے ہولے چٹکنے والی چاندنی کی بجائے لڑکپن اور شرارت کی دھوپ تڑپنے لگتی ہے۔ بچوں کے کمرے، گھر کے کسی کونے یا لان کے کسی گوشے سے لگاتار قہقہے، چہچہے، کوکیں، قلقاریاں بلند ہوتی ہیں۔ پھر اچانک سکوت چھا جاتا ہے۔ میں کانوں سے روئی اور تکیے تلے سے کتاب نکالتا ہوں۔ دفعتہً ایک اونچی اور لمبی ''یے ے ے ے'' اٹھتی ہے (کورس میں سب سے زیادہ بلند اور بچگانہ آواز مرحب کی ہوتی ہے) تو میں سمجھ جاتا ہوں کہ باورچی خانے میں میری پسندیدہ ڈش کی جگہ آج پھر بچگانے جانے کا پروگرام پکایا جا چکا ہے...... یہاں فوڈ کی بجائی فن سے پیٹ بھرا جائے گا۔ چاکلیٹ، آئس کریم...... برگر، پیزا میرے سامنے بھی دھرا جائے گا۔

انتہائی سنجیدہ علمی اور معتبر ادبی حلقوں میں برتریاں ثابت کرنے والی خاتون اس عمر میں ''برگریاں'' کرتی پھرے، کچھ جچتا نہیں۔ لیکن مرحب کی شخصیت سے یہ ''پیرانہ سالی'' منہا کر دی جائے تو اس کے پاس کچھ بچتا بھی نہیں۔ میرے خیال میں یہ اسی پیرانہ سالی کا اعجاز ہے کہ مرحب کی شخصیت میں نہالی اور فکر و فن میں تازہ خیالی باقی ہے۔

مائیں پیدا ہوتے ہی، آن واحد میں بچوں کو بڑا دیکھنے کی متمنی ہوتی ہیں۔ اور پھر ساری زندگی اسی تمنا کی تکمیل میں خرچ ہوتی رہتی ہیں۔ مرحب بھی ایک ماں ہے، مگر ذرا مختلف۔ وہ اپنے بیٹے کو بڑا نہیں ہونے دیتی۔ موصوف سات سال کے ہو چکے ہیں، موصوفہ آج بھی جب تک اپنے ہاتھ سے لقمہ اس کے منہ میں نہیں ڈالتی، اس کے اپنے حلق سے نوالہ نہیں اترتا۔ جس طرح مرحب بیٹے کو بڑا نہیں ہونے دیتی، اسی طرح وہ اپنے بچپنے کو بڑا نہیں ہونے دیتی...... اسے اپنے اندر سینت سینت کے رکھتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اسکی شخصیت میں ہنوز بیگماتی ٹھسا نہیں آیا...... اسے کبھی بچوں پہ غصہ نہیں آیا۔

مرحب کی آنکھیں جتنی چھوٹی ہیں، اس کی نظر اتنی ہی موٹی ہے...... اسے دوسروں کے چھوٹے چھوٹے عیب صاف دکھائی نہیں دیتے تھے (اس کی یہ خامی میری آنکھ میں بہت رڑکتی تھی)۔ ایک مدت کی بحث و تکرار کے بعد آخر کار میں اسے کنٹیکٹ لینز لگوانے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ لینز لگوانے کے بعد اس کی بصیرت و بصارت دونوں میں فرق پڑا ہے۔ اب اسے دوسروں کے یہ موٹے موٹے عیب بھی دکھائی نہیں دیتے۔ روپے کے علاوہ لینز لگوانے کا ایک نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گئی ہیں۔ رہا نہ گیا تو ایک دن کہہ دیا، دیکھا میرا انتخاب...... 'لینز نہیں، تمہاری آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر موتی بھرے ہیں......

''جب ہی کہوں یہ چبھن سی کیوں ہے......'' وہ بولی۔ تب سے دن میں کئی کئی بار آنکھیں دھوتی ہے۔ اور جتنی بار آنکھیں دھوتی ہے' اتنی بار روتی ہے...... ''تینوں میرا صبر پوے۔'' دراصل مرحب کو صرف نظر کا عارضہ لاحق ہے اسی لئے جب بھی گھر سے باہر نکلتی ہے' جاسوسی کہانیوں کے ہیرو کی طرح کالا چشمہ پہن کے نکلتی ہے۔ گھر میں البتہ وہ مجھے ننگی آنکھ سے ہی دیکھتی ہے۔ سیاہ چشمہ پوشی عادت ہی نہیں' بطور ملازمت پیشہ خاتون' اس کی ضرورت بھی ہے...... کہ...... زنانی ہو کر وہ مردوں کے بیچ مردانہ وار رہتی ہے۔ اور یوں سیہ چشم مرحب میری مردم دیدہ ہے اور میں مردم بیزار۔

مرحب کی ایک عادت مجھے سخت ناپسند ہے کہ جب بھی میں محض اس کی خوشی کی خاطر عورتوں اور ادیبوں کے پسندیدہ مشغلہ کے مطابق غیبت کا ہنگامی سیشن بلاتا ہوں' وہ انتہائی شد و مد کے ساتھ ہدف کی پیروی کرنے لگتی ہے۔ بحث جب خوب گرم ہو جاتی ہے تو وہ خود ہی جلتی پہ تیل ڈالتی ہے۔ سرسوں کے تیل کے بھبکے اس کے سر سے اٹھ کر ساری فضا کو اتنا عائلی/آئیلی کر دیتے ہیں کہ بحث ہی نہیں باحث بھی پھسل پھسل جاتے ہیں۔ اور اس طرح وہ ہمیشہ میری شام کی چائے کا مزہ کرکرا کر دیتی ہے۔

مرحب کو اچھے اچھے کھانے پکانے اور کھلانے کا جنون ہے۔ چنانچہ مروجہ دیسی کھانوں کے علاوہ وہ اکثر بدیسی پکوانوں میں بھی اختراعیں کرتی رہتی ہے۔ اور جب بھی کوئی اختراع پکاتی ہے' پڑوسیوں کی طرف بھیجنے سے پہلے مجھے کھلاتی ہے۔ پوچھتا ہوں تم ایسا کیوں کرتی ہو تو کہتی ہے...... اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی یہ کہ مرد کے دل کا راستہ معدے سے گزرتا ہے۔ دوسری یہ کہ بیچارے پڑوسیوں سے مجھے کوئی دشمنی نہیں۔

مرحب لبرل ہونے کے باوجود انتہائی کنزرویٹو قسم کی بیوی ہے۔ مشرقیت سے لبریز۔ ایثار شعار اور سپاس گزار۔ لیکن جب بھی میں اس کے حسن یا حسن کارکردگی کی تعریف کرتا ہوں' تشکر کی بجائے اس کے چہرے پہ تفکر کے سائے لہرانے لگتے ہیں: ''تمہارے پیٹ میں مروڑ اٹھے ہیں...... جی متلا رہا ہے...... سر چکرا رہا ہے'' وہ یکدم بے چین ہو جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں ''تم نے بتایا کیوں نہیں۔ ڈش میں پھر کوئی مصالحہ تیز ہو گیا ہے...... فوراً اٹھو...... ابھی اسی وقت ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں...... اوہ میرے خدا......''

کیوں گنہگار کرتی ہو......' خدا نہیں میں تمہارا مجازی خدا ہوں۔ میں اسے تسلی دیتا ہوں کہ میرے پیٹ میں مروڑ ہیں نہ جی متلا رہا ہے اور نہ ہی سر چکرا رہا ہے...... ''پھر حسب معمول گردن کا پٹھا چڑھ گیا ہو گا۔ کہا بھی خواہ مخواہ پیچھے مڑ مڑ کے نہ دیکھا کرو۔ لیکن تم ہو کہ...... یا پھر بات بچاتے ہوئے موٹی ناف ٹل گئی ہو گی۔ کوئی نہ کوئی جسمانی یا ذہنی بیماری ضروری ہے۔ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو'' وہ کہتی ہے۔ میں اسے یقین دلاتا ہوں کہ میری طبیعت ایک دم ٹھیک ہے...... تمہاری قسم......

''تو پھر تمہاری نیت خراب ہے......'' وہ بدستور تشویش ناک لہجے میں کہتی ہے ''سچ بتاؤ اب کیا کام آن پڑا ہے......؟ روپے چاہئیں......' کسی دوست کو دعوت پہ بلانا ہے...... کہیں اکیلے جانا ہے......؟''

مرحب جتنی خوش مزاج ہے' اتنی ہی خوش مذاق بھی ہے۔ لباس کے معاملے میں وہ بے حد 'چوزی'

ہے۔ کہتی ہے' لباس شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ چنانچہ اس معاملہ میں کم ذوقی کا ارتکاب نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے لباس کے بارے میں ایک مشہور آیت کریمہ کے حوالہ سے ایک بار پوچھا کہ زندگی کا اہم ترین لباس منتخب کرتے وقت تمہاری آئینہ داری کہاں تھی؟ تو بولی...... اس وقت سردیوں کا زمانہ تھا۔ اور سردیوں میں ہمارے ہاں لنڈا فیشن میں ہوتا ہے۔ اچھے اچھے شرفاء بھی بے ڈھنگے اور پرانے دھرانے لنڈے میں پھرتے دکھلائی دیتے ہیں۔ مرحب چونکہ اچھی ڈیزائنر ہونے کے علاوہ سوئی سلائی اور بنائی تپائی کی بھی ماہر ہے۔ اس لئے وقتاً فوقتاً سندھی ٹانکے کے استعمال سے محولہ بالا لنڈے کی رفوگری کرتی رہتی ہے۔ آئے دن کتر بیونت کے ذریعہ اسے نئے فیشن میں ڈھالنے کے جتن کرتی رہتی ہے۔ اور جب میں اس کے اس کٹھن جتن پر دلی دکھ کا اظہار کرنے لگتا ہوں تو وہ اسی آیت کریمہ کا حوالہ دے کر میرے ہونٹ سی دیتی ہے۔ کشیدہ کاری کے علاوہ وہ قصیدہ کاری میں بھی ماہر ہے چنانچہ آئے دن پھٹے حال ادیبوں اور ان کی منتشر خیال تصانیف کو باندھنے کے لئے مضامین بنتی رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سندھ کے ادبی حلقوں میں جتنی مانگ اس کی ہے' اتنی شاید ہی کسی ادیب و شاعر کی ہو گی۔

مرحب وضعدار' خوش گفتار اور ملنسار ہی نہیں' خاصی قہقہہ بار بھی ہے۔ چنانچہ طلبہ و طالبات ہی نہیں پیشہ ور پارٹی اینمل بھی خوش فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ ابتلا اس وقت تک برقرار رہتی ہے جب تک کسی تقریب میں یا فون پر اس سے کوئی پھڑکتا ہوا جملہ نہیں سن لیتے۔

وہ نہایت رجائیت پسند بھی ہے...... کسی معاملے میں جلدی جلدی مایوس نہیں ہوتی۔ "سب ٹھیک ہو جائے گا" اس کا تکیہ کلام ہے۔ گاڑی کا ٹائر ویرانے میں پھٹ جائے تو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بجٹ گرنے سے مخلوق خدا کا کچومر نکل جائے تو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کسی جاننے والی کا سہاگ اجڑ جائے تو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حتیٰ کہ گڑبڑانے کی بجائے مجھے دیکھ کر بھی کبھی کبھی بڑبڑا اٹھتی ہے...... "سب ٹھیک ہو جائے گا"

نڈر ہونے کے علاوہ مرحب بے حد زندہ دل بھی واقع ہوئی ہے۔ لیکن اس کا یہ وصف مجھے کھٹکتا ہے۔ اس لئے کہ مجھے دیکھتے ہی وہ کھنکتا ہوا قہقہہ لگاتی ہے۔ پوچھتا ہوں تو کہتی ہے...... "تم زندگی سے شاکی ہو؟" ہرگز نہیں۔ میں جواب دیتا ہوں۔ "پھر یہ بتاؤ کہ صورت پر بیزاری کندہ کروانے کے کتنے روپے لگے ہیں؟"

کیا تمہیں میری شکل اچھی نہیں لگتی......؟

"ایسے خارج از نصاب سوالات مت پوچھا کرو" وہ کہتی ہے "کیا اتنا کافی نہیں کہ تمہاری بیزار صورت پر نظر پڑتے ہی زندگی پر اعتماد بڑھ جاتا ہے...... پیار آنے لگتا ہے؟ میری دعا ہے کہ تم ہمیشہ اسی صورت' اسی طور جیتے رہو۔"

مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے۔ لیکن دل ہی دل میں بے ساختہ آمین کہنے کے بعد ہر بار میں یہ عہد بھی کرتا ہوں کہ جب تک جیتا رہوں گا...... تم پہ مرتا رہوں گا۔

ہم کب خرچ ہوئے ہیں

O

مشکور حسین یاد

سب سچائیاں گوشۂ دل میں تہیں لگا کر رکھی ہیں
سارے نقشے سب تدبیریں ہم نے چھپا کر رکھی ہیں
ہم نے خود پہ حرام کیا ہے ہر انداز کی جرأت کو
خون کی ساری گردشیں محوِ صبر و رضا کر رکھی ہیں
کونسا ظلم ہے جس کو جلا کر راکھ کیا ہے ہم نے بتاؤ
سانس کی ساری بجلیاں رہنِ آب و ہوا کر رکھی ہیں
کون اگائے خواب کی مہندی کون رچائے زیست کے ہاتھ
ذوقِ عمل کی سب تعبیریں برگِ حنا کر رکھی ہیں
کب کھولے ہیں دل کے خزانے ہم کب خرچ ہوئے ہیں
ہم نے تو سب ہمتیں وقفِ دستِ دعا کر رکھی ہیں

☆

اس کے پاؤں

O

مشکور حسین یاؔد

(یہ بتایئے نظم ہے یا غزل! یاؔد)

خواب میں دیکھے اس کے پاؤں　　دل میں اترے اس کے پاؤں
آنکھ کھلی تو سامنے ہی تھے　　جگمگ کرتے اس کے پاؤں
صدق و صفا کے نور آئینے　　بھولے بھالے اس کے پاؤں
ہر صبح روشن کا حوالہ　　گورے گورے اس کے پاؤں
دیکھ سنہرے نصیب ہمارے　　دیکھ سنہرے اس کے پاؤں
اتنی اجلی کب ہے دنیا　　جتنے اجلے اس کے پاؤں
دن بھر کے سورج کا نچوڑ ہیں　　چاند چکور سے اس کے پاؤں
لکھتے پڑھتے سے لگتے ہیں　　چلتے پھرتے اس کے پاؤں

یاؔد ہمیں رکنے نہیں دیتے
آگے بڑھتے اس کے پاؤں

ہراک جسم

O

مشکور حسین یاؔد

(فرمائیے یہ نظم ہے یا غزل! یاد)

وہ حسیں جسم جو شامل ہے ہر اک جسم کے ساتھ
اک عجب وصل کی جھلمل ہے ہر اک جسم کے ساتھ

کیوں نہ ہر جسم میں ہم تیرا حوالہ ڈھونڈیں
تو ہے دریا ترا ساحل ہے ہر اک جسم کے ساتھ

اتنا اتنا اسے آسان بنائے ترا جسم
جتنی جتنی کوئی مشکل ہے ہر اک جسم کے ساتھ

ہم وہ منعم کہ ہر اک جسم کو تسلیم کریں
تو وہ دولت کہ جو حاصل ہے ہر اک جسم کے ساتھ

کون یاں کس کو نہیں چاہتا چپکے چپکے
منعقد پیار کی محفل ہے ہر اک جسم کے ساتھ

کیوں نہ ہر جسم کو ہم دیکھیں صحیفے کی طرح
ایک آیت ہے کہ نازل ہے ہر اک جسم کے ساتھ

کونسا جسم نہیں قابل تعظیم اے دوست
سورۂ نور حمائل ہے ہر اک جسم کے ساتھ

حسب ہمت اسے اب یاؔد عطا کرتی ہے ضو
روشنی تو بڑی عادل ہے اک جسم کے ساتھ

☆

زمیں پر آخری لمحے

O

فیصل ہاشمی

اندھیرے دوڑتے ہیں رات کی ویران آنکھوں میں
چراغوں کی جڑوں سے روشنی کا خون رستا ہے
سمندر کشتیوں میں
چھید کرتی مچھلیوں سے بھر گئے آخر
مسافر منزلوں کی خواہشوں سے ڈر گئے آخر
صدا اس قید گاہ حادثہ سے
بھاگ جانے کی کڑی کوشش میں زخمی ہے
زمیں فالج زدہ ہونٹوں کی جنبش سے
ٹھہر جانے کو شاید کہہ رہی ہے
ہوا کی سانس رکنے لگ گئی ہے!

“Apocalypse”

O

فیصل ہاشمی

نظر کی آخری سرحد پہ کوئی نقش ہے جس میں
بھنور کی زد پہ کشتی کی مقدر آزما کوشش
قیامت خیز لمحوں میں صدا کے مضمحل پیکر
برہنہ رقص میں مشغول ہیں موہوم سالوں سے
اور اک سنسان صحرا سے جرس کی گونج آئی ہے
روانہ ہو رہا ہے کارواں گمنام رستوں پر
بدلتی صورتِ حالات کی نوحہ سرائی سے
مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اب تم مل نہیں سکتے!

✲

وہ ایک لمحہ

o

اکرم کنجاہی

وہ ایک لمحہ
کہ جس کی خاطر
میں دشتِ جاں کی مسافتوں کا
عذاب سہہ کر بھی جی رہا تھا
نام میرا جس ایک ساعت میں
تیرے ہونٹوں پہ آ گیا تو!
میری خطاؤں سے چشم پوشی
کر کے تو نے
ٹوٹے ناطے کو پھر سے جوڑا
خموشیوں کا حصار توڑا
وہ ایک لمحہ
اثاثہ عمرِ رواں کا بن کر
ہر مسافت میں زرفشاں ہے
ذہن میرا نگار خانہ سا بن گیا ہے
جس میں کتنے خوشنما سے
لطیف منظر ٹھہر گئے ہیں
مشامِ جاں میں اس ایک لمحے
کی ساری خوشبو سمٹ گئی ہے
ترے تبسم میں تھی حلاوت
تیرے لہجے کی وہ عذوبت

تیرے لفظوں کا سحر ایسا
کہ جاگ اٹھا
نصیب حرماں نصیب کا
کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں
وہی تو لمحہ
میری محبت کی زندگی ہے
اسی کی دہلیز پر میں
جبیں بہ سجدہ ہوں اس طرح
کہ میری آنکھوں سے
کتنے چشمے ابل پڑے ہیں
وہ ایک تحفہ ہے کیف زا
کہ جس کو سینے سے میں لگا کر
اپنی تنہا اداس راتوں میں
ایک مدت سے
قلبِ محزوں کے زخمِ پنہاں کو
بھر رہا ہوں
سامان جینے کا کر رہا ہوں

چلو سورج تراشیں اِک نیا اپنے مقدر کا

o

ڈاکٹر علی اطہر

چلو سورج تراشیں اِک نیا اپنے مقدر کا
بڑا امکان غالب ہے
کہ ہم پہچان کھو بیٹھیں
شناسائی، مروت، آشتی کے خواب منظر کی............
کہ اب تو ہر طرف
گہری قنوطی کیفیت ہے
آدمی نامعتبر آنکھوں کی زد میں
اور انساں ہولنا کی کے تحیر میں مقید ہے..........

حصارِ عافیت بھی اب شکستہ ہے
فصیلِ خواب سے باہر
نجانے کس قدر سفاک، وحشی اور پھٹی آنکھیں
سکوں، حفظ و اماں کی تاک میں
غارت گری کے اسلحے سے لیس بیٹھی ہیں..........

نہ اب شہروں میں شالیں چاہتوں کی تان کر
وہ مشترک بیٹھک رہی باقی
کہ جس میں چاشنی کے بول زندہ تھے..........

نہ اب گوٹھوں میں باقی ہے
کسی پیپل کے نیچے
پیار کا پشمینہ اوڑھی سوندھی مٹی کا بنا ڈیرہ
جہاں کی شام اکثر
ہیر کی دلکش مدھر تانوں میں ایسے سانس لیتی تھی
کہ جیسے بانسرہ کی خوبصورت چھاتیوں کے درمیاں
دھیمی، مسکن، لطف پرور زندگی دائم............
نہ وہ بیٹھک رہی باقی، نہ وہ پیپل کے ڈیرے ہیں
کہ اب تو شام ہونے سے بہت پہلے
مکانوں کے کواڑوں کی طرح سے
آنکھ اور دل کے کواڑوں کو بھی وا رکھنا حماقت ہے
مگر کب تک؟!
ابھی کل آنے والی نسل کی آنکھیں
تجسس سے
کسی مقتول کا خوں، راکھ خوابوں کی جو دیکھیں گی
تو پھر لکنت زدہ لہجے میں پوچھیں گی
یہ سب کیا ہے؟
تو کیا کہنا ہے؟؟ سوچا ہے!؟
سنو اے فکر کے نایاب خلیوں کی وراثت کے امیں ذہنو!
ابھی بھی معجزہ ممکن ہے نسلوں کی تسلی کا
کسی اچھے سے مستقبل کے صیغے کی ضمانت میں
رویوں کی روایت میں
محبت اب ضرورت ہے............
چلو سورج تراشیں اِک نیا اپنے مقدر کا

یہ کوئی وقت سونے کا نہیں تھا

○

صائمہ اسماء

اندھیرا اور گہرا ہو گیا ہے
شام کا سورج
دریچے کی ہتھیلی کو حنائی کر گیا ہے
گو ابھی سورج نہیں ڈوبا مگر
یوں ہے کہ سارے گھر میں جیسے چاندنی ہر سمت پھیلی ہے
قضا ہونے پہ سجدوں کی گراں باری جبیں پر ہے
مگر دل ہے کہ سرشاری میں ڈوبا ہے
مجھے نعمت کدے کی فکر ہے کوئی
نہ آنگن کی الگنی پر دھرے کپڑے بلاتے ہیں
کسی بستے میں کوئی کام ادھورا ابھی نہیں رکھا
یہ کوئی وقت سونے کا نہیں تھا
زندگی جیسے بڑی بے اختیاری میں یکا یک
ماں کے زانو پر رکھے سر سو گئی تھی
یا گریزاں خواب کا آنچل
بہت دن بعد میری آنکھ کی مٹھی میں آیا تھا
کسی کمرے سے بچوں کی بجل سرگوشیاں

دھیمی ہنسی میں تیرتی، چھینٹے اڑاتی مجھ تک آتی ہیں
سماعت بھیگ جاتی ہے
نگاہیں مہرباں ہیں
ایسے استقبال کرتی ہیں
کوئی لمبے سفر سے جیسے لوٹا ہے
بہت دن جا چکا ہے
پھر بھی کتنا وقت باقی ہے
(گھڑی پر بیٹھی چڑیا چپکے چپکے کھول کر کھڑکی
بڑی لمبی اڑانیں بھر کے بھی آئی
تو سوئی اگلے گھنٹے تک نہیں پہنچی)
اگرچہ یہ کوئی شام فراغت تو نہ تھی لیکن
میں پورا پہر سوئی ہوں مگر کچھ بھی نہیں بگڑا!

غلام ابنِ غلام

○

نبیل احمد نبیل

یہ وہ وطن ہے کہ جس سے پہلے
بڑے ہی بے ننگ و نام تھے ہم
تماشاءِ خاص و عام تھے ہم
غلام ابنِ غلام تھے ہم
ہزار محکومیوں کے نیزے دل ونظر میں گڑے ہوئے تھے
ہم اپنے جسموں کے بندی خانے میں پابجولاں پڑے ہوئے تھے
یہ مہر و مہ نجوم سارے
وہ ٹہنی ٹہنی گلاب پارے
جمالِ فطرت کے استعارے
کمالِ جبر و کراہ میں تھے
غنیم سیلِ سیاہ میں تھے
صعوبتیں ہی صعوبتیں تھیں
اجالے برزخ میں سو رہے تھے
گئے زمانوں کو رو رہے تھے
بدن کی بنجر زمین پر ہم
گلاب زخموں کے بو رہے تھے

ہماری اسی داستاں میں آخر
وہ دیومالائی باپ آیا
جب ایک شاعر کا خواب لے کر
کرن کرن ہم رکاب لے کر
ہزار ماہتاب لے کر
شفق کے سایہ مہرباں میں عظیم قائد کے کارواں میں
نگارِ ارضِ وطن کی خاطر
حسین کوہ و دمن کی خاطر
روش روش اس چمن کی خاطر
قفس سے باہر نکل کھڑے تھے
غلام گردش کے قفل سارے
ہمارے قدموں میں گر پڑے تھے
شہید مٹی میں مل رہے تھے
گلاب شاخوں پہ کھل رہے تھے
مگر اس ارضِ وطن کو پا کر
وہ خواب سارے گلاب سارے
محبتوں کے نصاب سارے
دلوں سے یکسر بھلا دیے ہیں
چراغ جتنے تھے رہ گزر میں
وہ لحظہ لحظہ بجھا دیے ہیں
اسی لئے تو وطن ہمارا
سوال کرنے پہ تل گیا ہے

لہو ہماری نظر میں کتنے
حسین خوابوں کا گھل گیا ہے
کتابِ ہستی صفحہ صفحہ
ہمارے اشکوں سے دھل گیا ہے
پھر اپنی اپنی حماقتوں سے
قیادتوں کی سیاستوں سے
بڑے ہی بے ننگ و نام ہیں ہم
تماشاءِ خاص و عام ہیں ہم
غلام ابنِ غلام ہیں ہم
غلام ابنِ غلام ہیں ہم

رومانیہ کے سفیر ڈاکٹر ایمل گیتویسکو سے گفتگو

ترجمہ: طارق عزیز سندھو

پاکستان میں رومانیہ کے سفیر عزت مآب ڈاکٹر ایمل گیتویسکو نابغۂ روزگار شخصیت ہیں۔ آپ بیک وقت ایک کامیاب ڈپلومیٹ' صحافی' مصور اور ادیب بھی ہیں۔ حال ہی میں ان کی کتاب "Dialogue between Civilisations: Allama Iqbal and Mihai Eminescu" منظر عام پر آئی ہے جس میں انہوں نے پاکستان اور رومانیہ کے قومی شاعروں کا تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔ ذیل میں ہم ان سے کی گئی گفتگو کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں۔ (مترجم)

بشکریہ 'The Nation'

سوال: آپ کے خیال میں ایک لکھاری امن وسکون کے کلچر کے فروغ میں کیا کردار ادا کر سکتا ہے؟

ڈاکٹر ایمل: مصنفین اور ادبی دنیا کے لوگ تہذیبوں کے درمیان ایک طرح کا تعلق ہیں۔ وہ معاشرے کا ایک موثر طبقہ ہیں۔ ان کے پاس عوام کے دلوں تک رسائی کی طاقت ہے۔ وہ ایک ایسی سواری کی مانند ہیں جو صدیوں سے امن وسکون کا پیغام اٹھائے زبان' نسل' قوم اور رنگ کے امتیاز کو کچلتی چلی آ رہی ہے۔ انکا پیغام عالمگیر ہے۔ کبھی بھی کسی لکھاری نے دہشت گردی کی تعلیم نہیں دی۔ ان کا پیغام' چاہے نظم میں ہو یا نثر میں' ہمیشہ سے سچائی' محبت' خوبصورتی اور انسانیت کے لئے رہا ہے۔ ایک لکھاری شاید زندہ نہ رہ سکے' مگر اس کا پیغام سلامت رہتا ہے۔ یہی حقیقت لکھاری کو اتنی قوت فراہم کرتی ہے کہ وہ دنیا بھر میں امن وسکون کے کلچر کے فروغ میں ایک بھرپور کردار ادا کر سکے۔

برداشت ایک ایسا ہتھیار ہے جس کے ذریعے کوئی بھی انسان زندہ رہنے کے قابل ہے اور زندگی سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ غلطیوں کو سمجھ لیا جائے اور دوسروں کے اوصاف کی تعریف کی جائے۔ رومانین نے ہماری پیچیدہ تاریخ سے سیکھا ہے اور ان آزمائشوں سے بھی جو اس

نے ہم پر نافذ کی ہیں تا کہ ان رشتوں کو مضبوط اور مستحکم کیا جا سکے جو ہماری عوام کو متحد رکھے ہوئے ہیں۔ رومانین عوام کی برداشت' دوسروں کی عزت اور اختلافات کے اعتراف کی ایک منفرد روایت موجود ہے۔ برداشت ہماری روزمرہ زندگی کا حصہ ہے کیونکہ ہم ایک امن کی ایک نئی دنیا قائم کرنا چاہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ برداشت کا لفظ صرف اسی وقت موضوع سخن بنتا ہے جب اس کا متضاد ''غصہ'' عوام کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتا ہے اور مسائل و مشکلات پیدا کرتا ہے۔ برداشت سے مراد یہ بھی ہے کہ ہر قوم کی کلچرل اقدار کا احترام اور تعریف کی جائے۔

سوال: ایک سفیر (ڈپلومیٹ) اور لکھاری ہونے کی حیثیت سے ہمیں اپنے تجربات سے آگاہ کریں۔ کیا آپ نے کبھی خود میں نظریات کا ٹکراؤ محسوس کیا ہے؟

ڈاکٹر ایمل: بھئی! مجھے تو کبھی ایسے ٹکراؤ کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ کیونکہ ایک سفیر (ڈپلومیٹ) کسی ملک کا پیامبر ہوتا ہے اور ایک لکھاری وقت کا پیامبر ہوتا ہے۔ میں تو اس خوبی کا فائدہ اٹھاتا ہوں کیونکہ میں نہ صرف اپنے ملک کے متعلق بات کرتا ہوں بلکہ میں اپنی عوام کے متعلق لکھتا بھی ہوں۔ میرے اندر کا سفیر اور لکھاری مختلف کلچرز کے مابین دوستی اور امن پیدا کرنے کے لئے کام کرتے ہیں۔ رومانین کلچر کے پیغام کو پھیلنے کے ساتھ ساتھ میں دوسرے کلچرز کے متعلق جان کر بھی بہت لطف اندوز ہوتا ہوں۔ مجھے ان ممالک کے مابین دوستی قائم کرنے کا موقع بھی ملتا' جہاں مجھے جانے کا اتفاق ہوتا ہے۔ مجھے لکھتے رہنا اچھا لگتا ہے۔ سفارت کی دنیا میں آنے سے پہلے میں ایک صحافی کے طور پر کام کرتا تھا۔ اپنے سفارتی معاملات کو صحافتی انداز سے استعمال کرنے کا تجربہ بڑا شاندار رہا۔ میں اپنے ملک میں نو سال تک صحافی کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ میں سفارت اور صحافت کے مابین ایک بڑے قریبی رشتے کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔ دونوں پیشے انسانی طبقے کی بہتری کے لئے کوشاں ہیں۔ اور دونوں عوام کے درمیان امن و دوستی کے رشتے کو پائیدار بنانے میں ایک بھرپور کردار ادا کر سکتے ہیں۔

سوال: ہمیں اپنی کتاب ''تہذیبوں کے مابین مکالمہ: علامہ اقبال اور میہائی امینسکو (Dialogue between Civilisations: Allama Iqbal and Mihai Eminsescu) کے متعلق بتائیں۔

ڈاکٹر ایمل: میری توجہ کا بنیادی مرکز مختلف ممالک کے قومی ہیروز کے درمیان مماثلت کی نشاندہی کرنا ہے۔ میں پاکستان کے شاعر-فلاسفر علامہ اقبال کا بہت بڑا مداح ہوں۔ کیونکہ وہ ایک تخیل پرست شخصیت تھے۔ ماضی کا خیال رکھنا تو بالکل درست ہے مگر اس سے بھی زیادہ اہم یہ ہے کہ مستقبل میں جھانکا جائے۔ جو کہ ہمارے ہیروز نے کیا۔ میں نے اقبال کے تراجم پڑھے ہیں اور ان میں اور اپنے قومی شاعر میہائی امینیسکو کے درمیان بہت سی مماثلتوں کو پایا ہے۔ انہوں نے کبھی مکمل انسان ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور نہ ہی یہ کہا کہ ہمارے پاس کوئی خاص روحانی طاقت ہے۔ مگر ان کی زندگیاں ایسے روشن

افکار کا مرقع تھیں جس کی بدولت رومانین اور پاکستانی سدا اپنے قومی تشخص اور مٹی کی عظمت پر فخر کرتے رہیں گے۔ ان لوگوں نے اپنی زندگیاں بلند نظریات اور آزادی و انصاف کے اصولوں کی ہمہ گیر اہمیت کو اجاگر کرنے کے لئے وقف کر دیں۔ تا کہ ہماری روحوں میں، بحیثیت عوام ایک خود اعتمادی پیدا کر سکیں جو کہ ہم میں قومی مقصد کے جذبے کو بحال رکھے اور ہم میں اور ہمارے ملکوں میں اعتماد کی فضا کو سرگرم رکھے۔ میں یہاں رومانین ڈرامہ نگار یوجین جویسکیو (Eugene Jovescu) کے الفاظ پیش کرنا چاہوں گا۔ وہ کہتا ہے کہ "میرا نام اور میرا کام ہمیشہ انسانوں ہی سے متعلق رہا ہے اور میں نے ہمیشہ انسانوں کی بدصورتی اور کج روی پر ہی لکھا ہے۔ تا کہ اس مخلوق کا پوشیدہ اور ذلت آمیز حصہ بھی دیکھا جا سکے اور لوگ یہ جان سکیں کہ یہ ان میں موجود ہے۔" اس کے ان الفاظ نے مجھے بہت متاثر کیا۔ وہ تمثیلی تھیٹر کا بادشاہ کہلاتا تھا اور اسے "تھیٹر کی بغاوت" کے خطاب سے نوازا گیا۔

سیمویل ہنگٹن (Samuel Hutington) کے نظریہ "تہذیبوں کا ٹکراؤ" (Clash of Civilizations) نے مجھے اپنی اس کتاب پر کام کرنے کے لئے اکسایا۔

میں نے مضامین اور کالمز کے ذریعے تھوڑا بہت لکھا۔ فلپائنز اور آرگے (Phillippines and Uruguay) میں اپنے قیام کے دوران مجھے تراجم پر اعزاز سے نوازا گیا۔ میں نے 1998ء میں جوز ریزل (Jose Rizal) کے مینلٹمو ایڈو (آخری خدا حافظ) Minltimo Edios کو رومانین زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ایک تختی طور پر محفوظ ہے اور منیلا کے فورٹ سینٹگیو میں ریزل شیرائن پر محفوظ ہے۔ میں دوسری جنگ عظیم میں ان سو سے زائد رومانین فوجیوں کے متعلق معلومات بھی حاصل کرنے کے لئے پہنچا جو فلپائن کی آزادی کے لئے لڑے تھے۔ ان فوجیوں کے نام گمشدہ فوجیوں کی فہرست میں دیکھے جا سکتے ہیں یا ان کتبوں پر جو فورٹ بیفیفیو Fort Bonifacio میں منیلا-امریکن سیمٹری میں موجود ہیں۔

سوال: کیا آپ نے اقبال کے علاوہ کسی اور اردو شاعر یا مصنف کو بھی پڑھا ہے؟

ڈاکٹر ایمل: میں نے فیض، منٹو اور آتش کے تراجم پڑھے ہیں اور اس کے علاوہ میں طارق رحمٰن اور خالد حسن کے مضامین کو شوق سے پڑھتا ہوں۔ اور بھی کچھ مصنفین جیسا کہ غلام عباس، یاسمین حمید اور شفیع عقیل۔ میں افتخار عارف سے بھی بہت متاثر ہوا، جب میں نے اس کا انٹرویو پڑھا۔ میں ان کا مزید کام بھی پڑھنا چاہتا ہوں۔ مگر ان سب سے زیادہ میں اقبال سے متاثر ہوا ہوں۔

سوال: میرا خیال ہے، آپ مصور بھی ہیں۔

ڈاکٹر ایمل: میرے تصور میں جو بھی آیا، میں نے رنگ اور برش پکڑ کر تصویریں بنانا شروع کر دیں۔ جب میں منیلا میں تھا، تو ان تصاویر کی فروخت سے حاصل کردہ رقم جس میں میری بیوی اور بیٹی کی تصاویر بھی تھیں،

دریائے پیسگ (Pasig River) کی صفائی میں صرف ہوگئیں۔ لیکن میں نے دریافت کیا کہ اس کا نفاذ اس قدر آسان کام نہ تھا۔ مصوری سے مراد روزانہ سینکڑوں برشوں کا استعمال ہے جو کہ کئی روز تک جاری رہتا ہے۔ میں پاکستانی آرٹسٹ چغتائی اور استاد اللہ بخش کے کام سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ میں جب بھی لاہور کے عجائب گھر میں جاتا ہوں' ان کے کام سے بہت لطف اندوز ہوتا ہوں۔

سوال: پاکستان میں اپنے قیام کے متعلق کچھ کہنا چاہیں گے' ہمارے لئے کوئی پیغام............؟

ڈاکٹر ایمل: میں ان دو ممالک میں بہت سی مماثلتوں کی نشاندہی کرنا چاہوں گا جو کہ صرف عام سی مماثلتیں نہیں ہیں۔ یہ دو تہذیبوں کے مابین ایک پل کی سی حیثیت رکھتی ہیں۔ میرا یہاں پر قیام انتہائی شاندار رہا کیونکہ لوگوں کا رویہ بہت اچھا تھا۔ پاکستانی بہت حد تک رومانیز کے مانند ہیں۔ کیونکہ دونوں ہی محبت کرنے والے' سخی اور ہمدرد ہیں۔ وسطی یورپ کی ایک ابھرتی ہوئی جمہوریت رومانیا' اٹلانٹک کوسٹ اور ارل (Urab) کے درمیان ہے جو کہ اکویٹرا اور قطب شمالی کے بیچ میں واقع ہے۔ رومانیا اب ایک وسیع ملک ہے۔

رومانین موسیقی بھی پاکستانی موسیقی کے مانند عوام کی روحوں کے قریب تر ہے۔ یہ موسیقی خوشی و اداسی کے جذبات سے مرقع ہے جو کہ عوام کی زندگی کے اتار چڑھاؤ کی آئینہ دار ہے۔ رومانیہ میں بھی ایک بھرپور کلچر موجود ہے ایک جاندار تاریخ نے مختلف اثرات کو یکجا کرتے ہوئے ترتیب دیا ہے۔

(میں نے بھی اسی قسم کے تنوع کو پاکستان میں محسوس کیا ہے۔ کیلاش کے کافر آریائی نقش ونگار کے ہمراہ مگر قبیلے منگولوں جیسے' ترک اور یونانی نقش ونگار جو کہ سکندر اعظم کے حملوں کی یاد دلاتے ہیں)

ادب میں شاعر-فلاسفر میہائی ایمنسکیو (Mihai Eminescu)' ڈرامہ نگار کریجائل Caragiale اور یوجین لونیسکو Eugene Imescue مشہور لکھاری مرکیا ایلیڈ (Mircea Eliade) اور ایمل کیرون Emil Cioran نے بڑا کام کیا ہے۔ میں اس آفاقی پیغام کے ساتھ اپنی گفتگو سمیٹنا چاہوں گا اور یوجین لونسکو (Eugene Lonescu) کا یہ پیغام تاریخ کی ایک سنہری کہاوت بن چکی ہے۔ ''برگد کے بڑے درخت کے سائے تلے' کوئی اور درخت نہیں اگ سکتا۔''

تیرے ''خوف'' دائیں اعتبار مینوں

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

بعض لوگ واقعی اتنے بہادر ہوتے ہیں کہ اپنی بیوی تک سے نہیں ڈرتے۔ ہم بچپن میں ٹیپو سلطان کی ایک مخصوص تصویر بازاروں میں جگہ جگہ دیکھتے تھے جس میں وہ اپنے خنجر کی مدد سے شیروں کے ساتھ نبرد آزما ہوتا تھا۔ ممکن ہے یہ معرکہ کبھی حقیقت میں بھی پیش آیا ہو لیکن بندوق کے ذریعے شیر کا شکار تو کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ بڑے بڑے بادشاہوں' شہزادوں اور راجوں مہاراجوں سے لے کر اپنے جسیم الدین خان تک یہ کارنامے انجام دے چکے ہیں۔

ہمیں ایک شکاری کے گھر جانے کا اتفاق ہوا جن کا نام چنگیزی تھا۔ ان کے ڈرائنگ روم میں ایک بڑی سی فریم شدہ تصویر ٹنگی ہوئی تھی جس میں وہ شکاری کا لباس پہنے بندوق کاندھے پر ڈالے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کا ایک پیر زمین پر اور دوسرا اس شیر کے مردہ یا نیم مردہ جسم پر تھا جو زخمی حالت میں زمین پر پڑا ہوا تھا۔ تصویر کے ساتھ ہی ثبوت کے طور پر ایک بندوق دیوار پر لٹک رہی تھی۔

ہم نے ان سے پوچھا ''یہ تصویر کہاں سے بنوائی ہے؟''

ہمارے اشارے کو کچھ کچھ سمجھتے ہوئے قدرے ترش لہجے میں بولے ''بنوائی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

ہم نے رفع شر کی غرض سے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا ''ظاہر ہے' تصویر بنوائی جاتی ہے' بنی بنائی تو نازل نہیں ہوتی۔''

انہوں نے پہلے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر مسکرائے۔ اور یوں گویا ہوئے۔ ''یہ شیر میں نے سندر بن میں ''بقلم خود'' مارا تھا۔ بڑا سخت جان تھا۔ جس وقت یہ تصویر بنی تھی اس وقت تک زندہ تھا۔ اگر میں ٹانگ سے دبا کر نہ رکھتا تو کھڑا ہو جاتا۔''

ہم نے عرض کیا ''چنگیزی صاحب' ایک بات ہماری سمجھ میں آج تک نہیں آئی۔''

روکھے لہجے میں بولے ''ہاں وہ بھی سمجھ لیجیے۔ ویسے چائے پئیں گے؟''

ہم نے کہا'' آپ پلائیں اور ہم نہ پییں؟ منگوا لیجیے۔''

ہم سے چائے کی یقین دہانی حاصل کر کے انہوں نے نوکر کو بلا کر حکم دیا ''شرفو' ان کے لئے چائے اور میرے لئے جوس کا گلاس لے کر آؤ۔''

ہمیں اس طرح شکار کر لینے کے بعد جب وہ دوبارہ ہماری طرف متوجہ ہوئے تو ہم نے گفتگو کا سلسلہ پھر سے شروع کرتے ہوئے کہا'' کئی ایک باتیں ناقابل فہم ہیں مثلاً اس قسم کی ہر تصویر میں شکاری کا بایاں پیر ہی کیوں بے چارے نیم مردہ شیر کے جسم پر ہوتا ہے؟ تمام شکاریوں کا لباس ایک جیسا ہی کیوں ہوتا ہے اور وہ سب فیلٹ ہیٹ، کیوں پہنے ہوتے ہیں؟ بندوق سب کے سیدھے کاندھے ہی پر کیوں ہوتی ہے؟ شیر کا سر مغرب ہی کی جانب کیوں ہوتا ہے؟ تمام تصویروں میں ارد گرد کا ماحول ایک جیسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا ہر شکاری اپنے ساتھ ایک فوٹوگرافر لے کر چلتا ہے؟''

ہمارے ان تمام سوالوں کا انہوں نے ایک ہی جواب دیا۔ نہایت بے مروتی کے ساتھ آنکھیں پھیرتے اور نتھنے پھلاتے ہوئے بولے'' آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

ہم نے ان کے خطرناک موڈ کو بھانپ کے کہا'' ہمارا مطلب یہ ہے کہ بعض اتفاقات بڑے عجیب و غریب ہوتے ہیں۔ ایسا ہی اتفاق ہمارے ایک دوست کے ساتھ ان کی جوانی ایک تصویر میں ہوا تھا جس میں انہوں نے اپنی پسندیدہ ایکٹریس مدھو بالا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ رکھا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ ہم مدھو بالا کو اسی زاویے سے ایک تصویر میں دلیپ کمار کی بانہوں میں سمٹے دیکھ چکے تھے۔''

چنگیزی صاحب نے ایک نگاہ غلط انداز ہم پر ڈالی اور کچھ بولے بغیر بندوق کی طرف بڑھے۔ ہمارا جسم ٹھنڈا پڑ گیا۔ ہم پیچھے مڑ کر بھاگنے ہی والے تھے کہ وہ تصویر کا فریم اٹھا کر لے آئے اور شکار کی تفصیلات سمجھانے لگے جنہیں ہم فرمانبردار فرزند ارجمند کی طرح سنتے رہے۔

آپ مانیں یا نہ مانیں' ہمارے خوف کا ایک ٹھوس جواز تھا۔ جان کسے عزیز نہیں ہوتی؟ لیکن برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کے انتخابی حلقے درہام (Durham) میں واقع ان کی رہائش پر متعین اس پولیس والے کے خوف کا جواز آپ اس خبر میں تلاش کیجئے جو گزشتہ ہفتے برطانوی اخبارات میں شائع ہوئی۔ خبر کے مطابق وزیراعظم کے گھر کی چوکی پر مامور 28 افراد کے عملے کا ایک رکن رات کے وقت ڈیوٹی پر تھا کہ اسے لان کے ایک تاریک کونے میں سے سرسر کی آوازیں آئیں۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ کوئی گھات میں ہے۔ کراچی کی زبان میں پولیس والے نے آسرا نہیں کیا اور مشین گن سنبھال کر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ چند لمحوں بعد یہ اطمینان کر لینے پر کہ تمام حملہ آور ڈھیر ہو چکے ہیں اس نے اپنے تمام ساتھیوں کو فاتحانہ انداز میں پکارا اور خطرے کے سائرن بجا دیے۔ جب روشنی ہوئی تو لان میں چند معصوم لاشیں دیکھ کر ہر شخص کف افسوس ملنے لگا۔۔ یہ'لاشیں' لان میں رہائش پذیر کبوتروں کی تھیں۔

اس واقعہ کی اطلاع ملنے پر سکیورٹی چیف نے پہلے تو متعلقہ اہلکار کو غیر مسلح کیا لیکن پھر تحقیقات کے نتائج اور خود کار کیمروں کی فلم دیکھ کر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس گارڈ کی جگہ جو بھی ہوتا وہ ان حالات میں ضرور خوف محسوس کرتا چنانچہ اسے ڈیوٹی پر مع اسلحہ اور وردی بحال کر دیا گیا۔ سچ ہے' انسان نہ ڈرے تو شیر سے نہ ڈرے اور ڈرے تو بٹیر سے ڈر جائے۔

شیر کے ذکر پر ہمیں پھر ایک شکاری یاد آ گئے جو دوستوں کے جھرمٹ میں بیٹھے ڈینگیں مار رہے تھے۔ کہنے لگے ''ایک دن میں اپنی دو نالی بندوق تھامے شکار کے لئے جنگل میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا کہ اچانک جھاڑیوں میں سے سینکڑوں شیر برآمد ہو گئے۔'' ایک صاحب نے مداخلت کی ''کیا کہہ رہے ہیں حضرت' سینکڑوں شیر؟'' بولے ''ایسے میں گنتی کا کسے ہوش ہوتا ہے لیکن دس بیس تو صاف نظر آ رہے تھے۔'' ایک اور ساتھی نے کہا ''چلیے سینکڑوں سے گھٹ کر دس بیس رہ گئے اب ذرا ذہن پر اور زور ڈال کر بتایئے شیر کتنے تھے؟'' شکاری نے جھینپ کو چھپاتے ہوئے کہا ''میں آپ لوگوں کو کیسے یقین دلاؤں' پانچ تو میں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیے تھے۔'' پہلے والے دوست نے کہا ''لیجیے بات پانچ پر آ گئی۔ آپس کی بات ہے' اب ٹھیک ٹھیک بتا دیجیے شیر کتنے تھے؟''

شکاری صاحب دوستوں کے تیور بھانپ چکے تھے۔ کھنکھارتے ہوئے بولے '' آپ لوگ خود سمجھ دار ہیں۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے اگر شیر ہو اور وہ بھی ببر شیر' تو کیا وہ اکیلا ہی سینکڑوں کے برابر نہیں ہوتا؟''

یہ سن کر ایک صاحب جو اب تک خاموش بیٹھے ہوئے تھے رازدارانہ انداز میں شکاری صاحب سے مخاطب ہوئے ''بھائی صاحب' یہ دوستوں کی محفل ہے۔ بات باہر نہیں جائے گی۔ بس اب یہ بتا دیجئے کہ شیر تھا بھی یا نہیں؟''

شکاری نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا ''قسم خدا کی پتوں کی کھڑکھڑاہٹ تو یہی بتا رہی تھی کہ جھاڑیوں کے پیچھے شیر موجود ہے۔''

٭.....٭.....٭

ایک مختصر عشقیہ داستان

ازھر منیر

المناک انجام کی حامل یہ عشقیہ داستان بیان کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ مجید مائنس کا مختصر الفاظ میں تعارف کرا دیا جائے۔

مجید مائنس کا اصل نام عبدالمجید طاہری قادری نقشبندی تھا۔ لیکن ایک بار وہ ایک ایسے ٹیسٹ میں شریک ہوا جس میں درست جواب کا ایک نمبر ملتا تھا تو غلط جواب کا ایک نمبر کٹ بھی جاتا تھا۔ یعنی مائنس مارکس ملتے تھے۔ مجید نے معلوم نہیں کتنے سوالوں کے درست جواب دیئے اور کتنوں کے غلط' تاہم کل درست جوابوں سے اس کے بارہ غلط جواب زیادہ تھے۔ یوں ٹیسٹ میں اس کا ٹوٹل مائنس 12 رہا۔ تاہم مجید نے خیال کیا کہ شاید اس ٹیسٹ میں رسم ہی مائنس مارکس دیئے جانے کی ہے چنانچہ اس نے امتیاز سے جو اس کے ساتھ اس ٹیسٹ میں شریک ہوا تھا' پوچھا "تم نے کتنے مائنس مارکس حاصل کیے ہیں؟" اس روز کے بعد سے اس کے نام کے ساتھ مائنس کا لفظ یوں تواتر سے استعمال کیا جانے لگا کہ یہ اس کے نام کا ایک لازمی جزو بن گیا اور مائنس کا عبدالمجید طاہری قادری نقشبندی اب مجید مائنس کے نام سے پہچانا جانے لگا جسے کلیے کی صورت میں ایم سکوئیر (M^2) اور بعض اوقات اس میں اس کے خاندانی پیشے اور ذات (لوہار ترکھان) کو شامل کر کے ایم سکوئیر ایل ٹی (M^2LT) بھی لکھا اور پکارا جانے لگا۔

ذیل میں اس کے جس عشق کا احوال بیان کیا جا رہا ہے وہ مجید مائنس کا شیلا ہی سے نہیں کسی بھی لڑکی سے پہلا عشق تھا جو اس کے دوست مل جل کرا سے کرانے لگے تھے۔

مجید کا عشقیہ کیریئر (career) اگرچہ اس کے نام کی طرح مائنس تو نہیں تھا لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اسے پلس بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اس نے کچھ عشق ضرور کیے مگر یہ سب پچاس فی صد والے کیس تھے۔ یعنی ان میں وہ تو راضی تھا مگر وہ لڑکیاں جن پر وہ عاشق ہوا راضی نہیں تھیں۔ تاہم معاملے کو زیادہ پیچیدہ بنانے والی بات یہ تھی کہ وہ جن لڑکیوں پر عاشق ہوتا تھا انہیں اس سانحے کی اطلاع نہیں دیتا تھا جس کی وجہ اس میں جرات کا ازلی فقدان تھا۔ جبکہ جن دو ایک خواتین کو اس نے ہمت کر کے خط کے ذریعے اس سانحے یعنی ان پر اپنے عاشق ہو

جانے کی اطلاع دینا چاہی' وہ اس کی شاعری کے ذوق کی بنا پر اس سے باغی ہو گئیں۔

معلوم نہیں کس نے اس کے دماغ میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ جب کسی لڑکی کو خط لکھا جائے تو شروع میں شعر لکھنا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ جب رفیقہ کو محبت نامہ لکھنے بیٹھا تو یہ مرحلہ تو جیسے تیسے طے ہو گیا مگر شعر کا انتخاب مسئلہ بن گیا۔ بہت سوچنے کے باوجود جب اسے کوئی اور شعر یاد نہ آ سکا تو اس نے یہ شعر تحریر کر دیا:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی

اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اس شعر کا رفیقہ پر وہی اثر ہوا جو اس قسم کے اشعار کا کسی بھی نیک بی بی پر ہو سکتا ہے چنانچہ اس نے خط کا باقی ماندہ حصہ پڑھنے کے بجائے اسے الماری کے کسی کونے میں سنبھال کر رکھ دیا جبکہ خود وہ نیک سے نیک تر ہو گئی۔ تاہم ظاہر ہے مجید کے من کی مراد پوری نہ ہو پائی۔

پھر کسی نے اسے سمجھایا کہ بے شک یہ بہت اچھا شعر ہے جو اس نے لکھا ہے بلکہ اس سے اچھا کوئی اور شعر ہونا ممکن ہی نہیں مگر یہ اس کے مجوزہ ایجنڈے اور مقاصد کے لئے کسی طور موزوں نہیں۔ اس لئے کہ اس قسم کے اشعار پڑھ کر کوئی لڑکی نیک اور صالح تو ہو سکتی ہے مگر اس کا مجید کے دام محبت میں آنا ممکن نہیں۔ لہٰذا وہ اس کے بجائے کوئی ایسا شعر لکھے جس میں محبت اور جذبات کا رچاؤ ہو اور چونکہ رفیقہ اب اس مقصد کے لئے موزوں نہیں تو اسے چاہئے کہ وہ اس سلسلے میں کسی اور لڑکی کو ٹرائی کرے۔

مجید مائنس کی عقل میں یہ بات آ گئی چنانچہ جب کئی ماہ بعد شیرینہ کو محبت نامہ لکھنے کا موقع آیا تو اس نے پابلو نرودا کی ایک نظم' جو اس نے انہی دنوں کسی رسالے میں پڑھی تھی' کی یہ دو سطور تحریر کر دیں:

میں تمہارے ساتھ وہی کرنے کا خواہش مند ہوں

جو بہار نے چیری کے درختوں کے ساتھ کیا تھا

بدقسمتی سے شیرینہ کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ بہار نے چیری کے درختوں کے ساتھ کیا کیا تھا اور جب اس نے اپنے دماغ پر زور دے کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ بہار اور ان درختوں کے بیچ کیا معاملہ ہوا ہو گا تو اسے جو بات سمجھ میں آئی اسے سوچ کر اس کا چہرہ شرم اور غصے سے سرخ ہو گیا اور اس کے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے جبکہ اس کے ساتھ اس نے مجید کو کوئی ایسا آوارہ اور لفنگا خیال کیا جو شریف لوگوں کی بہو بیٹیوں کو خراب کرنے کے مذموم ارادے رکھتا ہے۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ اس نے مجید کی محبت کا جواب محبت میں نہ دیا بلکہ ایک روز جب وہ اس کے دیدار کی آرزو لئے اس کی گلی سے گزر رہا تھا تو اپنے کوٹھے سے اس پر پانی سے بھری بالٹی گرا دی جس کے نتیجے میں مجید کے ساتھ اس کی محبت کے جذبات بھی بھیگ کر ٹھٹھر گئے۔ علاوہ ازیں اس نے سوچا کہیں ایسا نہ ہو کہ اگلی بار وہ پانی کی بالٹی کے بجائے بم یا کوئی اور خطرناک چیز گرا دے لہٰذا اس نے شیرینہ سے تعلق بنانے کا خیال ترک کر دیا اور اس روز کے بعد پھر کبھی اس کی گلی میں نہیں گیا جبکہ کسی اور لڑکی کی طرف پیش قدمی کی اسے ہمت نہ

ہو سکی۔ یوں اسکی زندگی بن بہار ہی رہی جواب گذشتہ کئی برسوں سے اسی طور چلی آ رہی تھی۔

گوتم کا تجزیہ یہ تھا کہ مجید کی یہ شدید ترین خواہش ہے کہ اس کا کسی لڑکی کے ساتھ تعلق بنے لیکن وہ اس بات سے ڈرتا بھی ہے کہ کہیں واقعی کسی کے ساتھ تعلق بن نہ جائے۔ یہ بہت پیچیدہ صورت حال تھی اور گوتم کے اکثر تجزیوں کی مانند اس کی کئی پرتیں تھیں جسے سمجھنا آسان کام نہیں تھا۔ جہاں تک خود مجید کا تعلق ہے تو وہ بیان کرتا تھا کہ محلے میں کتنی ہی لڑکیاں ہیں جن میں سے کسی کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں اس کے باوجود جب یہ سنتا ہوں کہ ان میں سے کسی کی شادی ہو رہی ہے تو معلوم نہیں کیوں دل کو بہت تکلیف پہنچتی ہے۔

گفتگو کے دوران جب کسی لڑکی کا ذکر چھڑتا تو جہاں دوسرے اس کے حسن، فگر، ذہنی سطح یا سوشل سٹیٹس کے بارے میں استفسار کرتے وہاں مجید کا پسندیدہ سوال یہ ہوتا:

''کیا اس میں اچھی بیوی بننے کی تمام خصوصیات موجود ہیں؟''

ریاض نے کئی بار اسے یہ بات سمجھانے کی کوشش کی کہ لڑکی میں بیوی بننے کے علاوہ بھی کچھ خصوصیات ہوتی ہیں مثلاً اس کا خوبصورت، سمارٹ اور ذہین ہونا۔ اور پھر جب شادی وغیرہ کا سرے سے کوئی ارادہ ہی نہ ہو بلکہ زندگی میں محض وقتی طور پر رنگینی لانا مقصود ہو تو ایسے سوال یوں بھی مہمل ہو جاتے ہیں۔ تاہم مجید پر اس بات کا کچھ اثر نہ ہوا۔ چنانچہ اس کا یہ سوال ہمیشہ اپنی جگہ موجود رہا اور جب کبھی کسی نئی لڑکی کا ذکر چھڑا' یا اس کے حسن یا شخصیت کے کسی اور پہلو کی تعریف کی گئی تو اس موقع پر اس نے اپنا یہ سوال ضرور دوہرایا۔

چونکہ اس کی زندگی مسلسل بے عشق چلی آ رہی تھی اس لئے سب نے مل کر یہ پروگرام بنایا کہ کسی طرح اس کا کسی لڑکی سے افیئر شروع کرا دیا جائے۔ تلاش بسیار کے بعد جبران نے شیلا کو دریافت کیا جو اس مقصد کے لئے موزوں ہو سکتی تھی۔ جبران نے بتایا کہ مذکورہ لڑکی اس کی ایک کلاس فیلو کی دوست ہے اور اس کی اس ہم سبق کو مجید کے جملہ حالات (جو جبران نے حسب عادت پوری اداکاری اور مبالغے کے ساتھ بیان کئے تھے) کے بارے میں جان کر اس کی حالت پر بے حد رحم آیا ہے اور اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ شیلا کو مجید کے بارے میں بتائے گی جبکہ ادھر جبران مجید کو شیلا کے بارے میں بتائے۔ یوں بلائنڈ ڈیٹ (Blind Date) کے ذریعے وہ ایک روز آپس میں ملیں اور اگر ایک دوسرے کو پسند آ جائیں تو فریقین یعنی جبران اور اس کی کلاس فیلو کو بے حد مسرت ہو گی۔

مجید نے شرماتے ہوئے اور بظاہر نیم دلی سے یہ پروگرام سنا مگر حقیقتاً وہ بے حد خوش تھا اور مسرت تھی کہ چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ لڑکی پوش علاقے کی رہنے والی اور کانونٹ اور کنیئرڈ کی پڑھی ہوئی تھی۔

''جہاں تک شکل وصورت کی بات ہے تو وہ اتنی بری بھی نہیں۔'' جبران نے بتایا ''قبول صورت تو وہ یقیناً ہے میرے خیال میں اسے بہت حد تک خوبصورت بھی کہا جا سکتا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے اس صورت میں جب اس کا موازنہ مجید مائنس سے کیا جا رہا ہو؟'' منظور کاشف نے پوری سنجیدگی سے دریافت کیا۔

اس مرحلے پر مجید مائنس نے حسب معمول اپنا پسندیدہ سوال دوہرایا ''کیا اس میں اچھی بیوی بننے کی تمام خصوصیات موجود ہیں؟''

''فقط اچھی بیوی ہی نہیں اس میں تو اچھی بیوہ بننے کی تمام خصوصیات بھی موجود ہیں۔ تم ہاں کر کے دیکھو۔'' گوتم نے کہا۔

''کیریکٹر کیسی ہے؟'' ناصر نے سرسری لہجے میں دریافت کیا۔

''اے ون قسم کے لوز (Loose) کیریکٹر کی مالک ہے۔'' اطہر نے بتایا حالانکہ اس نے شیلا کا نام ہی آج زندگی میں پہلی مرتبہ سنا تھا۔

تاہم مجید مائنس نے ناصر اور اطہر کا یہ مکالمہ سنا ہی نہیں کیونکہ وہ اپنے اچھے بیوی والے سوال کا جواب پا کر ہی مست ہو چکا تھا اور اسی پل اس نے یہ فیصلہ بھی کر لیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں ضرور قسمت آزمائی کرے گا۔

چنانچہ پروگرام یہ بنا کہ ایک دو ماہ تک دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات بہم پہنچائی جائیں اور پھر ان کی ملاقات کرا دی جائے جس کے دوران دونوں مل کر یہ فیصلہ کر لیں کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کر سکتے ہیں یا نہیں۔ تاہم اس بات کا سختی سے التزام رکھا گیا کہ مجید کا نام عبدالمجید طاہری قادری نقشبندی یا مجید مائنس نہیں بتایا گیا' نہ ہی شیلا کو مائنس والے معاملے کی ہوا لگنے دی گئی۔

ایک مشکل یہ بھی تھی کہ جہاں شیلا کا انگریزی تلفظ اور لب ولہجہ کانونٹ کی فضا میں ڈھلا ہوا تھا اور اسے انگریزی میں بات کرتے دیکھ کر خواہ مخواہ یہ شک ہونے لگتا تھا کہ وہ ابھی ابھی سیدھی لندن سے یہاں پہنچی ہے وہاں مجید کے تلفظ اور لب و لہجے دونوں نے چیچو کی ملیاں میں پرورش پائی تھی اور وہ سجیشن (suggestion) کو سجیشن' کریئر (career) کو کیریئر اور اوکسفرڈ کو آکسفورڈ بول کر اکثر اپنی اور دوستوں کی ہنسی اڑانے کا سامان مہیا کرتا رہتا تھا۔

اس مسئلے کا حل یہ نکالا گیا کہ جب تک دونوں کو ایک دوسرے سے ملنے کے لئے ذہنی طور پر آمادہ کیا جائے گوتم مجید کے انگریزی تلفظ اور لب و لہجے کو ممکن حد تک درست کرنے کی کوشش کرے۔ اس کام میں توقع سے بڑھ کر کامیابی حاصل ہوئی اور مجید جس کا تلفظ اس سے پہلے ایسا تھا کہ پڑھے لکھے لوگ اسے سن کر ہنستے تھے' اس تربیت کے بعد خاصا درست ہو گیا جبکہ اس کا لب ولہجہ تو اس حد تک انگریزوں کے مانند ہو گیا کہ اب وہ شاہ حسینؒ اور بلھے شاہؒ کی کافی کو بھی ''کوفی'' کہنے لگا۔ صورت حال کو توقع سے بڑھ کر اطمینان بخش پا کر ان دونوں کی ملاقات کا دن اور مقام طے کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ شیلا کو مجید کی اور مجید کو شیلا کی تصویر دے دی گئی تا کہ ان کی مدد سے وہ ایک دوسرے کو پہچان لیں۔

مقررہ روز مجید جب اپنی مستقبل کی محبوبہ سے ملنے کے لئے ہم سے رخصت ہونے لگا تو بہت گھبرایا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سب نے اسے تسلی دی اور بتایا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت اور گنجائش نہیں کیونکہ وہ لڑکی سے ملنے جا رہا ہے، اس کی ماں سے نہیں۔

''آخر تم اتنے پریشان کیوں ہو؟'' ناصر نے پوچھا۔

''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس سے کہوں گا کیا؟'' مجید نے ہراساں لہجے میں کہا۔

''یہ کونسی مشکل بات ہے'' قائم نقوی نے کہا ''پہلے تم اسے سلام کرنا۔ پھر اس کا حال احوال پوچھنا اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں کرنا۔''

''اور دیکھو صرف اچھی اچھی باتیں کرنا اور اپنی اوچھی حرکتوں سے پرہیز کرنا۔'' جبران نے تاکید کی۔

پھر سب نے اسے دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا اور وہ شیلا سے ملاقات کی خاطر لارنس گارڈن چلا گیا۔

ان کی ملاقات کے لئے کسی ریستوران کی بجائے باغ کا انتخاب مجید مائنس کی کنجوسی کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا گیا تھا کیونکہ اس کے دوستوں کو خدشہ تھا کہ کہیں ریستوران میں اتنا زیادہ بل نہ آ جائے کہ مجید کی اس ماہ کی ساری بچت اسی کی نذر ہو جائے اور وہ شیلا کی قربت سے لطف اندوز ہونے کے بجائے سارا وقت کڑھتا اور حساب کتاب ہی جوڑتا نہ رہ جائے۔

شیلا کو ماں کے سامنے بہانہ تراشنے میں وقت لگ گیا تھا اور وہ مقررہ وقت سے قدرے تاخیر سے آئی جس کی وجہ سے مجید اور زیادہ پریشان اور ہراساں ہو گیا۔ اس کے علاوہ وہ جب باغ میں آنے والی ایک لڑکی جس پر اسے شیلا کا شبہ ہوا تھا، کے نقوش کا بائیں ہاتھ میں پکڑی شیلا کی تصویر کے ساتھ موازنہ کر کے یہ طے کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ شیلا ہی ہے یا کوئی اور تو عین اس وقت اس کے ساتھی مرد نے جو اس سے پیچھے کچھ فاصلے پر چلا آ رہا تھا، آگے بڑھ کر مجید کو گردن سے ناپ لیا اور اسے خوب اچھی طرح جھنجھوڑا جس کے نتیجے میں اس کا انجر پنجر ہل گیا اور اس نے بمشکل بھاگ کر اس غیرت مآب شخص سے اپنی جان چھڑائی۔ ان وجوہ کی بنا پر مجید جو عام حالات میں بھی تھوڑا بہت کنفیوز رہتا ہے اس وقت اچھا خاصا کنفیوز ہو گیا۔ چنانچہ جب شیلا اس کے سامنے آئی تو اچھی طرح یہ اطمینان کر لینے کے باوجود کہ وہ شیلا ہی ہے، وہ گھبرایا رہا۔ اس گھبراہٹ ہی کی وجہ سے اس نے پہلے تو شیلا کا حال احوال پوچھا لیکن پھر تھوڑی دیر بعد اسے خیال آیا کہ سلام کرنا ضروری تھا جس پر اس نے اسے سلام کر دیا۔ ترتیب الٹ گئی تھی لیکن چونکہ شیلا اپنی ماں کی وجہ سے ذہنی طور پر الجھی ہوئی تھی اس لئے اس نے زیادہ توجہ نہیں دی۔

سلام کے بعد مجید نے ادھر ادھر دیکھا اور جب اسے دور دور تک مالی یا باغ کا کوئی محافظ نظر نہیں آیا تو پاس کی کیاری سے پھول توڑ کر شیلا کے بالوں میں لگا دیا کیونکہ سرکاری باغ کی کیاری سے پھول توڑ کر کسی کے

بالوں میں لگا دینے پر کچھ خرچ نہیں آتا۔ پوش علاقے کی رہائشی ہونے اور کانونٹ اور کلینرڈ میں پڑھنے کے باوجود شیلا کے لئے مجید کی یہ حرکت غیر متوقع تھی چنانچہ وہ قدرے شرمائی اور لجائی اور اس نے اس پر کسی حد تک برا بھی مانا اس لئے کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں ضرورت سے زیادہ بے تکلف ہو رہا تھا۔

تاہم مجید مائنس اس کی سوچوں اور جذبات سے بے خبر اپنی ہی دُھن میں مگن تھا۔ شیلا کے بالوں میں پھول لگانے سے فارغ ہونے کی بعد اسے خیال آیا کہ اب اسے باتیں کرنا ہیں۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا بات کرے کیونکہ دوستوں نے اسے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ صرف اچھی اچھی باتیں کرے اور فضول باتوں سے پرہیز کرے۔ پھر اسے خیال آیا کہ آج صبح ہی اس نے مسجد میں مولوی بشیر کا وعظ سنا تھا اور اس میں اس نے بھی باتیں اچھی کی تھیں۔ چنانچہ اس نے انہی باتوں کو شیلا کے سامنے دہرانا شروع کر دیا۔

''آخرت کی بھی فکر کرنی چاہئے کیونکہ دنیا چند روزہ ہے۔'' اس نے رک رک کر کہنا شروع کیا کیونکہ وہ مولوی بشیر کی کہی باتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''نماز پڑھنی چاہئے اور برے کاموں سے بچنا چاہئے'' مجید مائنس کہتا رہا۔

شیلا اس کی تقریر کے دوران بار بار گھڑی کی طرف دیکھتی رہی اور بالآخر اس نے اعلان کیا کہ اب وہ جا رہی ہے کیونکہ اگر وہ مزید رکی رہی تو اس کی ماں کو اس پر شک ہو جائے گا اور یہ کہ وہ کوشش کرے گی کہ کل اسی وقت اسی جگہ اس سے ملے۔

ملاقات کے بعد مجید جب اس ریستوران میں پہنچا جہاں سب دوست شام کے وقت بیٹھتے تھے اور اس نے ملاقات کی تفصیل سنائی تو سب نے اس پر پھٹکار برسانا شروع کر دی۔

''تمہی نے تو کہا تھا کہ اس سے اچھی باتیں کروں'' مجید مائنس نے بسورتے ہوئے کہا ''تو کیا یہ اچھی باتیں نہیں؟''

''بے شک یہ اچھی باتیں ہیں۔'' اختر نے کہا ''مگر ایسے موقعوں پر کسی اور قسم کی باتیں کی جاتی ہیں۔''

''کیسی باتیں؟'' مجید مائنس نے تھکے تھکے سے لہجے میں پوچھا۔

''ایسی باتیں جن میں محبت کی خوشبو ہو۔'' اختر نے بتایا۔

''اور کچھ شجاعت اور دلیری کا رچاؤ ہو۔'' اطہر نے لقمہ دیا۔

''تمہیں چاہئے تھا پہلے تم اس کو اپنی محبت کا یقین دلاتے'' وارث نے کہنا شروع کیا ''پھر بتاتے کہ تم اس کی خاطر کیا کچھ کرنے کا جذبہ اور ہمت رکھتے ہو اور اگر اسے کبھی کوئی مشکل پیش آئے تو وہ بے جھجک تمہیں مدد کے لئے بلا سکتی ہے اور یہ کہ تم اس کی خاطر ہر کام کرنے کو تیار ہو۔''

''ہر کام سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' مجید نے مشکوک ہو کر پوچھا ''کیا برتن مانجھنا وغیرہ بھی؟''

''تمہاری سوچ اور عقل یہی رہی تو تم ساری عمر برتن مانجھنے ہی میں گزار دو گے۔'' اختر نے دھمکی آمیز

لہجے میں کہا'' ہر کام سے مراد یہ ہے کہ دلیری اور شجاعت کا بڑے سے بڑا کام۔ یا کبھی اس پر مشکل یا افتاد آ پڑے تو تم اس کی مدد کرو گے۔''

''وہ تو میں کروں گا۔'' مجید نے تیزی سے کہا۔

''تو بس یہی بات اسکے سامنے بھی کہہ دو۔'' وارث نے کہا۔

پھر سب دوست دو گھنٹے تک مل کر اسے وہ تقریر یاد کراتے رہے جو اسے اگلے روز شیلا کے سامنے کرنا تھی۔

چونکہ تیاری اچھی ہوئی تھی اور مجید خود میں ایک نیا اعتماد محسوس کر رہا تھا اس لئے آج شیلا سے ملاقات کے دوران وہ بالکل نہیں گھبرایا۔ یہاں تک کہ اس نے سلام کرنے اور حال احوال دریافت کرنے کا کام بھی درست ترتیب سے سرانجام دیا۔ پھر اس نے شیلا کو اپنی محبت کا یقین دلانا شروع کیا۔

''جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے میں آپ سے بے انتہا محبت کرنے لگا ہوں'' مجید نے آموختہ دہرانا شروع کیا۔''اتنی محبت کہ مجنوں نے لیلیٰ سے اور رانجھے نے ہیر سے بھی نہ کی ہوگی۔''

وہ یہیں تک کہہ پایا تھا جب اچانک اسے شیلا کی کلاس کی سوچ اور دوستوں کا رٹایا سبق یاد آ گیا اور اس نے اپنے بیان پر اضافہ کیا''اتنی محبت کہ رومیو نے جیولٹ سے بھی نہیں کی ہوگی۔''

شیلا پر ان باتوں کا خوشگوار اثر ہوا چنانچہ اس نے شرما کر سر جھکا لیا اور گھڑی کی طرف دیکھنا بند کر دیا۔

''اور میں آپ کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لئے بھی تیار ہوں۔'' مجید نے ایک نئے عزم سے بولنا شروع کیا'' آپ کے لئے میں زمانے سے مقابلہ کروں گا اور طوفان سے لڑ جاؤں گا۔''

شیلا جو کل کی ملاقات کے نتیجے میں بہت مایوس تھی اس کی ان باتوں سے بے حد متاثر ہوئی حالانکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ سب جذباتی باتیں ہیں اس کے باوجود اسے یہ سب اچھا لگ رہا تھا اور اس کے ساتھ اس نے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا کہ مجید اتنا برا اور احمق نہیں جس قدر اس نے ابتدا میں خیال کیا تھا اور یہ کہ وہ آئندہ بھی اس سے ملا کرے گی۔

اگلی ملاقات میں شیلا نے نہ صرف اسے اپنا گھر کا ایڈریس اور فون نمبر دے دیا بلکہ ان محفوظ اوقات کے بارے میں بھی بتا دیا جن کے دوران اس کی ماں گھر پر موجود نہیں ہوتی تھی اور کہا کہ مجید اس دوران چاہے تو نہ صرف اسے فون کر سکتا ہے بلکہ اگر کوئی ہنگامی صورت حال پیش آ جائے اور فوری طور پر ملنا ضروری ہو تو اس کے گھر بھی آ سکتا ہے جہاں اس کے علاوہ فقط اس کی ملازمہ ہوگی جو اس معاملے میں اس کی راز دار بھی ہے۔ غالباً پانچویں یا چھٹی ملاقات پہ مجید نے اسے باغ سے باہر کسی جگہ چل کر کھانے پینے کی دعوت دی جسے اس نے کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد قبول کر لیا۔ معاملے کو ماں سے پوشیدہ رکھنے کے لئے وہ گاڑی کے بجائے ییلو کیب میں بیٹھ کر آتی تھی اور اب بھی ییلو کیب ہی میں بیٹھنا چاہ رہی تھی مگر مجید کے اصرار پہ اس کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔

مجید نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی' شیلا پچھلی سیٹ پر بیٹھی اور موٹر سائیکل فرائے بھرنے لگی۔ شیلا کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں' نہ چلنے سے پہلے انہوں نے یہ طے کیا تھا۔ تاہم اس کا خیال تھا کہ شاید کشمیر روڈ پر واقع "لنگ فنگ" چلیں گے جو جوڑوں اور فیملیز کے لئے بہت موزوں جگہ ہے اور جہاں بیٹھ کر سوپ پیا جا سکتا ہے یا آواری میں بیٹھ کر کافی پی جا سکتی ہے۔ لیکن ممکن ہے مجید کا پروگرام یہ نہ ہو بلکہ وہ مال پہ واقع کیتھے یا کم من جانا چاہ رہا ہو یا اس کے بجائے آئس کریم یا برگر کھانے کا پروگرام ہو۔ شیلا دل ہی دل میں اندازے لگاتی رہی جبکہ دوسری طرف مجید موٹر سائیکل کو پوری رفتار سے بھگاتا ہوا مال روڈ سے گزرتا چلا گیا۔ آواری' چائنیز' بیڈن روڈ پر واقع آئس کریم کی دکانیں' اس سے آگے شیزان سب پیچھے رہ گئے۔ شیلا نے سوچا "وائی ایم سی اے کے پاس ایک ریستوران ہے' مجید شاید وہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہو۔"

لیکن مجید وہاں سے بھی پوری رفتار سے گزر گیا۔ چوک کے دائیں ہاتھ پاک ٹی ہاؤس تھا جہاں دوستوں کا یہ گروہ شام کے سمے بیٹھتا تھا اور مجید بھی اس محفل میں گھس آتا تھا۔ تاہم وہ اس چوک سے بھی سیدھا گزرتا چلا گیا۔ اس سے اگلے یعنی ٹولنٹن مارکیٹ کے چوک کا اشارہ کراس کرتے ہوئے مجید نے موٹر سائیکل کی رفتار کم کی تو شیلا نے سوچا شاید وہ کپری یا کبانہ جانے کا پروگرام رکھتا ہو لیکن مجید آگے جانے کے بجائے ون وے توڑتا ہوا چوک سے بائیں ہاتھ مڑ کر پرانی انار کلی میں داخل ہو گیا۔ یہاں اس نے ایک جگہ موٹر سائیکل کھڑی کی اور شیلا کو رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے سامنے دودھ دہی کی دکان کی طرف بڑھ گیا۔ واپسی پر اس کے ہاتھوں میں دو بڑے بڑے پیالے تھے جن میں گرم گرم دودھ تھا۔ اس سے پہلے کہ شیلا صورت حال کو سمجھ پاتی مجید نے ایک پیالہ اس کے ہاتھوں میں تھمایا اور دوسرے کو منہ لگا کر گھونٹ گھونٹ دودھ پینے لگا۔

شیلا ان لڑکیوں میں سے تھی جن کے نزدیک دودھ پینا انتہائی ان رومینٹک بات ہے۔ چنانچہ اول تو وہ دودھ پیتی ہی نہیں ہیں اور پیتی بھی ہیں تو چھپ چھپا کر اور دوسروں کے سامنے کبھی اس کا اقرار نہیں کرتیں۔ جبکہ آج اسے یوں سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر سر عام یہ شرمناک فعل سرانجام دینا پڑا۔ لیکن چونکہ انکار کرنے اور پھر جواباً مجید کے اصرار کے نتیجے میں یوں سڑک پر تماشا بن جانے کا اندیشہ تھا اس لئے اس نے منہ بنا بنا کر آدھا دودھ پیا اور باقی آدھا مجید کو واپس کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک رکشے کو ہاتھ دے کر ٹھہرایا اور مجید کو ہکا بکا چھوڑ کر اس میں بیٹھ کر یہ جا وہ جا۔

مجید نے اگر یہ بات نہ سن رکھی ہوتی کہ کسی کا جوٹھا دودھ پینے سے بھائی بہن کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے تو یقیناً وہ شیلا کا چھوڑا دودھ بھی پی جاتا تاہم چونکہ وہ اسے بہن بنانے کا خواہش مند نہیں تھا بلکہ اس کا ارادہ کچھ اور تھا اس لئے وہ اس سے باز رہا اور دونوں پیالے دوکاندار کو لوٹا آیا۔ یہ شیلا اور مجید کی آخری ملاقات تھی۔

تاہم وہ اگلے روز اور اس کے بعد بھی کئی روز تک لارنس گارڈن میں شیلا کے آنے کا انتظار کرتا رہا اور جب وہ نہ آئی تو اسے فون کیا مگر وہ ہر بار اس کی آواز سنتے ہی فون بند کر دیتی۔ اس کے بعد مجید جب ڈرتا ڈرتا

اس کے ہاں گیا تو اس کی ملاقات ملازمہ سے ہوئی جس نے بتایا کہ شیلا لمبے عرصے کے لئے کسی دوسرے شہر چلی گئی ہے اور یہ پیغام دے گئی ہے کہ واپس آ کر وہ خود مجید سے رابطہ کرے گی اور یہ کہ اب وہ دوبارہ فون کرنے یا تشریف لانے کی زحمت نہ کرے۔ تاہم مجید جب اس کے باوجود نہ ٹلا تو اس نے فوراً گیٹ کے پیچھے رہتے ہوئے اس پر السیشن کتا چھوڑ دیا جس سے مجید نے بڑی مشکل سے بھاگ کر جان بچائی۔

مجید کو پختہ یقین تھا کہ شیلا گھر پر ہی ہے اور اس سے ملنا نہیں چاہ رہی۔ تاہم وہ یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ ملنے سے انکاری کیوں ہے جبکہ اس سے پیشتر اسے اس کے ساتھ ڈرائیو پہ جانے پر بھی اعتراض نہیں تھا۔ اس کے ساتھ وہ دوستوں سے ملنے اور مشورہ کرنے سے بھی کتراتا رہا اور معاملے کو اپنے طور پر سلجھانے کی کوشش کرتا رہا تا کہ اسے ان کی پھٹکار کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تاہم جب کئی ماہ تک کامیابی نہ ہو سکی تو مجبوراً دوستوں کے پاس آ کر اپنا مسئلہ بیان کیا لیکن معاملے کو بگڑے اتنا زیادہ وقت گزر چکا تھا کہ اب اس کا سلجھانا اور مجید کا شیلا سے دوبارہ تعلق قائم ہونا ناممکنات میں سے تھا۔ دودھ پلانے کی بات سن کر سب بالاتفاق اس نتیجے پر پہنچے کہ شیلا اس کی اس گھٹیا حرکت پر ناراض ہو گئی ہے اور اس نے اس سے تعلق توڑ لیا ہے۔ تاہم مجید کا آج بھی یہی خیال ہے کہ یا تو کسی نے شیلا کو اس کے خلاف بھڑکایا ہے یا اسے تعویذ پلا دیئے ہیں جس کے نتیجے میں وہ اس سے ملنا چھوڑ گئی ہے۔

وارث کا کہنا ہے کہ اگر تعویذوں والی بات سچ ہے تو پھر یہ اس دودھ میں ڈالے گئے ہوں گے جو مجید نے شیلا کو پلایا تھا اور جسے پی کر وہ اس سے متنفر ہو گئی تھی اور گوتم اس پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ یہ تعویذ اس دوکان دار نے ڈالے ہوں گے جس سے مجید نے دودھ لیا تھا اور شیلا آج کل مجید کے بجائے اسی شیر فروش کے ساتھ ڈیٹس پر جا رہی ہے۔

o......o......o

خوب صورت لب و لہجے کے منفرد شاعر

حسن رضوی

کی شاعری کا بھرپور انتخاب

خواب سہانے یاد آتے ہیں

ناشر: خزینہ علم و ادب' الکریم مارکیٹ' اردو بازار' لاہور

غیر مشروط محبت: فزیکل سے میٹا فزیکل تک کا سفر

عبیدہ سیّد

گذشتہ دنوں مجھے شاعری کی ایک کتاب پڑھنے کو ملی، جس کا مطالعہ شروع کرنے سے پہلے میں نے ابتدائی اوراق پلٹے۔ میری نگاہوں کے سامنے پہلی فلم چلتی ہے۔

''غیر مشروط محبت''،

''نومبر 2000ء میں پہلا ایڈیشن''،

''تعداد ایک ہزار''،

''سرورق: ریاظ''،

''ہدیہ: فقط نقدِ محبت''

اور پھر نوٹ: ''دوستوں کے لیے شائع کی جانے والی خصوصی اشاعت''۔

ناشر: ملٹی میڈیا لاہور

کتاب کا مطالعہ شروع ہوتا ہے۔ کتاب کے بارے میں لکھی گئی تحریریں کتاب کے وجود کا حصہ محسوس ہوتی ہیں۔ ان تحریروں اور اظہر غوری کی نظموں کا مطالعہ مکمل ہوتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی محبت کی سچائی پر میرا یقین، یقینِ کامل میں ڈھل جاتا ہے۔

دراصل محبت، خواب اور حقیقت کے درمیان کا لمحہ ہے۔ یہ لمحہ جذبے کا قائم مقام ہے۔ لیکن جب اِسے شرائط کے تابع کر دیا جائے تو اِس کا درجہ کم ہونے لگتا ہے، اور جذبہ دھیرے دھیرے مدھم پڑتا چلا جاتا ہے۔

پہلی فلم دوبارہ میری نگاہوں کے سامنے چلنے لگتی ہے۔

خصوصی ایڈیشن: تعداد ایک ہزار

ایسا کیوں ہے؟ صرف ایک ہزار۔۔۔ میں سوچتی ہوں: پہلا ایڈیشن کئی ہزار۔

پہلی فلم سہ بارہ چلتی ہے:

ہدیہ۔۔۔ واقعی ہدیہ، بہت معقول ہے۔

نوٹ۔۔۔ دوستوں کے لیے۔۔۔ اظہر غوری تو بڑا خوش قسمت ہے۔ اس کے دوستوں میں نو سو

ننانوے اور بھی ہیں۔

حضرت علیؓ کا قول ہے: جس شخص کے دوست ہوں، وہ کبھی غریب نہیں ہوتا۔ اور دوست بھی کتنے؟ مزید نو سو ننانوے۔

اب میں ناشر کی محبت کا کیا کہوں؟ ایسے لوگ بھی ہیں، جو محبت کی اشاعت بھی محبت سے کرتے ہیں۔

میرا ایمان ہے کہ زندگی کی سب سے بڑی صداقت محبت ہے۔ اسی سے زندگی میں سکون ہے، اور یہی زندگی کا سکون ہے، یہی زندگی کی صدا، یہی زندگی کی روشنی، اور یہی زندگی کا یقین۔

محبت کا عمل بہ یک وقت ایک جانا اور ایک اَن جانا عمل ہے۔ یہ خود کو خود کے اتنا قریب لے آتا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے انسان خود سے سینکڑوں کوس دور نکل گیا ہے۔ اُسے اپنی ذات ثانوی محسوس ہونے لگتی ہے، اور اس کی جُڑت پوری کائنات کے ساتھ، کہ وہ سب کے بارے میں ویسا ہی سوچتا ہے، جیسا خود اپنے بارے میں۔

میں سوچتی ہوں: اگر ہماری محبت کے ساتھ حسنِ عمل اور صداقتِ عمل بھی شامل ہو جائے، تو ہم سے بڑا غنی، دنیا میں کون ہوگا؟ ہم کسی کے آگے جھولی کیوں پھیلائیں گے؟ ہمیں ایسا کرنے کی ضرورت ہی کیوں پیش آئے گی؟

واضح رہے کہ محبت کے ساتھ اگر حسنِ عمل اور صداقتِ عمل بھی شامل ہو جائے، جس کا میں نے ذکر کیا ہے تو محبت کی جو صورت ہمارے سامنے آئے گی، اسے ہی ہمارے اس شاعر نے ''غیر مشروط محبت'' کا نام دیا ہے۔ دو صد بتیس نظموں کے اس مجموعے میں کوئی نظم بعنوان ''غیر مشروط محبت'' نہیں ملتی۔ لیکن یہ ایک ایسا عنوان ہے جو اس مجموعے کی ہر نظم کے ساتھ معنوی طور پر پیوست نظر آتا ہے۔ اظہر غوری کی ایک نظم ''کائنات'' کے عنوان سے ہے، جس کا ذیلی عنوان حافظ کا یہ شعر ہے:

خلل پذیر بود ہر بنا کہ می بینی

بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است

حافظ نے بھی اس شعر میں جس محبت کی بات کی ہے، وہ یقیناً وہی محبت ہے، یعنی غیر مشروط محبت۔ ایسی محبت جس کی بنیاد پر کوئی بھی عمارت اٹھائی جائے مستحکم اور پایدار ہوتی ہے۔ جب کہ باقی تمام بنیادیں غیر مستحکم اور ناپایدار ہوتی ہیں۔ یقیناً حسنِ عمل اور صداقتِ عمل کے ساتھ ہی محبت، ایسی محبت میں ڈھلتی ہے، جسے شاعر نے غیر مشروط محبت کا نام دیا ہے۔

''غیر مشروط محبت'' کی تمام نظمیں ایک ہی کڑی میں پروئی ہوئی ہیں۔ اور ان میں ایک ترتیب بھی قائم کی گئی ہے۔

یہ تمام نظمیں تین حصوں میں تقسیم کی گئی ہیں، تینوں حصوں میں محبت کا موضوع بتدریج پھیلاؤ کے

ساتھ آگے بڑھتا ہے، اور کتاب کے تیسرے حصے یعنی فصلِ واصل میں اپنے منطقی انجام تک پہنچتا ہے، جو دراصل غیر مشروط محبت کی منزل ہے۔

اب چند باتیں نظم کی ہیئتوں کے بارے میں: شاعر نے اس کتاب میں اپنی تمام تر توجہ موضوع اور موضوع کے منطقی ارتقا پر رکھی ہے اسی لیے اُس نے اپنی ضخیم کتاب میں ہیئت کے اعتبار سے کسی تقسیم کو روا نہیں رکھا۔ نثری، اور غیر عروضی ہیئت کے لیے شاعر نے کوئی الگ حصہ مخصوص نہیں کیا، اسی طرح سے نظمِ آزاد اور نظمِ معریٰ کے لیے الگ گوشہ مخصوص نہیں کیا۔ اور تو اور، اُس نے اپنی غزلوں کو بھی اسی ترتیب میں جگہ دی ہے، جہاں اُنھیں موضوعاتی سطح پر ہونا چاہیے تھا۔

نثری شاعروں کا کوئی جواز ہے یا نہیں میں اس بحث میں پڑے بغیر یہ بات کہنا چاہوں گی کہ اگر آپ اس ہیئت کے ساتھ اتفاق نہیں کرتے تو بھی ''غیر مشروط محبت'' میں پابند شاعری کی اتنی مقدار ضرور موجود ہے جو پابند شاعری کی کسی بھی اعلیٰ کتاب میں عام طور پر موجود ہوتی ہے۔

میں نے اظہر غوری کی نظموں کا مطالعہ کیا، اور ایک محسوسات کی دنیا میرے سامنے اُتر آئی، اور جسے میں نے اپنے اردگرد پھیلتا ہوا محسوس کیا۔ میں اس کی شاعری کا مزید تجزیہ کرنا چاہتی ہوں، لیکن یہ مجھ سے بن نہیں پڑتا، بس میں تو قوسِ قُزح کے رنگوں میں خود کو ڈوبا ہوا پاتی ہوں۔ میرے چاروں جانب پھولوں کی کیاریاں ہیں، ایک سرمئی شام میرے دل میں اترتی ہے، اور آہستہ آہستہ ہر سمت پھیل جاتی ہے۔ چاندنی چٹکتی ہے۔ پورا چاند میرے آنگن میں اترتا ہے۔ محبت کی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کر دیتی ہے۔ یہ کیسی مہک ہے، جو میرے سارے وجود میں رچ بس جاتی ہے۔ یہ ایک سفر ہے، فزیکل سے میٹا فزیکل تک کا۔ لگتا ہے، زندگی کی تکمیل ہو رہی ہے۔ یہ کیسا سحر ہے؟ اس سے آزاد ہونا میرے بس میں تو نہیں۔ شاید کسی اور کے بس میں ہو!!!

صابر رضا کا ''خزاں دریدہ بدن''

کرن رباب نقوی

''خزاں دریدہ بدن'' ہاتھ میں لیتے ہی ایک خوشگوار حیرت کا احساس ہوتا ہے۔ آج کل کے اس شوخ اور مصنوعی رنگوں سے جگمگاتے اور جھلملاتے دور میں ایسے میٹھے اور روح میں اتر جانے والے رنگوں سے سجا ٹائٹل۔ جس کو دیکھتے ہی جہاں آنکھوں کو سکون ملے وہاں دل میں کہیں دور کچھ کھو جانے کا احساس نمایاں ہونے لگے۔ ایسے خوبصورت ٹائٹل کے بعد شاعری بھی آپ کو مایوس نہیں کرے گی۔ اس لئے کہ ٹائٹل میں سجے یہ متین رنگ شاعری میں بھی جا بجا اسی رعنائی کے ساتھ بکھرے نظر آتے ہیں۔

روسو کی مشہور خودنوشت ''Confession'' اس کلاسیک جملے سے شروع ہوتی ہے:

''If I am not better than others at least I am different;''

''خزاں دریدہ بدن'' کو پڑھ کر بھی یہی احساس جاگتا ہے کہ جیسے شاعر اپنے عہد کی اکیلی آنکھ ہے۔ جو صعوبتوں کے تمام صحراتن تنہا عبور کر رہا ہے۔ جا بجا خواہشات کے سیراب اسے دکھائی دیتے ہیں جنہیں وہ چھونا تو چاہتا ہے لیکن صرف محسوس کر پاتا ہے کہ وہ دائرہ اختیار سے باہر ہیں۔ ایسے میں لفظوں کا سہارا ہی غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ یہ لفظ شام ڈھلتے ہی جگنوؤں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جن کی روشنی میں وہ مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔ فطرت اس کی رہنمائی کو تیار تو ہے لیکن راہ کی کٹھنائیاں بہرحال اسے اپنی ذات پر سہنی ہوں گی۔ یوں شاعر ایک سراب سے سیراب ہونے کی نادان خواہش دل میں لئے آگے کو رواں دواں ہے۔

''خزاں دریدہ بدن'' صابر رضا کی گیارہویں کاوش ہے۔ اس سے قبل وہ شاعری کے علاوہ ناول اور افسانچوں کے میدان میں بھی طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ صابر رضا کی شاعری ان کی فطرت کی صحیح عکاس ہے۔ اور درد کے جو پتھر ان کی شاعری میں جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں وہ انہوں نے اپنی ذات پر سہے ہیں۔ اور وہ کتنا بھی اس درد کو آفاقیت کا لبادہ اوڑھا دیں ان کی ذات کا درد بہرحال اپنا آپ نمایاں کرنے میں کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔

سلیم احمد کہتے ہیں:

''شاعری کا مواد انتہائی خارجی شاعری میں بھی کسی طرح شاعر کی داخلیت کا حصہ ہوتا ہے۔''(۱)

صابر رضا کے لفظ بھی ان کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔ جو ان کی ذات کو پرت در پرت قاری کی سامنے کھولتے چلے جاتے ہیں۔ کتاب کا آغاز تین روح پرور نعتوں اور ایک لہو گرما دینے والی منقبت سے ہوتا ہے۔ مولا علیؑ مشکل کشا کی شان میں دس اشعار کی ایک خوبصورت منقبت جس نے ان کے شفاف آئینہ دل میں بسی عقیدت و محبت کو مجسم سامنے لا کھڑا کیا ہے۔

صدق حق و یقیں علیؑ حیدر
میرے کیا کیا نہیں علیؑ حیدر

اور ہوں گے سہارے لوگوں کے
میرے دنیا و دیں علیؑ حیدر

گر ترا نام لے کے آئے تو
موت ہو گی حسیں علیؑ حیدر

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کہتے ہیں:

''غزل زمانے کے ساتھ جلد جلد نہیں بدلتی اور نئے نئے موضوعات اور نئی نئی چیزوں کو آناً فاناً قبول نہیں کرتی بلکہ آہستہ آہستہ اور پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی ہے اور زمانے کی برق رفتاری کے پیچھے خراماں خراماں چل کر آتی ہے۔''(۲)

صابر رضا کی شاعری نے بھی زمانے کے اثرات قبول کیے ہیں اور پھر انہوں نے ان کا اظہار بھی نہایت خوبصورت لفظوں کے پیرائے میں کیا ہے:

نام و نشاں جو مٹ گیا شہر تباہ کا
تو پھر وہ سیلِ آب کنارے سے آ لگا

جس کو عبور کر کے میں پہنچا تھا گھاٹ پر
پھر سے وہی سراب کنارے سے آ لگا

صابر رضا کی شاعری ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں بات تخیلات کی حدود سے نکل کر امکانات کے

وجود تک آ پہنچی ہے۔

تو اگر روک لے تو، ٹھہر جائیں گے
ورنہ لمحوں کے سائے گزر جائیں گے

آ سکے گا نہ کوئی مقابل ترے
اپنے حالات سے لوگ ڈر جائیں گے

روئیں گے ہم لپٹ کر ہر اک اینٹ سے
لوٹ کر جب کبھی اپنے گھر جائیں گے

سید عابد علی عابد کہتے ہیں:

''جہاں خلوص موجود ہوتا ہے وہاں تخیل شعر کو ایسے مقام پر لے جاتا ہے جس کا جواب ممکن نہیں ہوتا۔''(۳)

صابر رضا نے بعض مقامات پر تو نہایت سادہ زبان میں نہایت گہری بات کہہ دی ہے جو اپنے اندر ایک پورے مضمون کی جامعیت لئے ہوئے ہے:

سوچتے ہیں دیکھ کر تاریکیاں
روشنی بس اک دیے کی بات ہے

تم بھی رفعتوں کو پا لو گے
شرط ہے بس اڑان میں رہنا

ہم تو نامعتبر تھے مگر کیا ہوا
کس لئے ہم پہ سب معتبر کھل گئے

سنو یہ کام تو تقدیر سے بھی ہو نہیں سکتا
کوئی تدبیر پھر کیسے ہماری راہ روکے گی

صابر رضا نے جہاں چھوٹی بحروں کا فراخ دلانہ استعمال کیا ہے وہاں ان کا ایک کمال لمبی بحروں کا

خوبصورت استعمال بھی ہے۔ انہوں نے نہایت سہولت سے لمبی بحروں کے دریا کو کئی ایک مرتبہ عبور کیا ہے:

دھڑکن دھڑکن جال بچھے ہیں، قدم قدم پر پہرے ہیں
سارے فریادی اندھے ہیں، حاکم بھی سب بہرے ہیں

آزادی کی ایک نئی سی صورت اب کے دیکھی ہے
بستی کے بازاروں میں ہی مورچے اور کٹہرے ہیں

لوگ تو اور بھی تیرے منکر بہت ہیں، گنہ گار ہیں
کیوں خدایا! ہماری زمیں پر مگر حادثے بڑھ گئے

صرف چٹخنی ہی ہوتی تو شاید کوئی اس کا درمان تھا
کرچیوں میں بٹی زندگی کا تو کوئی مداوا نہیں

مجھ کو معلوم ہے میرے دشمن، کہ اب ابتداء تو کرے گا
میرے حکام کی بزدلی سے ترے حوصلے بڑھ گئے

ڈاکٹر سلام سندیلوی کہتے ہیں

''ادب ہم اس مواد کو کہہ سکتے ہیں جس کا تعلق عام انسانی دلچسپی سے ہو لیکن اس میں ایک خاص ہیئت بھی موجود ہو جو کافی دلکش اور فرحت بخش ہو۔''(۳)

صابر رضا نے اپنی داخلی کیفیات کو خارجی معاملات کے ساتھ یوں مدغم کر دیا ہے کہ نسل انسانی جو برسوں سے اپنی بقا کے لئے برسرپیکار ہے' اپنے تمام تر رویوں اور معاملات کے ساتھ کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ اور اس نئی معاشرت میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور رونما ہونے والے حادثات مزید واضح انداز میں اپنی وجوہات کو سامنے لے کر آئے ہیں۔

دیکھنا ہے یہ کہ پہچانا ہے اس نے کس طرح
ورنہ تو ہر آدمی کا ایک ہی معبود ہے

سب کی آنکھوں میں نمی ہے، ہر کلیجہ خون ہے
یوں لگے ہے شہر میں اب زندگی مفقود ہے

ڈاکٹر محمود الرحمٰن کہتے ہیں

''شاعری صحیح معنوں میں معاشرے اور ماحول کی عکاسی کرتی ہے۔ خارجی عوامل پر اس کی گرفت بے حد مضبوط ہوتی ہے۔''(۵)

صابر رضا کا شعری رویہ اور انداز اپنے عہد کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ وہ اپنے عہد میں فکری اور اسلوبیاتی انفرادیت کے حامل شاعر ہیں اور معاملات کے بارے میں ذرا جدا قسم کا نظریہ اور رویہ رکھتے ہیں بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی صحیح اور سچا ادب وہی ہے جس میں مصنف کی روح جلوہ گر ہو۔(۶) اور صابر رضا نے اپنی شاعری میں اپنی روح کے پیرائے میں اس معاشرے کی' اس کی اقدار کی روح کو بے نقاب کیا ہے اور اپنے اطراف پھیلے ہوئے دکھوں کو بھی اتنے ہی درد کے ساتھ احاطہ تحریر میں لائے ہیں جیسے وہ ان کی ذات پر بیتے ہوں۔

وطن سے کوسوں دور رہ کر بھی ان کا دل اپنے ہم وطنوں کے دکھ کی آبیاری اپنے اندر کر رہا ہے۔ اور وہ قلم کا تیشہ اٹھائے' ظلم وستم کے کوہ گراں کو کھود کر ہمدردی' پیار' وفا اور محبت کے چشمے جاری کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

اس طرح تلخی حالات نے گھیرے بچے
آج تو میری طرح رو دیے میرے بچے

کسی احساس کی تنویر ہے ان ذہنوں میں
کام پر اٹھ کے جو جاتے ہیں سویرے بچے

یہی بہتر ہے کٹ کے گر بھی جائے
یہ سر کندھوں پہ بوجھل ہو گیا ہے

شہادت میرے گھر اتری ہوئی ہے
مرا سپنا مکمل ہو گیا ہے

زمین سے دوری کا دکھ جو ان کے دل کے اندر پل رہا تھا اب شعروں کی صورت میں پھل دینے لگا ہے۔ اور اس کا ذائقہ ہمارے اپنے دکھوں سے بہت ملتا ہے اور اس کی باس ہماری اپنی زمیں کی باس لگتی ہے اور ہمارے آس پاس سے اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

تلاش رزق میں سب کو اداس چھوڑ آئے

گھر، اچھے وقت کے آنے کی آس چھوڑ آئے

سفر میں بوجھ اٹھانا محال تھا سو ہم
تمام خواب تمہارے ہی پاس چھوڑ آئے

ہر ایک آنکھ تھی زنجیر کی طرح پھر بھی
ہر ایک دل میں نہاں التماس چھوڑ آئے

صابر رضا نے جہاں زمانے کی بے التفاتیوں کے گلے کئے ہیں وہاں لاشعوری طور پر اپنی ذات کی گرہیں بھی کھولی ہیں۔ کہیں کہیں وہ بے دھیانی میں اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ایسے میں ان کی ذات پر چڑھا خول چٹخنے لگتا ہے اور ہر ایسے مقام پر انہوں نے نہایت خوبصورت اشعار تخلیق کیے ہیں۔ ان اشعار کو پڑھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے صابر رضا کو خوبصورت اور سادہ لفظوں سے چھوٹے چھوٹے جملے بننا بہت اچھا لگتا ہے۔ ان کی شاعری بیک وقت سادگی اور پرکاری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

جب سے ہم نے ترا خیال کیا
زیست کو اور ہی محال کیا

ہم سا ضدی بھی کون تھا لیکن
گردشِ وقت نے کمال کیا

آپ تو یونہی لاجواب ہوئے
ہم نے خود سے تھا اک سوال کیا

تو اس حبس رت میں بچھڑ جائے تو کس طرح جی سکیں گے
سانس لینے کا بھی پھر رہے گا نہیں حوصلہ سوچتے ہیں

جس کو عبور کر کے میں پہنچا تھا گھاٹ پر
پھر سے وہی سراب کنارے سے آ لگا

تجھ سے منسوب تھا میرا آغاز بھی
تیرا دکھ ہی مری انتہا ہو گیا

میرے لہجے میں آباد تھا اک چمن
لے اڑی جس سے سب رنگ و بو خامشی

خواہشوں کو نیند سی آنے لگی
بھول جانا ہی ترا' بہتر رہا

مسئلہ اب کے انا کا نہیں سچائی کا ہے
اب کسی بات کی تردید نہیں ہو سکتی

وہ بھی دہرانا نہیں چاہتا ہے عہدِ وفا
اب رضا ہم سے بھی تائید نہیں ہو سکتی

صابر رضا نے غزل کو معاملات حسن وعشق اور مسائل تصوف کے بیانات اور ذاتی خوش فعلیوں کے دائروں سے باہر لا کھڑا کیا ہے۔

سنو یہ کام تو تقدیر سے بھی ہو نہیں سکتا
کوئی تدبیر پھر کیسے ہماری راہ روکے گی

انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ ہمیشہ بہتر سے بہتر کی خواہش کرتی ہے۔ ایسے میں انسان ہمیشہ یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں رہتا ہے۔ یقین اور بے یقینی کی یہ کیفیت اسے تعلق اور بے تعلقی کی صلیب پہ لٹکائے رکھتی ہے وہ ہونے نہ ہونے کے امکانات کے بیچ چکراتا پھرتا ہے۔ بیک وقت جس چیز کی وہ خواہش کر رہا ہوتا ہے اس سے فرار کی خواہش بھی نہاں خانہ دل میں جاگزیں ضرور ہوتی ہے۔ اور جس سے فرار چاہتا ہے اس کی تصویر نگاہوں میں لئے پھرتا ہے۔ یہی تضاد اس کی ذات کے مختلف گوشوں کی تکمیل کا باعث بنتا ہے۔ صابر رضا کی شاعری میں امید اور ناامیدی کی یہ کیفیت اکثر جگہ ملتی ہے۔ وہ جس ماحول سے شاکی ہیں اسی سے بہتری کی امیدیں بھی وابستہ کئے ہوئے ہیں۔ جہاں سے دور ہیں وہاں رہنے کی خواہش کی مسلسل آبیاری بھی کر رہے ہیں۔

ترے ظلم و ستم کی داستاں کس طرح بھولے گا
مؤرخ جب ہمارے دور کی تاریخ لکھے گا

خبر کب تھی کہ میرے شعر میری جان لے لیں گے
مرا من زہر بن کر خود مرے تن میں اترے گا

جس دور میں مرنا بھی ممکن نہ دکھائی دے
اس دور میں جینے کے آداب سمجھ لینا

کیسی ہوں گی ان کی تعبیریں بھلا
ٹوٹ جاتے ہیں جو سپنے خوف سے

پروفیسر غفور شاہ قاسم کہتے ہیں

''غزل میں جدیدیت کا مطلب زبان و بیان' لب ولہجہ' موضوع و مواد' انداز فکر و طرز احساس اور زندگی کی طرف روایتی رویے میں تبدیلی پیدا کرنا ہے۔''(۷)

صابر رضا کی غزل جدید غزل کے تمام تر تقاضے پورے کرتی ہے۔ اور ایک ہی مضمون کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے آخر تک نبھاتی چلی جاتی ہے۔ صابر رضا کی غزل نہایت وسیع' گہری اور پیچیدہ معنویت کی حامل ہے۔

مذکورہ کتاب میں صرف دو نظمیں شامل کی گئی ہیں جن میں سے ایک کشمیر کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ دوسری نظم ''اجڑی ہوئی ساعتوں کا پس منظر'' نظم کے تمام تقاضے پورے کرتی ہے اور وطن کے پس منظر میں ہی لکھی گئی ہے۔ وطن' دھرتی' یہاں کے لوگوں سے پیار صابر رضا کی شاعری کے مضبوط حوالے ہیں۔ ان کی شاعری انہی کے آس پاس گھومتی ہے اور ہر محب وطن انسان کی طرح ان کے اندر بھی انا کا تناور درخت کھڑا ہے۔ جو کبھی کسی مقام پر ہار نہیں مان سکتا۔ چاہے وہ اس کی ذات کی بات ہو یا وطن کا پاکیزہ حوالہ ہو۔ تبھی تو وہ خود بھی کہتے ہیں

ہم میر کے وقتوں میں ہوتے تو رضا جی
مر جاتے مگر شاعرِ دربار نہ ہوتے

o.....o.....o

کتابیات

۱۔ سلیم احمد۔ نئی شاعری نامقبول شاعری۔ مکتبہ نفیس اکیڈمی۔ کراچی۔ ۱۹۸۹ء۔ صفحہ نمبر ۱۳۸

۲- غلام حسین ذوالفقار۔ ڈاکٹر۔ مطالعۂ اکبر۔ سنگِ میل پبلی کیشنز۔ لاہور۔۱۹۸۴ء۔ص۔۱۰۲

۳- عابد علی عابد۔ سید۔ ماہنامہ اسلوب۔ مجلس ترقی ادب۔ لاہور۔۱۹۷۱ء۔ص ۱۷۸

۴- سلام سندیلوی۔ ڈاکٹر۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ۔ ادب اور اصناف ادب کا تجزیہ۔ مکتبہ میری لائبریری۔ لاہور۔ ۱۹۸۶ء۔ص ۹

۵- محمود الرحمن۔ ڈاکٹر۔ تحریک آزادی میں شعراء کا حصہ۔ ماہ نو۔ لاہور۔ اگست ستمبر ۱۹۹۴ء۔ص ۹

۶- سلام سندیلوی۔ ڈاکٹر۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ۔ص ۱۷

۷- غفور شاہ قاسم۔ پروفیسر۔ پاکستانی ادب۔ ۱۹۴۷ء سے تا حال۔ مکتبہ بک ٹاک۔ لاہور۔ ۱۹۹۵ء۔ص ۲۳۲

ادبی ذوق کی تسکین کے لئے

اظہر جاوید کی ادارت میں 33 سال سے باقاعدہ شائع ہونے والے

سدا بہار ادبی جریدے

"تخلیق"

کا باقاعدگی سے مطالعہ کیجئے

بھگوان سٹریٹ' چوک پرانی انار کلی' لاہور

تبصرہ

کتاب: نور یقیں
شاعر: عبدالعلی شوکت

پاک فضائیہ کے ریٹائرڈ سکواڈرن لیڈر سید عبدالعلی شوکت کی تازہ تصنیف ''نور یقیں'' میرے سامنے ہے جسے میں نے بالاستیعاب پڑھا ہے۔ شاعری جہاں شخصیت میں نکھار پیدا کرتی ہے وہاں معاشرے میں ایک ارفع و اعلیٰ مقام بھی دلاتی ہے۔ شاعر حساس اور دور بین ہوتا ہے اور یہ خوبیاں ''نور یقیں'' کے شاعر میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ''لرزاں ساعتیں'' کے بعد ان کا یہ دوسرا مجموعہ کلام ''نور یقیں'' ہے۔ وہ ایک جید، مستند اور کلاسیکی فکر رکھنے والے شاعر ہیں۔ ان کا شمار ان اساتذہ میں ہوتا ہے جنہیں شاعری کی تمام اصناف پر مکمل عبور ہے۔ ''نور یقیں'' کی شاعری سے میری اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اس میں مختلف اصناف میں شاعری پڑھنے کو ملے گی۔ ان میں حمد، نعت، سلام، ملی نغمے، شہیدوں کے حضور نذرانہ عقیدت، ترانہ پاک فضائیہ، نوجوانوں سے خطاب، یوم آزادی اور تحریک بنگلہ دیش ایسی مختلف النوع شاعری پڑھنے کو ملے گی۔ ان کے خیالات میں یقین اور ایمان کی پختگی کی جھلک نمایاں ہے۔

''نور یقیں'' قدیم اور جدید شاعری کا سنگم ہے۔ ان کی شاعری میں فلسفہ اور قدیم اساتذہ کا رنگ غالب ہے۔ شاعری میں اتنی پختگی اور خوبصورتی آج کے شور و غوغا اور بے وزنی کے دور میں کم پڑھنے کو ملتی ہے۔ عبدالعلی شوکت ایک درویش صفت اور صوفی قسم کے روشن خیال شاعر ہیں۔ وہ ایک ایسے نظام کے حامی ہیں جس میں کوئی کسی کا استحصال نہ کر سکے۔

اظہر جاوید نے ''نور یقیں'' کے فلیپ پر ٹھیک ہی تو لکھا ہے۔ ''عبدالعلی شوکت کو اظہار و بیان پر عبور ہونے اور شعر کی سبھی نزاکتوں اور لطافتوں کو جانتے ہوئے وہ نہ صرف مستند ہیں بلکہ ادب میں معتبر مقام رکھتے ہیں۔''

سجاد بخاری نے اپنی رائے کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے۔ ''نور یقیں میں شامل نظمیں فن کے اعلیٰ ترین معیار تک پہنچی ہوئی ہیں۔ عبدالعلی شوکت خون دل میں انگلیاں ڈبو کر لکھنے کے عادی ہیں۔''

ایسی کتاب کا ہر گھر کی لائبریری میں موجود ہونا اعلیٰ ذوق کی علامت ہے۔

مکتوبات

کچھ عروض کے حوالے سے

خورشید رضوی

برادرم عطاء الحق صاحب' سلام مسنون!

آپ کی عنایت اور علی اور عمر کی محبت سے ''معاصر'' مجھے باقاعدگی سے ملتا رہتا ہے گو میں رسید تک نہیں دیتا۔ تازہ ترین شمارہ (اپریل تا جون 2001ء) پیش نظر ہے۔ حسب سابق متوازن' معلومات افزا اور readable۔ نگارشات بھی معیاری اور عمدہ ہیں۔ ظفر اقبال' محمد اظہار الحق' عشرت آفریں اور شاہین عباس کی غزلوں نے خصوصیت سے لطف دیا۔ عشرت آفریں کی طویل نظم ''مضافات'' بھی بہت اچھی لگی۔ محمد اکرام چغتائی صاحب کا تحقیقی مضمون بھی لائق داد ہے۔

''یادرفتگاں'' کے ذیل میں جناب داؤد رہبر اور جناب اعجاز حسین بٹالوی کے بے ساختہ' مؤثر اور دل نشیں مضامین بہت پسند آئے البتہ داؤد رہبر صاحب نے ''خد و خال'' کی ترکیب کے حوالے سے جو کچھ ارشاد فرمایا اس سے مجھے بصد ادب' اختلاف ہے۔ مضمون کے آغاز ہی میں انہوں نے اس ترکیب کے بارے میں بطور خاص یوں وضاحت فرمائی ہے:

> ''کئی لکھنے یا بولنے والے خد و خال کی جگہ خط و خال لکھ یا بول جاتے ہیں' خد کے معنی عربی میں رخسار کے ہیں' خال کا تعلق رخسار ہی سے ہوتا ہے۔''

اس سلسلے میں یہ عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ ذوقی اعتبار سے گو آج اردو میں ''خد و خال'' ہی رتبہ فصاحت پر فائز ہے' اور میں خود یہی لکھنا بولنا پسند کرتا ہوں' تاہم جو لوگ ''خط و خال'' یا ''خال و خط'' بولتے یا لکھتے ہیں وہ سہواً ہرگز ایسا نہیں کرتے بلکہ اصل قدیم ترکیب ''خط و خال'' ہی تھی جس پر وہ قائم رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کئی سال ہوئے ''دیوان غالب پر مولانا حامد علی خاں صاحب کے حواشی'' کے عنوان سے راقم کا ایک مضمون ''فنون'' میں شائع ہوا تھا جس میں یہ ترکیب بھی زیر بحث آئی تھی کیونکہ مولانا نے غالب کے مصرع

شور سودائے خط و خال کہاں

پر یہ حاشیہ درج فرمایا تھا کہ ''ممکن ہے غالب نے خد و خال کہا ہو''۔ اس مضمون کی چند معروضات کا یہاں اعادہ

بے جا نہ ہوگا۔

1- فارسی کی غالب روایت ''خط و خال'' یا ''خال و خط'' ہی ہے۔ حافظ کا مشہور شعر ہے۔

ز عشقِ نا تمامِ ما جمالِ یار مستغنی است
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

ایک اور غزل میں فرماتے ہیں۔

شیوہ و نازِ تو شیریں، خط و خال تو ملیح
چشم و ابروئے تو زیبا قد و بالای تو خوش

اکثر فصحائے ریختہ نے بھی ''خط و خال'' ہی لکھا ہے۔ ولی نے کہا ہے۔

ولی شعر میرا سراسر ہے درد
خط و خال کی بات ہے خال خال

گلزار نسیم میں ہے۔

دیکھا تو نہ فرق تھا سرِ مو
جانچے خط و خال و چشم و ابرو

میر انیس فرماتے ہیں۔

تصحیح کیا ہوش میں اک خود غلط نہ تھا
زخمی تھے منہ کہیں اثرِ خال و خط نہ تھا

''خد و خال'' کی مثالیں بھی قدماء کے ہاں اردو اور فارسی میں مل جاتی ہیں مگر کم کم۔ ہاں مگر اب یہی زیادہ رائج و مقبول ہے۔

حصۂ مکتوبات میں وقار احمد آس صاحب نے ''معاصر'' کے گذشتہ شمارے میں جناب احمد ندیم قاسمی کی غزل کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ غزل

''مفاعیل مفعول مفعول کے وزن پر ہے۔ موصوف نے ''فنون'' میں کہا تھا کہ ''میں تھکا ہوا نہیں ہوں''۔ متذکرہ غزل کے مطالعہ سے تھکاوٹ عیاں ہے۔''

مراد قاسمی صاحب کی وہ غزل ہے۔

زمانہ خدا کی عدالت لگا
سو جو قہر تھا مجھ کو رحمت لگا

اس غزل میں مجھے تو کہیں تھکاوٹ کا احساس نہیں ہوا۔ معلوم نہیں فاضل مکتوب نگار کو کس قرینے سے یہ تاثر ملا۔ بہر یہ ایک داخلی و ذاتی کیفیت کی بات ہے۔ وزن اور بحر کا تعین البتہ خارجی و معروضی چیز ہے لہٰذا اس

پر بات ہونی چاہئے۔

آس صاحب نے غالباً اس غزل کا وزن ''مفاعیل مفعول مفعول فع'' درج کیا ہوگا۔ ''فع'' کمپوزر کی مہربانی سے رفع دفع ہوگیا۔ جی ہاں یوں تو اس غزل کے اور بھی کئی اوزان بتائے جاسکتے ہیں مثلاً

فعولن مفاعیل مفعول فع

مفاعیل فعلن مفاعیل فع

فعولن فعولن مفاعیل فع

فعولن مفاعیل مستفعلن

لیکن واضح رہے کہ علم عروض کے اعتبار سے یہ سب اوزان تقطیع غیر حقیقی کے ذیل میں آئیں گے۔ تقطیع کے معنی صرف یہ نہیں کہ مصرع گنگنا کر محض موزونیٔ طبع کے زور پر فعولن مفاعیلن کے کسی صوتی آہنگ پر پورا اتار دیا جائے۔ ایسی صورت میں تو فعولن مفاعیلن بھی کیا ضروری ہے زیر بحث غزل کا وزن

کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ کھٹا

یا

چراچوں چراچوں چراچوں چرا

بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ عروض ایک منضبط علم ہے۔ تقطیع حقیقی میں عروض کی مسلمہ بحور میں سے کسی بحر کے مسمہ زحافات وعلل کے مطابق کسی شعر کو ارکان بحر کے مقابل رکھا جاتا ہے چنانچہ مندرجہ بالا غزل کی حقیقی تقطیع صرف یہ ہے۔

فعولن فعولن فعولن فعل

جس کی رو سے یہ غزل بحر متقارب مثمن محذوف میں ہے۔ آس صاحب نے بحر کا تعین نہیں فرمایا۔ جناب محسن احسان کی دوسری غزل کے دوسرے شعر۔

جس خاک کا پیوند ہوئے نوحہ گرِ حرف

اُس خاک کی تاثیر سے اکسیر ہوا میں

کے پہلے مصرع کو انہوں نے خارج از وزن قرار دیا ہے۔ شاید اس لئے کہ ''نوحہ گرحرف'' میں ''گر'' طباعت کی غلطی سے ''کر'' رہ گیا ہے۔ لہٰذا اضافت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوا ورنہ مصرع بالکل موزوں ہے بلکہ لطف کی بات یہ ہے کہ مصرع غلطی سے جس طرح چھپ گیا ہے ایک نامانوس زحاف کے ذیل میں آ کر اس طرح بھی درست ہے۔ یہ غزل بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف میں ہے۔ آس صاحب اگر جناب یاس کی ''چراغ سخن'' میں بحر ہزج کا بیان دیکھ لیں تو سامنے آجائے گا کہ اس وزن میں رکن دوم، سوم اور چہارم سب میں تسکین اوسط کا زحاف لگایا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ''نوحہ کرحرف'' بلا اضافت بھی عروض اعتبار سے درست ہے بشرطیکہ پڑھنے

والا اسے درست پڑھنے پر قادر ہو۔

محترمہ شبنم شکیل کی غزل ۔

تم سے رخصت طلب ہے مل جاؤ
کوئی اب جاں بلب ہے مل جاؤ

کے سلسلے میں آس صاحب نے پہلی بار بحر کا تعین فرماتے ہوئے کہا ہے کہ یہ ''بحر خفیف مثمن اخرب مکفوف'' ہے۔ تعجب ہے کہ وہ اسے مثمن قرار دے رہے ہیں حالانکہ انہوں نے خود اس کی تقطیع بجا طور پر ''فاعلاتن مفاعلن فعلن'' کی ہے یعنی ایک مصرع میں تین رکن ۔ تین اور تین چھ ہوتے ہیں چنانچہ شعر مسدس ہوگا نہ کہ مثمن ۔ اب ''اخرب'' کو لیجئے ۔ بحر خفیف اخرب نہیں ہوتی کیونکہ زحاف ''خرب'' اس کے دونوں ارکان میں سے کسی ایک میں بھی نہیں آتا۔ مکفوف ہونے کی صورت میں اس کے ارکان میں ''فاعلات'' یا ''مس تفعل'' آنا چاہئے تھا جو خود اس صاحب کی تقطیع میں کہیں نہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ بحر خفیف ضرور ہے لیکن نہ مثمن ہے نہ اخرب نہ مکفوف۔ یہ بحر خفیف مسدس مخبون مسکن محذوف ہے۔ البتہ غزل کے چوتھے اور پھر آخری شعر کا پہلا مصرع مسکن نہیں ہے اور اس بحر میں مسکن و غیر مسکن کا اجتماع جائز ہے۔

عروض پر گفتگو چھڑ گئی ہے تو اب اسی مناسبت سے ایک ''عروضی غزل'' معاصر کے آئندہ شمارے کے لئے ارسال خدمت ہے۔

والسلام

''معاصر'' کا سابقہ شمارہ

عبدالقیوم-کراچی

جناب عطاء الحق قاسمی--السلام علیکم!

اپریل-جون کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اس میں شامل اکثر تحریریں بلند پایہ ہیں۔ خاص طور پر مضامین و مقالات کا حصہ تو بہت زوردار ہے' جس میں ''فیض اور گاندھی'' (فتح محمد ملک) تو منفرد ہے۔ اس میں فیض کی نظم ''سیاسی لیڈر کے نام'' کے پس منظر سے پہلی بار واقفیت ہوئی۔ امید ہے آئندہ شمارے میں نظم کے پس منظر کے بارے میں تصدیق یا تردید ہو جائے گی! اس نظم کے حوالے سے احمد ندیم قاسمی کے متعلق یہ کہنا کہ ''برطانوی فوج میں فیض'' کی شمولیت کو درست تناظر میں نہ دیکھ پائے کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتا۔ فیض فوج میں داد شجاعت کے لئے نہیں بلکہ اپنے معاشی مسائل اور جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے کے لئے گئے تھے تا کہ وہ دوسرے ہموطنوں کی طرح دال روٹی کے لئے بھٹکتے نہ پھریں۔ ورنہ 1936ء کے منشور کے تناظر میں تو انہیں اپنے ترقی پسندی کے اصولوں پر عمل کر کے برطانوی سامراج کی نوکری قطعاً نہیں کرنی چاہئے تھی! ''عبداللہ حسین کے نادار لوگ''

(خورشید قائم خوانی) بہت ہی چونکا دینے والی تحریر ہے۔ عبداللہ حسین کے ناول میں محترم خدیجہ گوہر کی تحریر کی کہیں کہیں مماثلت سوچ کو جھنجھوڑتی ہے۔ پھر جس طرح صاحب تحریر نے دونوں تحریروں کی کڑی سے کڑ ملا کر دلائل دیئے ہیں اس سے لگتا ہے کہ دال میں ضرور کچھ کالا رہا ہے۔ ''غزل میں ندیم کا نظریہ شعر وفن'' (ڈاکٹر ناہید قسمی) کمال کا مقالہ ہے۔ یہ جس بھرپور انداز میں لکھا گیا ہے وہ ندیم کی فن شاعری کا مکمل احاطہ کرتا ہے۔ محترمہ نے کتنی سخت محنت سے کام لے کر یہ مقالہ لکھا ہوگا یہ اس کو پڑھتے ہوئے بار بار محسوس ہوتا ہے۔

افسانوں میں ''تمنا بے تاب'' (رشید امجد) کی جگہ یادنگاری میں بنتی ہے لیکن اسے افسانوں میں شمار کیا گیا ہے۔ اگر یہ رشید امجد کی سوانح کا ابتدائی حصہ ہے تو امید رکھنی چاہئے کہ وہ اپنی زندگی کے نشیب وفراز کو مزید زیر قلم لاکر اپنی سوانح لکھیں گے! ''ایک باز آمد کی بھیا نکتا'' (اعجاز احمد فاروقی) بے حد دلچسپ اور حقیقی زندگی کی تصویر کا ایک ایسا منفی رخ ہے جس کا برصغیر پاک و ہند کے معاشرے اور افسوں میں بخوبی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ افسانے کا اسلوب بہت ہی دلکش ہے۔

''تین بٹالوی بھائی'' (داؤد رہبر) بہت ہی دلآویز تحریر ہے۔ لگتا ہے داؤد رہبر اپنی زندگی کو کاغذ پر سمیٹنے میں بہت عرصہ سے لگے ہوئے ہیں کیونکہ ان کی اکثر تحریریں اب سوانح کے انداز میں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ ''خد و خال کے دو باب'' (اعجاز حسین بٹالوی) بھی لاجواب مضمون ہے۔ جس دلنشین انداز میں انہوں نے اپنے بھائی مشہور افسانہ نگار آغا بابر مرحوم کو یاد کیا ہے وہ دل میں گدگدی بھی کرتا ہے اور اداسی کی پرچھائیں بھی آنکھوں پر ڈالتا ہے۔ ''پڑیئے'' ''گھر'' بیمار'' (ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی) بہت ہی دلچسپ اور ہلکے پھلکے مزاح سے بھرپور مضمون ہے۔ اس میں ہمارے اسپتالی لوگوں کے منفی انداز کو مہذب طریقے سے طنز کا نشانہ خوب خوب بنایا گیا ہے۔ ''فیض پر ندیم کا مضمون - ردعمل'' کے ذیل میں اکثر خطوط میں ندیم کی بریت ظاہر ہوتی ہے۔

''انجم رومانی'' (عطاالحق قاسمی) مختصر لیکن مرحوم کی شخصیت پر اچھا مضمون ہے۔ نظموں میں اظہار الحق کی نظم ''گرین کارڈ'' میں یہ سطور حقیقت کی کس قدر تچی عکاسی کر رہی ہیں:

یہ بخت بیٹو/تم اس سرزمیں کے لئے اپنے پیاروں کے دامن جھٹک دیتے ہو/جو کسی کی نہیں تھی/کسی کی نہیں ہے/کسی کی نہ ہوگی/جہاں پارۂ نان اور جُرعہ کی خاطر/نسب اور نام اور اولاد سب کچھ بدل جاتا ہے/جہاں محض رنگت/تمہاری بھٹکتی سراسیمہ نسلوں کی پہچان ہوگی/بھٹکتی سراسیمہ نسلیں/تمہیں یاد کر کے پشیمان ہوں گی۔

اسی طرح زاہد مسعود کی نظم ''کیمل بوائے'' مشرق وسطی کے بے رحم کھیل پر بھرپور طنز ہے۔ حیرت ہے کہ چائلڈ لیبر پر مغرب کی مہذب اقوام بڑا شور مچاتی ہیں جبکہ اس وحشیانہ کھیل پر بچوں کے بارے میں ایک لفظ منہ سے نہیں نکالتیں۔ یہ کیسا ظالمانہ شوق ہے جو اسلام کے نام لیوا اپنائے ہوئے ہیں۔ کیا یہ اسلامی تعلیمات کو بدنام کرنے کے بے رحم رویئے کا عکاس نہیں ہے!

عبداللہ حسین کی ناداری

عرفان احمد خاں-لاہور

معاصر شمارہ اپریل تا جون 2001ء بھی ایک hot issue ثابت ہوا۔ میرا اشارہ خورشید قائم خانی صاحب کے مضمون ''عبداللہ حسین کے نادار لوگ'' کی طرف ہے۔ خورشید قائم خانی صاحب محض جوشیلے اور گرم مزاج رائٹر نہیں اس لئے انہوں نے عبداللہ حسین کے ڈاکے کو محض قابل ضمانت چوری کہنے پر ہی اکتفا کیا۔

عبداللہ حسین کے ناول ''اداس نسلیں'' کا نام محمد سلیم الرحمٰن کا تجویز کردہ ہے' جو ادبی مجلّہ ''سویرا'' لاہور سے وابستہ رہے ہیں اور ''اداس نسلیں'' کے مسودے کی فاش غلطیاں بھی سویرا پریس کے یکے از مالکان ریاض احمد کی نگرانی میں ماہرین کی ایک ٹیم نے درست کیں' جن میں سب سے نمایاں نام محمد سلیم الرحمٰن کا تھا۔ یہ حقائق عبداللہ حسین پر لکھے جانے والے تھیسس میں بھی موجود ہیں۔ ان ماہرین کے ہاتھوں پھلنے پھولنے کے باوجود ناول ''اداس نسلیں'' پر اعتراض اٹھایا گیا کہ یہ قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' کی ہی ایک شاخ ہے۔ ''اداس نسلیں'' کو ''آگ کا دریا'' کا پاکستانی ایڈیشن بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ قرۃ العین حیدر کے ہندوستان ہجرت کر جانے کے باعث ''آگ کا دریا'' پاکستانی نہیں رہا تھا بلکہ ہندوستانی بن گیا تھا۔ خیر سے اب تو ''اداس نسلیں'' اور ''آگ کا دریا'' دونوں انگریزی لباس زیب تن کر چکے ہیں' اور دونوں تراجم مصنفین نے خود کئے ہیں۔ البتہ عبداللہ حسین کے ناول ''اداس نسلیں'' کے انگلش ترجمے کا تو حشر نشر ہو گیا۔ عبداللہ حسین نے اپنے انگلش پبلشرز کو ''اداس نسلیں'' کا جو ترجمہ اپنا کہہ کر پیش کیا وہ اصل میں پنجاب بنک کے سابقہ جنرل منیجر ڈاکٹر سید ریاض حسین کا ترجمہ کردہ تھا۔ سید ریاض حسین آج کل عسکری کمرشل بنک' راولپنڈی میں پرنسپل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں' مزید تفصیلات ان سے معلوم کی جا سکتی ہیں۔ میں تو صرف ترجمے کی ڈکٹیشن اور بار بار ٹائپ ہونے کا عینی شاہد ہوں۔ انگلش پبلشرز نے انگریزی ''اداس نسلیں'' میں خاصی کاٹ چھانٹ کی ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ عبداللہ حسین نے اس آپریشن کلین اپ کے دوران پہلے زوردار پھر دبے لفظوں میں احتجاج بھی کیا۔

''نادار لوگ'' اصل میں تو مملکت خداداد پاکستان میں غربت کے خاتمے کے لئے لکھا گیا تھا' مگر عبداللہ حسین کا سوسالہ منصوبہ ناکام ہو گیا اور قارئین ادب کے ساتھ ہاتھ ہو گیا۔ خورشید قائم خانی صاحب نے قارئین کی توجہ اس طرف نہیں دلائی کہ ناول ''نادار لوگ'' کا آغاز دوستوفسکی کے مشہور ناول ''ایڈیٹ'' کی کاپی ہے۔ دوستوفسکی کے بعد عبداللہ حسین کے قابو مشہور اداکارہ فریال گوہر کی والدہ ماجدہ خدیجہ گوہر کا ناول ''امیدوں کی فصل'' آ جاتا ہے۔ عبداللہ حسین خدیجہ گوہر کے نام ایک مکتوب (خورشید قائم خانی صاحب کو اس خط کی فوٹو کاپی مضمون میں بطور حوالہ اور ثبوت ضرور دینی چاہئے تھی۔ فی الوقت تو ایمان لانے والی بات ہے۔) میں اعتراف کرتے ہیں: ''آپ کا مسودہ سونے کی کان کی مانند ہے' جس میں سے سونا نکالنے کی ضرورت ہے...''

عبداللہ حسین تو اس وقت بھی سمجھے ہوں گے کہ ناول نگاری کے لوح و قلم ان کے ہاتھ میں ہیں۔ اول تو

ناول شائع نہیں ہوگا۔ بفرض محال شائع ہوا بھی تو انگریزی میں ہوگا۔ جسے پڑھنے اور سمجھنے والے لوگ پاکستان میں کم کم ہیں۔ عبداللہ حسین کی شامت اعمال کہ خدیجہ گوہر کو خورشید قائم خانی جیسا موزوں مترجم بھی مل گیا اور ویلکم بک پورٹ' کراچی والوں جیسا اچھا پبلشر بھی۔ ''اداس نسلیں'' پر بھی الطاف گوہر نظر کرم نہ کرتے تو گورنر پنجاب نواب محمد امیر خان اسے ban کرنے کا ارادہ کر چکے تھے' صرف ایک آدھ دن کی دیر تھی۔ الطاف گوہر نے پھرتی دکھاتے ہوئے صدر ایوب خان' کو ''اداس نسلیں'' کی تقریب رونمائی کی صدارت کرنے پر آمادہ کر لیا۔ یوں ban ہونے والا معاملہ نہ صرف ٹھپ ہو گیا بلکہ آنے والے وقتوں میں جانے کن ''وختوں'' کے ساتھ اسے شامل ''نصاب'' بھی کروا لیا گیا۔ بات ''اداس نسلیں'' تک ہی رہتی تو شاید دب جاتی اور لوگ اسے فسانہ ماضی سمجھ کر بھول جاتے مگر معاملہ ''نادار لوگ'' تک آ پہنچا اور یہاں ایک بار پھر قرۃ العین حیدر کی طرح ایک اور خاتون یعنی خدیجہ گوہر کا ایک مرد کے ہاتھوں استحصال ہوا۔ عبداللہ حسین کو خواتین کے ناول ہی طبع آزمائی کے لئے کیوں پسند آتے ہیں؟ اس سوال کا جواب عبداللہ حسین ہی دے سکتے ہیں۔ ''نادار لوگ'' میں ایک سکھ کردار کا اپنی جوتی میں اپنی معشوقہ کا ''آب گم'' پینے جیسا شرمناک اور ناقابل یقین واقعہ' عبداللہ حسین کے قلم سے پھوٹا ہے۔ بہت سے قارئین نے تو ''نادار لوگ'' وہیں بند کر کے رکھ دیا تھا۔ بعض سخت جان قسم کے قارئین جو اپنے پیسے پورے کرنا چاہتے تھے' ناول طوعاً و کرہاً' جبراً پڑھتے چلے گئے۔ آخرکار ''حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ'' آ گئی (جو خفیہ (اس وقت تک) تھی اور اس کی کاپی سابق چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان' فخر زمان نے نصرت بھٹو سے لے کر عبداللہ حسین کو فراہم کی تھی۔) عبداللہ حسین ''حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ'' کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ نا ہی وہ ''امیدوں کی فصل'' جیسی سونے کی کان میں سے سونا نکال پائے۔ عبداللہ حسین کو اکادمی ادبیات کے ریسٹ ہاؤس (اسلام آباد) میں ناول ''نادار لوگ'' کا مسودہ فائنل کرنے کے لئے کافی ''سہولیات'' حاصل تھیں۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر عبداللہ حسین کے علاوہ کوئی اور ناول نگار اکادمی ادبیات سے مذکورہ ''سہولیات'' کا خواستگار ہو تو کیا اسے وہ ''تمام'' سہولیات فراہم کی جائیں گی؟ ستم تو یہ کہ عبداللہ حسین تمام تر سہولیات کے باوجود نادار لوگوں کے لئے کچھ بھی تو نہ کر پائے' بلکہ bills کی شکل میں اکادمی ادبیات کو بھی نادار کر گئے۔

''نادار لوگ'' کی تصنیف کے دوران پاکستان ٹیلی ویژن نے عبداللہ حسین کو ایک بڑے ناول نگار کے طور ہمیشہ کے لئے محفوظ کرنے کی خاطر فہیم جوزی کو بطور پروڈیوسر یہ کام سونپا کہ عبداللہ حسین کی اکادمی ادبیات پاکستان کے ریسٹ ہاؤس میں موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے' ایک طویل دورانیے کا انٹرویو ریکارڈ کر لیا جائے۔ لیکن انٹرویو کرنے والا ایک ہی شخص ہو جو اردو فکشن پر گہری نظر رکھتا ہو۔ یاد رہے کہ پاکستان ٹیلی ویژن کے لئے اس نوع کے انٹرویوز ہمیشہ سے کوئی ایک ہی شخص لیتا چلا آیا ہے (مثال کے طور پر ناصر کاظمی کا انٹرویو میو ہسپتال میں انتظار حسین نے کیا)۔ لہٰذا فہیم جوزی نے عبداللہ حسین کے مجوزہ انٹرویو کے لئے ایک نقاد سے رابطہ کیا۔ انہوں نے انٹرویو لینے کی حامی بھر لی اور اس کے لئے تیاری بھی شروع کر دی۔ لیکن چند دن بعد خود فہیم جوزی نے اس

نقاد سے ٹیلی فون پر معذرت کرتے ہوئے یہ کہا کہ : عبداللہ حسین کو یہ معلوم ہو گیا ہے کہ انٹرویو آپ کر رہے ہیں' اور آپ کے نام سے اس لئے بدک رہے ہیں کہ انٹرویو ان کی مرضی کے عین مطابق نہ ہو پائے گا۔ انہوں نے آپ کی بجائے اصغر ندیم سید کا نام تجویز کیا ہے۔ کیا یہ رویہ ایک خوفزدہ ادیب کا نہیں ہے؟

آخر میں میرا عبداللہ حسین اور خدیجہ گوہر کے لئے مخلصانہ مشورہ یہی ہے کہ دونوں ''ناول بدل'' بہن بھائی بن جائیں یا پھر عبداللہ حسین ''نادار لوگ'' کے نئے ایڈیشن (اگر شائع ہونے کی نوبت آئے) کا انتساب ''خدیجہ گوہر'' کے نام کچھ اس طرح سے کریں:

''اکتساب--خدیجہ گوہر کے ساتھ-جن کی سونے کی کان میں سے سونا نکالتے نکالتے میں نڈھال ہو گیا' مگر کان میں ابھی سونا' اور میرے ناول کا دوسرا حصہ باقی ہے۔''

ڈاکٹر خیال امروہوی' لیہ

محترم جناب عطاء الحق قاسمی صاحب!

سلام و آداب۔ معاصر دیکھا جستہ جستہ پڑھا خریدنے کی ہمت نہیں ہوئی بے حد وقیع جریدہ ہے۔ پاکستان جہاں مختلف وسایل سے خود کفیل ہے وہاں عبرت ناک نادانی اور جہالت کے باوجود علمی و ادبی اعتبار سے نادرالوجود ہے۔ اردو ادبیات کا دنیا کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوتا رہے تو اہل عالم کو حیرانی ہوگی کہ بے وسیلہ اہل فکر و قلم کس قدر متبحر ہیں لیکن افسوس کہ گذشتہ 54 برس کے طویل عرصے میں جتنی حکومتیں بھی آئیں وہ جید جاہل ثابت ہوئیں۔

محسن احسان' پشاور

برادرم! السلام علیکم۔

معاصر سہ ماہی کا تازہ شمارہ آپ نے عنایت کیا۔ شکریہ۔

اس کی تازگی متانت اور دلچسپی آپ کی غیر معمولی ادبی صلاحیتوں اور مدبرانہ خوبیوں کی غماز ہے۔ فتح محمد ملک کا ''فیض اور مہاتما گاندھی'' فیض کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی کامیاب کوشش ہے۔ وہ ہمارے ایک شگفتہ فکر نقاد ہیں جو ہمیشہ کوئی نیا پہلو سامنے لا کر قاری کے دل و دماغ میں جگنوؤں کی سی چمک پیدا کر دیتے ہیں۔

ناہید قاسمی نے بھی ندیم صاحب کے بارے میں غزل کے حوالے سے نئی بات کہنے کی سعی کی ہے۔ ان کی ناقدانہ تحریریں دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ مشکور حسین یاد کا اقبال کا معجزہ تغزل اقبال کی غزلیہ شاعری اور نظم پر تغزل کے حوالے سے نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ معلومات افزا بھی --وہ ہمیشہ کسی نئے پہلو سے بات کرنے کے عادی ہیں۔ علمدار حسین بخاری ناقد کی حیثیت سے بڑے معرکے کے مضامین لکھ رہے ہیں۔ اس دفعہ انہوں نے اردو افسانے کی روایت' ایک نئی خواندگی تحریر کر کے اردو افسانے کو ایک نئے انداز سے پیش کرنے کا خوبصورت تجزیہ کیا ہے۔ خورشید قائم خانی نے عبداللہ حسین کے بارے میں نئے انکشافات کئے ہیں۔ خدیجہ گوہر کے ادبی قد و قامت کا اندازہ' بھی اس مضمون سے ہوا یہ تو ماچہ سرایم وطنبورہ ماچہ می سرائی داں مضمون ہو گیا۔

اللہ آپ کو توفیق دے کہ معاصر کو ایسی ہی شگفتہ تحریروں سے سجاتے رہیں۔

خدا آپ کا حافظ و ناصر ہو۔

تمام دوستوں کو سلام-- عمر قاسمی کی مدیرانہ صلاحیتیں قابل تحسین ہیں۔

o...o...o

عطا الحق قاسمی

کی شوخ و شنگ تحریروں پر مشتمل نئی ہنگامہ خیز کتاب

بارہ سنگھے

دعا پبلیکیشنز C/25 'لوئر مال' لاہور

Registered L No: PC(PB)/29178

Quarterly Literary Magazine "MUASIR" International

Lahore-Pakistan. Tel: 92-42-7351217
92-42-7847886 Mob: 0300-8470062
E-mail: qasmi@brain.net.pk